ذرا سنو تو فسانہ میرا

سلمیٰ اعوان

انتساب

اپنی جوانی کے اُن دنوں، اُن یادوں،
اپنے اردگرد پھیلے اُن کرداروں کے نام
جن سے متاثر ہو کر میں یہ افسانے لکھتی رہی

فہرست

بے گھر----------
انتقام----------
داستان ساتھ لائے----------
ریاضت----------
ٹوٹی کہانی کمند----------
ذرا سن تو فسانہ میرا----------
گھنا درخت----------
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی----------
قسمت کی خوبی دیکھیے----------
نئی بیٹی----------
زندگی اے زندگی----------
مسئلہ آبروئے دل کا----------
ایک حقیقت ایک کہانی----------

انقلاب----------

عنوان تو آپ نے دینا ہے----------

تشنگی----------

میں مٹی کا مادھو----------

اپنے لئے کیا جینا----------

ہوسِ زر----------

دھنک رنگ برسات----------

بے گھر

اماں کے سینے سے ایک درد بھری آہ نکلی تھی جب دلہن ممانی نے پان کی گلوری داہنے کلّے میں ٹھونستے ہوئے پوچھا۔

''اے اُس نگوڑی نسیم کا کیا بنا؟ کچھ پتہ چلا؟''

''میں کیا جانوں، نصیبوں جلی جانے کہاں کہاں دھکے کھاتی پھر رہی ہوگی۔ دیکھو کرم پھوٹے تو کب؟ اللہ مندی لکھی ٹالیو۔'' اماں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے سر تکیے پر گرا دیا۔

میں ڈیوڑھی کی اندرونی دہلیز پر بیٹھی دال بین رہی تھی۔ ملکہ مسُور بینتے بینتے میرے سامنے دس سالہ لڑکی چھینٹ کی شلوار اور ململ کی بنیان میں کدکڑے لگاتی آ گئی۔ ماں نے اُس کی دھواں دار مرمت کی تھی اور رو دھو کر اشک شوئی کے لئے اپنی منہ بولی پھوپھی کے گھر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ مٹی سے اَٹے ہاتھوں نے روتی آنکھوں کو بھینچ بھینچ کر چہرے پر

عجیب وغریب گل بوٹے کھلا دیئے تھے۔

وہ گھر میں داخل ہوئی۔انگنائی سے لشکارا پڑا اور وہ سحر زدہ سی دروازے کے پٹ سے ٹکی کھڑی رہ گئی۔چارپائی پر نرم و نازک جسم کی ایک انتہائی حسین وجمیل عورت مہندی لگے ہاتھ کی رو پہلی اُنگلیوں میں کاسنی دوپٹہ گھونگھٹ کی شکل میں پکڑے قریب بیٹھے مرد سے باتیں کررہی تھی۔اُس پر نظر پڑی تو تعجب سے رخ پھیر کر بولی۔

''اے آپا زینب کون ہے یہ؟''

اور آپا زینب نے باورچی خانے کے چھوٹے سے دروازے میں سے گردن باہر نکال کر اُسے دیکھا اور حیرت سے بولی۔

''اے سلّو اندر آنا، یہاں کیوں کھڑی ہو اور حلیہ کیا بنا رکھا ہے اپنا؟''

''نسیم بی، یہ میری بھتیجی ہے۔'' وہ جب اندر چلی گئی تو منہ بولی پھوپھی نے اُسے بتایا۔

اُس کے حُسن کے لشکارے سے سحر زدہ ہونے والی وہ کم سن لڑکی میں تھی۔بیس سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود میرے ذہن کے پردوں پر محفوظ وہ جلوہ ابھی تک اُسی طرح قائم تھا۔

وہ حُسن کی شہزادی نہ تھی، قسمت کی مہارانی تھی۔دھن، دولت سبھی اُس کے غلام تھے۔میری پھوپھی کی دیورانی تھی۔شوہر ریلوائی میں افسر تھا۔رہنے کو بنگلہ، کام کاج کو نوکر چاکر، سارا دن پلنگ پر بیٹھ کر حکم چلاتی۔دوسرے تیسرے سال کہیں ملاقات ہو جاتی۔ہر بار ایک نیا مہمان اُس کی گود میں ہوتا، پر وہ پہلے سے بھی زیادہ تازہ دم اور خوبصورت نظر آتی۔

اور جب اُس نے دسواں بچہ جنا، میں بھی بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔مجھ سے ملی تو کہنے لگی۔

''تم آج کل کی لڑکیاں سمجھتی نہیں ہو کہ شادی کے بعد جسم کو قابو میں رکھنا کس قدر ضروری ہے۔بس دو تین بچے جنے اور پھول کر کپا ہو گئیں۔''

مہمان نواز بھی بڑی تھی، کبھی جو چلے جاتے بچھی جاتی۔کھانا کھلائے بغیر آنے نہ دیتی۔اماں سے بہت پیار تھا۔اپنا سارا دکھ سکھ انہی سے کہتی سنتی۔

مغلپورے میں جب اُس نے عالیشان مکان اور اس سے ملحقہ نوکوارٹر خریدے، تو اس کے سسرال والے مانو جیسے انگاروں پر لوٹ گئے۔جیٹھانیوں نے ناک چڑھا کر اُس میں بتیس سو کیڑے ڈالے۔ساس سسر اور نند نے الگ طعنہ زنی کی۔

''اے اتنا جمع جوڑ تھا اُس کے پاس۔پھن مارے بیٹھی تھی۔'' رشتہ داروں نے چباچبا کر باتیں کیں۔

اُس نے ساری باتیں دم گھٹا کر سنیں اور جب برداشت سے باہر ہو گئیں، تب ایک دن وہ پھولے چہرے کے ساتھ سسرال پہنچ گئی۔اُن کے آنگن میں کھڑے ہو کر اُس نے بے بھاؤ کی سنائیں۔

''کوئی ڈاکہ تو نہیں ڈالا، چوری یاری نہیں کی۔کسی کے خصم کی کمائی نہیں لی۔لوکا ہے حسد میں جلے بھنے جا رہے ہیں۔ایسے رشتہ داروں کو مٹی کا تیل ڈال کر پھونک دوں۔اپنوں سے تو غیر اچھے۔خوش ہوئے، مبارک باد دینے آئے۔ہم تو دن رات دعا مانگتے ہیں کہ اللہ سب کو دے۔چلو دل سے نہ سہی، دنیا داری کے لئے آتے۔آنا تو درکنار الٹا بیٹھ کر میرے فضیحتے کرتے ہیں۔''

جیٹھانیں اور ساس نندیں آگے ہی جلی بھنی بیٹھی تھیں۔غرّا کر باہر نکلیں۔گھمسان کا رَن پڑا۔ایک دوسری کے جھونٹے کھسوٹے گئے۔منہ نوچا گیا اور اُسے ہلدی پھٹکری لگانے والا کر کے گھر بھیج دیا۔

چند دنوں بعد جب وہ ہمارے ہاں آئی، اُس وقت تک اُس کے جسم پر مار پیٹ کے نشان باقی تھے۔ اماں کو دِکھاتے ہوئے وہ رو پڑی۔ میں اپنی بچی کو پلنگڑی پر تھپک تھپک کر سلانے میں لگی ہوئی تھی۔ اُس کی آہ وزاری پر رخ پھیر کر اُسے دیکھا۔ میں نے ہمیشہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھا، پر آج وہ رو رہی تھی اور اِس انداز میں بھی اتنی دلفریب لگ رہی تھی کہ میں نے بے اختیار چاہا، یہ کچھ دیر اور یونہی روتی رہے تو کتنا اچھا ہو۔

اماں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''بے وقوف دِکھتی ہو تم نسیم۔ وہ تو پہلے ہی تمہاری بیرن تھیں۔ جانا ہی تھا تو کسی کو ساتھ لے کر جاتیں۔ بھلا وہ چار اور تم اکیلی۔ ہڈیاں کوڈے تو ٹوٹنے ہی تھے تمہارے۔''

اُس کا نیا گھر بہت خوبصورت تھا۔ اُس کے شوہر کی کوئٹہ تبدیلی ہوگئی اور وہ نئے مکان میں بچوں کے ساتھ منتقل ہوگئی۔

اور پھر ایک دن جب آسمان اور زمین دونوں ہی آگ اُگل رہے تھے، وہ پسینے میں نہائی ہاتھوں میں بڑا سا مٹھائی کا ڈبہ پکڑے ہمارے گھر آئی۔ بجلی بند تھی۔ اماں نے ڈیرہ غازی خان کی پنکھیا سے اُسے ہوا کرتے ہوئے کہا۔

''تم یقیناً کوئی خوشخبری لائی ہوگی ورنہ اتنی تپتی دوپہر میں کیا ضرورت تھی؟ ٹھنڈا ہوتا تو چلی آتیں۔''

اس نے سب سے بڑی بیٹی کی منگنی کر دی تھی۔

''مجھے افسوس ہے آپا۔'' وہ اماں کا گھٹنا پکڑ کر بولی۔

''آپ محسوس نہیں کریں گی، مسرت کے ابا کوئٹے سے ایک دن کے لئے آئے تھے۔ لڑکے والے بضد تھے کہ رسم فوراً ادا کی جائے۔ اِس لئے کسی کو بھی نہیں بلایا۔''

اماں کے استفسار پر اُس نے بتایا۔

''اچھے لوگ ہیں ۔میری گلی میں آخری کونے والا اُن کا مکان ہے ۔لڑکا رینجرز پولیس میں انسپکٹر ہے، اونچا لمبا خوبصورت ہے ۔کافی عرصے سے پوچھ رہے تھے ۔میں ہی راضی نہ تھی ۔''

''بیٹیوں کو جتنی جلدی دروازے سے اُٹھا دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے ۔اللہ نصیب نیک کرے ۔''

میرے میاں اُن دنوں لائل پور میں ملازم تھے ۔مہینے میں میرا ایک آدھ لاہور کا چکر ضرور لگ جاتا ،مگر کچھ ایسا ہوا کہ میں چار پانچ ماہ تک لاہور نہ آسکی اور جب آئی تو اماں سے ملنے جلنے والوں کی باتیں یوں پوچھیں جیسے میں کوئی دس سال بعد سات سمندر پار سے آئی ہوں ۔نسیم کا ذکر ہوا تو میں نے دیکھا اور اماں کچھ چپ سی ہوگئیں ۔

میں نے ذرا اضطراب سے پوچھا۔

''کیوں اماں، خیریت سے تو ہیں نا وہ لوگ؟''

''ہاں، یوں تو ٹھیک ٹھاک ہیں ۔'' اماں نے بستر پر کروٹ بدلی اور منہ میری طرف کرلیا۔

''رفیق تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ کوئٹے میں ہے ۔'' اماں نے بات جاری رکھی ۔

''بی! میں جتنی بار بھی اُن کے ہاں گئی مسرت کے چچا سسر کو اُس گھر میں بیٹھے دیکھا ۔لمبا چوڑا کڑیل جوان وہی کرائے داروں سے کرایہ وصول کرتا ہے ۔گھر کا انتظام بھی مجھے تو اُسی کے ہاتھ میں نظر آتا ہے ۔''

اماں کے چہرے پر تفکر کے عجیب سے سائے پھیل گئے تھے ۔کچھ دیر بعد وہ قدرے تذبذب میں ڈوبے لب و لہجے میں بولیں ۔

''مجھے تو معاملہ بگڑا ہوا نظر آتا ہے ۔''

وہ اپنے اس اندازے میں سو فیصد درست تھیں۔ دو تین دنوں بعد جب اماں کے ساتھ میں انہیں ملنے گئی۔ میں نے بھی دیکھا تھا، چھ فٹ سے نکلتے قد پر اُس کا پلا ہوا جسم اور اس پر اُس کی مقناطیسی کشش والی آنکھیں اُسے پراسرار بنائے ہوئے تھیں۔ گھر میں شادمانی اور گہما گہمی بھی مفقود تھی جو یہاں ہمیشہ دیکھنے میں آتی۔ مسرت اُس کی بیٹی، چپ چاپ تھی، یوں جیسے ناراض ہو۔ نسیم خود بھی پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں کوئی دو گھنٹے وہاں بیٹھی اور اِس دوران اُس مرد نے کوئی دس چکر لگائے۔ گھر کا مختارِ کل وہی نظر آ رہا تھا۔

میرے ایما پر اماں نے نسیم کو سمجھانے کی کوشش کی جو ہمارے خیال کے مطابق ناکام ثابت ہوئی۔ ہم نے آمد و رفت ختم کر دینی ہی مناسب سمجھی۔

مختلف خبریں اُڑنے لگی تھیں۔ ان اُڑتی خبروں میں اُس گھر کی بربادی کی داستان مکمل ہوتے نظر آتی تھی۔ بیٹی کے سسر نے اپنے بھائی کے حد درجہ بڑھے ہوئے عمل دخل کو سخت ناپسند کیا تھا۔ اُس نے رشتہ ختم کرنے کی بھی دھمکی دی جس پر بیٹی نے ماں کو زہر کھا کر خودکشی کرنے کے لئے کہہ دیا۔ شوہر کو غصے سے آیا تو بیٹی نے اُس کے کان بھرے۔ میاں بیوی میں زبردست لڑائی ہوئی۔ پہلی بار ماں نے باپ کو بتایا کہ یہ شادی مسرت کی اپنی پسند سے ہو رہی ہے۔ یہ لڑکے کے ساتھ باہر آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ رقعے بھی اُس نے شوہر کو دکھائے جو بیٹی نے گاہے گاہے لڑکے کو لکھے تھے اور چھوٹی بہن کے ہاتھ اُسے بھیجنے کی کوشش کی، پر ماں نے راستے میں اُچک لئے۔ اُس نے ببانگ دُہل اعلان کیا کہ وہ یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دے گی۔

مہینوں بعد خبر سنی کہ رفیق نے نسیم کو گھر سے نکال دیا۔ بیٹی کی شادی کر دی۔ بچوں کو دادی کے پاس چھوڑ کر اپنی ملازمت پر چلا گیا ہے۔ بتانے والی نے یہ بھی کہا۔

''اے رفیق تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے، پہچانا نہیں جاتا۔''

اِس کے بعد کوئی خبر سننے میں نہ آئی۔ اکثر و بیشتر بیٹھے بیٹھے اماں اُسے یاد کر کے رہ پڑتیں۔ ایک بستا رستا، ہنستا مسکراتا خوشحال گھرانا دیکھتے ہی دیکھتے تباہ ہوگیا تھا۔

''جانے کرموں جلی کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہوگی۔ سسرال والے اُس کے ازلی دشمن اب تو سکھ سے بیٹھ گئے ہوں گے۔ چچ چچ۔''

اماں دکھ بھرے لہجے میں کہتیں۔

''کلموہوں کی نظر کھا گئی اُسے۔''

دھند اور کُہر میں ڈوبی اُس صبح کو میں نے اپنے سینے پر بے اختیار دوہتڑ مارا۔ میرے میاں جو برآمدے میں بیٹھے شیو بنا رہے تھے۔ میرے اِس انداز پر گھبراہٹ میں اپنے رخسار پر بلیڈ مار بیٹھے۔ میرا رنگ فق تھا۔ صبح کا تازہ اخبار میرے ہاتھ میں تھا۔۔۔۔۔ اور میری نگاہیں بے تابانہ اُس خبر کے تعاقب میں دوڑ رہی تھیں جو نسیم سے متعلق تھی۔

''آشنا کی بے وفائی سے تنگ آ کر دس بچوں کی ماں کی خودکشی کی مذموم کوشش۔ پولیس تفتیش میں مصروف ہے۔''

سارا دن میں پریشان رہی، جی چاہا اماں کو خط لکھوں اور اُن سے کہوں کہ وہ اسپتال جا کر اُس کا پتہ تو کریں۔ مگر اُسی دوپہر کو گھر سے خط ملا جس میں اماں کے اسلام آباد جانے کی اطلاع تھی۔

سردی گزری، گرمی آئی اور پھر برستے دن بھی آگئے۔ رم جھم والا ایسا ہی ایک دن تھا جس میں انسان بلاوجہ اُداسی محسوس کرتا ہے۔ وہ ہمارے گھر آئی تھی۔ اللہ! اُسے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آگیا۔ انسان تقدیر کے ہاتھوں کھلونا نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ شاندار عورت تقدیر کے ایک ہی کڑے وار میں چوپٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس کا برقع پھٹا ہوا تھا۔ کپڑے گندے اور چہرہ ویران تھا۔ اماں سے گلے لگ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ہم سب شہد کی مکھیوں کی

طرح اُس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہماری آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

شربت سے لبالب بھرا دوسرا گلاس پی کر وہ چارپائی پر نیم دراز ہو گئی۔

''بہت چلنا پڑا آج، ٹانگوں میں سکت نہیں۔ کمر بھی دُہری ہوئی جا رہی ہے۔''

تھوڑی دیر ستانے کے بعد اُس نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ عرب کے جاہل لوگ جو بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے، اچھا ہی کرتے تھے۔ اپنی بیٹی کے کارن آج میں اِس حال کو پہنچ گئی ہوں۔ آپا آپ سے میں نے کبھی اپنی کسی بات کا پردہ نہیں رکھا۔ مگر یہ پیٹ کا معاملہ تھا، اِسے میں آپ سے بھی چھپا گئی تھی۔''

آنسو اُس کی آنکھوں سے لگاتار بہہ رہے تھے جنہیں اماں اپنے آنچل سے صاف کرتی جاتی تھیں۔

''مسرت نے جو چاہا، میں نے وہی کیا۔ وہ لوگ میری پسند اور معیار کے نہیں تھے، مگر میں نے بیٹی کی چاہت کو مدنظر رکھا۔ رفیق جب پہلی بار کوئٹے سے آئے، میں نے بات کی تو وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ لوگ تو اتنے اچھے نہیں۔''

''آسمان سے اُتر کر تو اچھے لوگ آنے سے رہے۔ جانتے نہیں، رشتوں کا قحط پڑا ہوا ہے۔ ایک انار سو بیمار والی بات ہے۔''

میرے اصرار پر رفیق کو ہار ماننی پڑی۔ میں ماں تھی، سبھی کچھ اپنے پیٹ میں ڈال کر چھپا گئی۔ مسرت کا چچا سسر بشیر، رفیق کا پرانا دوست بھی تھا۔ نئے رشتے نے دوستی کی تجدید کر دی۔ آنا جانا شروع ہوا تو باہر کے کچھ کام بھی کرنے لگا۔ رفیق بھی اُسے کہہ گیا تھا۔ بشیر بہت چالباز انسان تھا۔ اُس کی خصلت کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ

ایک بہرو پیا تھا۔اُس کی گفتگو میں میرے لئے احترام ہوتا، وہ مجھ سے خلوص اور ہمدردی جتاتا۔اُس کا انداز کچھ اِس قسم کا تھا کہ مجھ جیسی بے وقوف عورت یہی سمجھی کہ وہ میرا بہت ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔اپنا ہر دکھ سکھ اُسی سے کرنے لگی۔

مسرت کے سسر نے اپنے بھائی کے زیادہ آنے جانے پر ناک بھوں چڑھائی۔ اُس کے لڑکے نے بھی مسرت کو لکھا کہ چچا کا آنا گھر میں بند کرو۔مسرت نے اعتراض کیا تو مجھے غصہ آیا۔میں نے کہہ دیا کہ میں وہاں شادی نہیں کروں گی۔یہ بات میں نے صرف بیٹی کو ڈرانے کے لئے ہی کہی تھی وگرنہ میں سنجیدہ نہیں تھی۔

''میری بیٹی نے آپا وہ کام کیا کو کوئی نہیں کرسکتا۔'' اُس کے رکے ہوئے آنسو پھر بہہ نکلے۔

''باپ کو سکھایا پڑھایا۔اپنے جہیز کا سامان چوری چوری اُٹھا کر دادی، پھوپھی کے پاس پہنچانا شروع کر دیا۔میری جیٹھانیوں سے ملی بھگت کی اور کچھ زیور بھی اُڑا لئے۔

مسرت سے چھوٹا بیٹا آوارہ گرد ہوگیا۔اوباش قسم کے لوگوں کے ساتھ سارا سارا دن باہر گزارتا۔ایک دن مجھ سے زیور مانگنے لگا۔میں نے انکار کیا تو بہن کے ساتھ مل گیا۔ دادی اور بڑی چچی نے اُسے پیسہ دینا شروع کر دیا۔گھر میں محاذ آرائی کا سا سماں پیدا ہوا گیا۔رفیق کوئٹے سے آیا تو دونوں بہن بھائیوں نے میرے خلاف الزامات کا وہ طومار باندھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔رفیق نے آؤ دیکھا نہ تاؤ روئی کی طرح تو م کر رکھ دیا اور گھر سے فوراً نکل جانے کو کہا۔بس مجھ سے اتنی غلطی ہوئی کہ میں اُس وقت طیش میں آکر نکل گئی۔''

اُس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔دیر تک اسی طرح بیٹھی رہی۔جب اُس نے چہرہ اُٹھایا تو تڑپا دینے والے لہجے میں بولی۔

''آپا وہ کیسا وقت تھا۔میرے قدموں کو دوبارہ اپنے گھر میں جانا نصیب نہ ہوا۔ بیٹے اور بیٹی کے ڈر سے زیور میں نے پہلے ہی کسی ملنے والی کے پاس رکھوا دیا تھا۔گھر سے نکل کر بہن کے پاس چلی گئی۔بارہ دن وہاں رہی۔میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔بہنوئی رفیق کے پاس گیا،مگر اُس نے ایسی گندی باتیں کیں کہ جنہیں سن کر میرا جی چاہا کہ ساری زندگی اُس کی شکل نہ دیکھوں۔میں نے اُس کے ساتھ عمر گزاری تھی،وہ مجھے اتنا نہ سمجھ سکا۔پندرہ دن بعد لاہور آ گئی۔بشیر کو جانے کیسے میرے ٹھکانے کا علم ہو گیا،وہ بھی آنے لگا۔میں نے محسوس کیا کہ وہ زیورات میں دلچسپی رکھتا ہے۔ایک دو بار جب اُس نے بات کی تو میں نے اُسے ڈانٹ دیا اور گھر آنے سے منع کر دیا۔

چند دنوں بعد ایک ملنے والی آئی۔اُس نے بتایا کہ رفیق نے تمہیں طلاق بھیج دی ہے۔ابھی تک یہ آس تھی کہ شاید قدرت رحم کر دے اور اُجڑا ہوا گھر پھر سے بس جائے،پر اب وہ بھی دم توڑ گئی۔

میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔خواب آور گولیوں کی خاصی مقدار کھائی۔ ہسپتال پہنچ گئی۔بشیر جتنا ذلیل انسان شاید ہی دنیا میں کوئی ہو۔اُس نے مجھ سے زیور لینا چاہا،وہ نہ ملا۔پیسہ مانگا،میں نے ڈپٹ دیا۔شادی کے لئے کہا۔میں نے دھتکار دیا۔اُسے پتہ چلا تو فوراً بھاگا بھاگا آیا،پولیس کو غلط بیان دیا۔میں تو موت کے دروازے پر پہنچی ہوئی تھی۔کیا جانتی تھی کہ کس نے کیا کہا ہے؟وہ مجھے بدنام کرنا چاہتا تھا اور اُس نے کیا۔

گھر اُجڑا۔شوہر سے جدائی ہوئی۔بچوں کو دیکھنے سے گئی۔عزت تھی،اُس کی بھی نیلامی بول گئی۔زیور جو لے کر نکلی کہ کہیں بیٹے بیٹی کی ہتھے نہ چڑھ جائے۔وہ جن کے پاس رکھا،اُنہوں نے ہضم کر لیا۔آپا مجھ جیسی بدنصیب بھی کوئی ہو گی؟میرے کھلیان میں آگ لگی جس نے سبھی کچھ جلا ڈالا۔

آج کل وہ ٹی وی اور فلم کے ایک مشہور آرٹسٹ کی بچی کی آیا ہے۔ مقام عبرت ہے وہ جس کے آگے پیچھے نوکر تھے جس نے کبھی اٹھ کر پانی بھی خود نہ پیا تھا وہ لوگوں کی نوکر ہے۔

میری اماں نے مصالحت کروانے کی بھرپور کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکی۔ رفیق اپنے بچوں کے ساتھ ایک دوست کے پاس رہتا ہے۔ سر کے سارے بال سفید ہوگئے ہیں۔ جھک کر چلنے لگا ہے۔ بات کرو تو پریشان لہجے میں کہتا ہے۔

''کسی کی دل آزاری کبھی نہ کی تھی۔ کسی کو دکھ بھی نہیں دیا تھا۔ پھر یہ سب معلوم نہیں کیوں سہنے کو ملا؟''

لکھنے بیٹھی تو رُندھی آواز نے بار بار کانوں میں سرگوشی کی۔

''آپا! مجھے اپنا گھر بہت یاد آتا ہے۔ میرا وہ خوبصورت آنگن جس میں میں نے آم اور امرودوں کے پیڑ لگائے میں نے تو اُن کا پھل بھی نہیں کھایا۔ لوگ کھاتے ہوں گے۔ میں تو اب بے گھر ہوں، گلی کوچوں میں اُڑتے پھرتے تنکوں سے بھی ہلکی۔''

☆☆☆

انتقام

یہ بڑا واضح سگنل تھا جو مجھے اس دھان پان سے وجود نے صوفے پر اپنی نشست ٹھیک کرتے ہوئے دا ہنی آنکھ دبا کر دیا تھا۔ میں نے اپنا بازو بڑھا کر اس کی لانبی گردن پر جھولتی آوارہ بالوں کی چند لٹیں اپنے ہاتھوں کی پوروں سے مسلیں اور بولی۔

''آخر تم کیوں نہیں سوچتی ہو۔ اچھا بھلا خوبصورت لڑکا۔ پھر تمہارا پھوپھی زاد۔''

''بہت پسند ہے تمہیں، خود کر لو نا۔''

سانولا نمکین چہرہ میری طرف مڑا اور بے نیازی سے یہ جملہ کہہ گیا۔ میں یقیناً اس جوابی حملے کے لئے تیار نہ تھی۔ سٹپٹا گئی۔

''شرم تو نہیں آتی۔ زبان کو لگام دینا سیکھو ورنہ تنگ کرے گی۔''

دونوں ماں بیٹی الجھ پڑی تھیں۔ میں تو بیچ میں سے جیسے نکل ہی گئی۔ اُس نے تنک کر کہا۔

''اب سمجھی، اِسی لئے مجھے گھسیٹ گھسیٹ کر یہاں لا رہی تھیں۔ ارے دل نہیں

مانتا میرا اُس کے ساتھ شادی کرنے کو۔ بتایئے نا آپا۔'' وہ میری جانب مڑی۔

''شادی کوئی زبردستی کا سودا ہے۔ جی نہیں مانتا تو کیسے حامی بھرلوں اور یہ اماں جو زبردستی کا طوق میرے گلے میں ڈالنا چاہتی ہیں۔''

اور لمبی سرد آہ اس نحیف ونزار وجود سے نکلی۔ آنکھوں میں غم دھواں سا بن گیا۔ ساری چمک دھند لا گئی تھی۔

ہماری ملنے والی تھیں۔ بہت دکھی اور غموں کی ماری۔ جوانی ساس نندوں کے ستم سہنے میں کٹی۔ میاں مزاج کا اچھا تھا پر کانوں کا بڑا کچا۔ جو ماں بہنوں نے کہہ دیا وہی سچ جان لیا۔ تین بیٹے اور ایک یہ لاڈلی سی بیٹی تھی۔ نندیں بیاہی گئیں اور ساس نے ڈیرہ اگلے جہان لگا لیا تو چین اور سکون ملا۔

مگر یہ وقت بڑا مختصر تھا۔ میاں کو بیٹھے بٹھائے دل کا دورہ پڑا پل جھپکنے میں چل بسا۔ جگہ جگہ کوڑیوں کے مول زمینیں خریدی ہوئی تھیں۔ کچھ بتانے سمجھانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ گم سم حیران پریشان تقدیر کے اِس کڑے وار پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی۔ بڑا بیٹا ابھی میٹرک بھی نہ کر پایا تھا کہ سارا بوجھ اُس کے کمزور کاندھوں پر آپڑا۔ لیکن وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور متین تھا۔ تنہائی میں اُس نے ماں کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور بولا۔

''آپ اتنی تھڑ دلی کا مظاہرہ مت کریں۔ رشتہ دار کمزوریوں سے واقف نہیں ہونے چاہئیں۔ بار بار یہ مت کہیں کہ لڑا ابھی بچہ ہے اُسے زمانے کے اونچ نیچ سے کیا واقفیت؟''

ماں نے آنسو پونچھے اور بیٹے کی طرف دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ چھوٹا نہیں بہت بڑا ہوگیا ہے۔ اور وہ واقعی وہ دنوں میں بڑا ہوگیا تھا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کھلے ہاتھ پاؤں کا، ماں کو اُس پر بے طرح پیار آتا۔ بہت لائق بھی نکلا۔ فوج میں کمیشن مل گیا۔

جانے لگا تو ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ رُندھی آواز میں بولی۔

''بچہ! تیرا باپ تو لمبے چوڑے پسارے چھوڑ گیا ہے تو انہیں سمیٹنا۔ تیرے بغیر تو میں ادھوری ہوں۔''

اور ماں کی آنکھوں میں آنسو پونچھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

''اماں فوج میں جانا تو ہمیشہ سے میری تمنا تھی۔ باقی پساروں کا کیا ہے۔ زمین ٹھیکے پر چلی جائے گی۔''

اور پھر وہ کامیاب ہوا۔ ماں نے سارے محلے میں لڈو بانٹے، ملنے جلنے والوں سے مبارکبادیاں وصول کیں۔ خاکی وردی میں کندھوں پر ستارے سجائے جب وہ آیا تو ماں نے جی بھر کر بلائیں لیں۔ بہن نے اپنی ساری سہیلیوں کی دعوت کی اور انہیں اپنے بھائی سے ملایا۔ خوب رونق لگی۔

اب ماں اُس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ دیکھ بھال کر اونچے راجپوت گھر میں منگنی کی۔ لڑکی بی۔اے پاس تھی۔ لڑکی والے بھی پھولے نہ سماتے تھے۔ ایسا قابل داماد ملنا بھی مسرت کی بات تھی۔

اور جب شادی کی تیاریاں اپنے پورے عروج پر تھیں۔ وہ شادی کے لئے چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا اور اپنے دوست کے ساتھ کچھ ذاتی خریداری کے لئے بازار جا رہا تھا کہ راستے میں سکوٹر کا منی بس کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ دوست موقع پر ہی دم توڑ گیا اور اُس نے ہسپتال جا کر جان دے دی۔

ماں بہن اور چھوٹے بھائیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ماں کے بین سنے نہ جاتے تھے۔ حقیقی معنوں میں وہ اب بیوہ ہوئی تھی۔ دوسرا بیٹا اتنا سمجھدار نہیں تھا اور تیسرا ابھی چھوٹا تھا۔ اُس سے کیا توقع ہوتی۔

بڑے بیٹے کی منگیتر تین سال بیٹھی رہی۔اشاروں کنائیوں سے لڑکی کے والدین نے اُس پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ بس اُن کی امانت ہے۔تقدیر کے آگے کوئی زور نہیں۔بڑا نہیں چھوٹا سہی۔اور وہ اُسے بیاہ لائی۔بیٹا سیاہ وسفید کا مالک تھا۔کچھ عقل سے بھی محروم تھا۔ بیوی بھی خاصی تیز طرار ثابت ہوئی۔دو کنال کے گھر میں اُس نے ساس کو دو کمروں میں سمیٹ دیا اور بقیہ میں اپنے پاؤں پسار لئے۔

اب وہ بیٹی کے لئے فکرمند تھی۔کسی موزوں جگہ اسے بیاہ دینا چاہتی تھی کہ نند نے اُس کے آگے دستِ سوال دراز کیا۔نندوں نے اُس سے اپنے زمانے میں اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔وہ کچھ تذبذب کا شکار تھی۔اجنبی اور غیر لوگوں سے بھی گھبراتی تھی کہ جانے کیسے نکلیں۔اپنا برا ہوا گا تب بھی غیروں سے اچھا ہوگا۔مارے گا تو پانی کو بھی پوچھے گا۔ایک وقت سختی کرے گا تو دوسرے وقت پیار بھی کرے گا بڑے بوڑھوں کے مقولے ذہن میں گونجتے۔پر بیٹی تھی کہ ہتھے سے اکھڑی جاتی تھی۔ماں تو گومگو کا شکار تھی پر بیٹی کا انکار واضح تھا۔رشتوں کے قحط بھرے دور میں کسی خیر خواہ نے مشورہ دیا۔

''دیکھتی سوچتی کیا ہو حامی بھر لو۔ارے اِس کے مرے ہوئے بھائی کی بیٹی ہے اچھا ہی رکھے گی۔''

کل رات وہ ہانپتی میرے ہاں آتی تھی کہ میں فوزیہ کو سمجھاؤں اور آج وہ اسے لے کر میرے گھر آئی تھی۔طےشدہ پروگرام کے مطابق میں نے وکالت کا سلسلہ ابھی شروع کیا تھا کہ تڑ سے جوابی حملہ ہوا اور میں بوکھلا گئی۔

''پر مجھے یہ تو بتاؤ کہ آخر تمہارے انکار کی ٹھوس وجہ کیا ہے؟''

''بھئی بچپن سے تو کان سنتے سنتے پک گئے کہ ایسی چنڈال نندیں تھیں کہ بھاوج کو سوا نیزے پر چڑھائے رکھا۔آپ ہی فیصلہ کریں کہ میں اُسی بھاوج کی بیٹی ہوں میری

گت نہ بنائیں گی؟''

میں تو ابھی جواب دینے کا ہی سوچ رہی تھی کہ میری اماں نے ملائمت سے کہا۔

''بیٹی یہ دنیا کی ریت ہے ہر وہ جگہ جہاں نندیں مختار ہوں وہاں بھاوجوں کی عموماً گت ہی بنتی ہے۔یہ دور مختصر سا ہوتا ہے۔بیاہ کر کے اپنے گھر گئیں اور سب کچھ ختم۔''

اماں کی اِس بات کا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ڈرائنگ روم میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی تھی جو نوکر کے چائے کے برتن لانے سے جلدی ہی ٹوٹ گئی۔گرم گرم بھاپ اُٹھتی، چائے کی پیالیاں میں نے اُن کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ماں نے دو تین گھونٹ بھرے اور میری طرف دیکھتے ہوئے غم سے بوجھل آواز میں بولی۔

''بیٹی کون سی ماں نہیں چاہتی کہ اُس کے بچوں کو زمانے کے سکھ ملیں۔میری تو جان اِس میں اٹکی ہوئی ہے۔کتنے لوگوں سے کہا،سینکڑوں روپیہ رشتہ کروانے والیوں پر لٹایا پر کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں ملا۔پھوپھی ہے،دیکھی بھالی ہے غیروں سے تو اچھی ہی ہوگی۔''

میں نے اُن کے غم کو محسوس کرتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی پر فوزیہ خاموش بیٹھی تھی۔

کوئی ہفتہ بعد میں نے اُس کی منگنی کے لڈو کھائے اور اپنے آپ سے کہا۔

''بے چاری لڑکیاں ماؤں کے تند و تیز دلائل کے بہاؤ کے سامنے مزاحمت کے بند کہاں باندھ سکتی ہیں؟چلو اللہ اچھا کرے۔''

شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔چھوٹا بھائی اگرچہ بہت خودغرض سا ہوتا جا رہا تھا مگر بہن کی شادی میں وہ نہ صرف شامل ہوا بلکہ کھانا فریج اور نیلی بار کی گائے اور بھینس اُس نے بہن کو اپنی طرف سے دی اور پالکی میں بٹھا کر کہاروں کے ساتھ مل کر اُسے سسرال بھی چھوڑ آیا۔

نئے لوگ نہیں تھے۔ جانے پہچانے، دیکھے بھالے۔ فوزیہ کا دولہا بہت خوبرو تھا۔ ابھی چند ہی دن ہوئے تھے، جب طنز کا پہلا پتھر تڑاخ سے آیا اور بھولی بھالی لڑکی کے شیشہ دل پر لگا۔

گہرے نیلے رنگ کے کامدانی کپڑے اس نے پہنے، بالوں کا نفاست سے جوڑا بنایا۔ میک اپ کیا، ہلکا پھلکا زیور پہنا اور شام کی چائے کے لئے آنگن میں آئی۔ پھوپھی نے کڑی نظروں سے اُس کا جائزہ لیا اور ہونٹ سکیڑ کر بولی۔

''لباس کا چناؤ ہمیشہ اپنے جسمانی رنگ کے مطابق کرنا چاہیے نیلے پیلے اودے رنگ صورت کو مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔''

پھر وہ اُس کی طرف براہ راست مخاطب ہوئی۔

''رنگ گہرا ہے تمہارا۔ ہلکے رنگوں کے کپڑے استعمال کیا کرو۔''

اُس کا دولہا اور رشتے کا دیور بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسی توہین آمیز باتیں۔ وہ سلگ اُٹھی۔

اس میں شک نہیں وہ سانولی تھی مگر اُس کے نقش ایسے دلآویز اور پرکشش تھے کہ وہ گورے رنگوں کو پیچھے پھینکتی۔ جیسا بھی گہرا کپڑا پہنتی اُس پر جچتا۔

چائے پیتی تو وہ بھول ہی گئی۔ احمد نے اک ذرا سا ٹہوکا دیا اور دھیمے سے بولا۔

''کہاں گم ہو؟''

اور اُس نے سر جھٹک کر آہستگی سے کہا۔

''کہیں نہیں۔''

اُس کا جی تو چاہا کہ چیخ کر کہے۔

''اتنی جلدی ملمع اتر جائے گا اس کا تو مجھے اندازہ ہی نہ تھا۔''

یہ پہلا وار تھا۔ دوسرا وار کوئی تین دن بعد ہوا۔ وہ نہا کر غسل خانے سے نکلی۔ جب راہداری سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تو کانوں میں ساس کی آواز گونجی۔ اپنے بیٹے سے کہہ رہی تھی۔

''ارے حمو بیٹے تیرے لئے تو نازک سی گڑیا چاہیے تھی۔ میری تو آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔ کل تیرے پیچھے سکوٹر پر بیٹھی ذرا نہیں بچ رہی تھی۔''

''امی جان اب ایسی باتوں سے کیا فائدہ؟''

اور لمبی سانس بھر کر وہ بولی۔

''ہاں فائدہ تو نہیں۔ پر جانے حسرت سی کیوں رہ گئی ہے؟''

وہ دروازے کا پٹ پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ابھی تو ہاتھوں پر مہندی کے رنگ کی آب و تاب میں ذرا سا فرق نہیں پڑا تھا اور دلوں میں شگاف پڑنے لگے تھے۔

''اِسے میری ماں سے کیا دشمنی تھی؟ کس جگ کا بیر لینے کے لئے اِس نے یہ کام کیا؟ کسی نے اِس کی منتیں کی تھی۔ کون اِس کے پاؤں پڑا تھا؟ کس نے کہا تھا اِس سے کہ وہ یہ رشتہ کرے؟ تب مرے بھائی کے لئے اِس کی محبت پھوٹی پڑ رہی تھی اور ابھی تو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ سارا پیار صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔''

وہ قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنے سراپا پر بھرپور نظر ڈالی۔ وہ گداز جسم کی مالک تھی جو قدرے موٹاپے کی طرف مائل ضرور تھا مگر اُسے فربہی کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

محبت کی آنکھ کو جسم اور وجود کیسا نظر آتا ہے، اِس کا صحیح اندازہ آج ہوا تھا۔ اماں اُسے ملکہ نور جہاں کہتی تھی۔ سکھی سہیلیاں اُسے مغل آرٹ کا شاہکار کہتی تھیں۔ اور ایک یہ ساس تھیں جسے وہ بدرنگ اور موٹی نظر آتی تھی یہی ساس جو سال بھر سے اُس پر واری

صدقے ہوتی تھی۔گھر آنے میں جو جرم سرزد ہو گیا تھا، شاید وہ نا قابل برداشت ہو رہا تھا۔ پر گھر تو اُسے آنا ہی تھا جبکہ وہ اُسے لانے کے لئے ہی تو اُن کے گھر گئی تھی۔

وہ لیٹ گئی پر دل کیسا ویران اور اُجڑا اُجڑا سا محسوس ہو رہا تھا۔ساری اُمنگیں جیسے اپنی موت آپ مرنے لگی تھیں۔شام ہو گئی وہ بس یونہی لیٹی رہی۔جب احمد کمرے میں آیا۔ اس نے بتی جلائی اور بولا۔

''کیسے لیٹی ہو آؤ گھومنے چلیں۔''

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔اس کے ہونٹوں پر آزردہ مسکراہٹ ابھری اور اُس کی آنکھوں میں غم کے چمکتے موتی نمودار ہوئے اور زبان نے فریاد کی۔

''احمد! زندگی میں ریاکاری سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔میں اگر تمہارے ساتھ سجتی نہیں تھی تو فضول سجانے کی کوشش کیوں کی گئی؟''

احمد کے دہکتے چہرے کا رنگ پل بھر کے لئے غائب ہوا۔وہ ساکت چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا پھر بولا۔

''میں نے تو ایسا نہیں کیا۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔دوپٹہ اپنے شانوں پر ٹھیک کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔

''نہیں کہا تو کہنے لگو گے۔جن بیٹوں کی مائیں ایسی کم ظرف ہوں وہ بیٹے بھی جلد یا بدیر رنگ پر آجاتے ہیں۔تم ابھی اچھے ہو مگر کتنے دن اچھے رہو گے جب اٹھتے اٹھتے ایک ہی ذکر سنو گے تو۔''

''پلیز فوزیہ۔'' احمد نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تمیز اور اخلاق کے دائرے میں بات کرو۔میری ماں ہے۔''

اور اُس نے دکھ بھری نگاہ اس پر ڈالی اور گردن کو موڑ لیا۔ یہ تو ابتدا تھی ایسی باتیں روزمرہ کا معمول بنتی جا رہی تھیں۔ کوئی نہ کوئی طنز، چبھتا ہوا کوئی فقرہ فضا میں اُچھال دیا جاتا۔ وہ سنتی۔ سینے میں الاؤ سا دہک اٹھتا۔ زبان بولنے کو بے قرار ہوتی۔ مگر ایک دو بار جب ہونٹوں سے باہر نکلی اور دل کی بھڑاس نکالی تو طوفان ہی آ گیا۔ احمد نے بھی اُسے سرزنش کی۔ اور اُس نے زبان کو سی لیا۔ ماں کے گھر آتی تو اُس سے بھی بات نہ کر پاتی اپنے آپ سے کہتی۔

''اُس سے کیا کہوں وہ تو پہلے ہی غموں سے چھلنی ہے۔''

ماں کبھی کبھی اُس کے پاس بیٹھ کر پوچھتی۔

''فوزی تو مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ رقیہ کا تیرے ساتھ کیسا سلوک ہے؟''

اور وہ ہنس کر کہتی۔

''اماں کوئی خاص بات ہو تو بتاؤں بھی۔ ٹھیک ٹھاک طرح سے ہی رہتے ہیں ہم لوگ۔ آپ میرے بارے میں فکرمند نہ ہوا کریں۔''

''تو مجھے نہیں بتاتی بیٹی مگر میری آنکھیں تیرے اندر تک جھانک لیتی ہیں۔ خوشی تو اپنے منہ سے بولتی ہے۔ اپنے وجود کا اظہار کرتی ہے۔ میں نے تجھے اپنی ضد کی بھینٹ چڑھا دیا۔''

اور وہ فوراً اماں کے دونوں ہاتھ پکڑ لیتی۔

''نہیں اماں آپ تو بلاوجہ افسردہ ہو رہی ہیں۔ گھر میں چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔''

بڑے حوصلے اور جی داری سے اُس نے پہاڑ جتنی بڑی باتوں کو چھوٹی چھوٹی

باتیں کہہ دیا تھا۔وہ اس حقیقت سے بھی آنکھ چرانے لگی تھی کہ ماں کے ساتھ ساتھ احمد بھی بدلتا جارہا تھا۔سکھاوت تو پتھروں کو بھی پھاڑ دیتی ہے احمد تو انسان تھا۔

وہ اب ماں بن رہی تھی۔اُس کے سارے وجود پر سستی اور کاہلی کا راج تھا۔اب باقی بہت سی باتوں کے ساتھ اُس کا نکما اور سست ہونا، کام سے جی چرانا بھی شامل ہوگیا تھا۔

''سارا دن پڑی پلنگ توڑتی رہتی ہے۔کوئی طریقہ ہے یہ؟''

اور احمد بھی طنز کے تیر چھوڑنے سے نہ چوکتا۔

''اب ایسی بھی کاہلی کیا؟ امی جان سارا دن چولہے کے آگے بیٹھی رہتی ہیں۔کچھ تو سوچا کرو۔''

اور وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتی۔مسکین سے لہجے میں کہتی۔

''احمد میں تو بہت چاہتی ہوں کہ کام کروں مگر معلوم نہیں اتنی ڈھیر ساری سستی میرے وجود میں کہاں سے آگئی ہے آنکھیں کھولتی ہوں مگر وہ اپنے آپ بند ہوتی چلی جاتی ہیں۔''

''غلط بات۔تم میں ذمہ داری اور دوسروں کا احساس نہیں۔''

اور اُس کی آنکھیں بھر بھر آتیں پر وہ آنسوؤں کو بہنے سے روک دیتی۔اپنے آپ کو گھونٹ لیتی۔ایسے پتھروں کے سامنے رونا اپنی تذلیل نظر آتی۔بس خاموشی سے کمرے سے نکل جاتی۔

جہاں اور بھی باتیں سنتی تھی وہاں اب یہ بھی سننا لازمی ہوگیا تھا۔

''ایسی سست ہے۔ارے لڑکی ہوگی۔لڑکیاں ہی نحوست پھیلاتی ہیں۔''

پاس بیٹھی خادمہ ٹکڑا لگانے سے نہ چوکتی۔

''اپنا حمو تو ابھی چھوٹا سا ہے اسے تو مولا بیٹی نہ دیو۔بیٹیاں تو پیدا ہوتے ہیں قبیل

دار بنا دیتی ہیں۔''

''ہاں پروردگار رحم کرے۔''

پر پروردگار نے رحم نہیں کھایا۔ بیٹی کے بھولے بھالے معصوم چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے آپ سے بولتی تھی۔

''جب انسان رحم کھانا چھوڑ دیں۔ وہ کسی کو روند ڈالیں تب خدا بھی اِسی ڈگر پر چلنے لگتا ہے۔ قدرت بھی اپنے طور طریقے بدل لیتی ہے۔ پر خدایا میں تجھ سے کبھی کوئی گلہ نہیں کروں گی۔ شکوہ نہیں کروں گی۔''

وہ زچگی کے لئے اپنی ماں کے گھر آئی ہوئی تھی۔ تخلیق کے عمل کی ساری اذیت اور درد کا سارا کرب اُس نے اپنی جان اور اپنی روح پر جھیلا تھا۔ کوئی پیار بھری مسکراہٹ نہیں تھی۔ کسی کے خلوص میں ڈوبے دو بول نہیں تھے۔ بیٹی کا سن کر اُس نے سوچا تھا۔

بیٹا ہوتا تو شاید کوئی دنیا داری کے لئے ہی آ جاتا۔ مگر اب کس نے آنا ہے؟ احمد نے تو مدت ہوئی اُس کی ماں کے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ پھوپھی کو خدشہ تھا کہ وہ تعویذ گنڈوں سے کہیں اُسے اپنی طرف مائل نہ کر لے۔ دو بار آنے کا مجرم ضرور تھا وہ بھی بس کھڑے کھڑے۔ ساس واری صدقے ہوتے نہ تھکتی۔ کہیں مٹھائی منگوا اور کہیں دودھ کے جگ بھر کر میز پر سجائے پر اُس نے کچھ نہ کھایا اور نہ دودھ کا گھونٹ بھرا۔

جب وہ چلا گیا تو اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ زار زار روئی۔

''کیسی بد نصیب ہوں میں۔ شوہر نے سکھ دینا چاہا تو جہان سے چلا گیا۔ بیٹا ہونہار نکلا تو وہ بھی موت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ لاڈلی بیٹی پھوپھی کو دی کہ وہ دکھ سکھ کی ساتھی بنے گی مگر اُس نے جانے کس جگ کا بدلہ لیا؟''

بچی دو ماہ کی ہو گئی مگر سسرال سے کسی نے بھولے سے بھی قدم نہ رکھا۔ وہ کیسے

اُس گھر میں رہتی جہاں بھاوج تھی جس کی آنکھوں میں وہ بہت بری طرح کھٹکتی تھی؟

اور ایک دن اُس نے بیٹی کو کندھے سے لگایا۔ٹوکری ہاتھ میں پکڑی اور سسرال آ گئی۔کسی نے اُس کی پذیرائی نہ کی۔ویسے گھر میں سبھی تھے۔پھوپھی ساس، احمد، پھوپھا سسران کے بچے اور نوکرانی۔پھوپھی ساس کے بچوں نے بیٹی کو گود میں اٹھایا اور اُسے پیار کیا۔

احمد بہت مصروف رہنے لگا تھا۔صبح جاتا شام کو گھر لوٹتا۔کبھی رات کو بھی غائب ہو جاتا۔ایک دو بار اُس نے پوچھا مگر بے رُخی کا انداز پا کر اُس نے پوچھنا اور بات کرنی ہی چھوڑ دی تھی۔

اور اب اُس پر ایک تلخ حقیقت کا انکشاف ہو رہا تھا۔احمد کسی لڑکی کے چکر میں تھا۔پینٹ کی جیبوں سے ٹکٹ، ہوٹلوں کے بل اور چھوٹے چھوٹے رقعے نکلتے۔لڑکی کا نام شہناز تھا اور وہ کسی اشتہاری کمپنی میں ملازم تھی۔

''خوبصورت ہوگی، نرم و نازک بھی ہوگی اور سکوٹر پر اُس کے پیچھے سجتی بھی ہوگی۔''

نماز پڑھ کر اُس نے قرآن پاک کو کھولا۔ورق اُلٹے اور سوچا کہاں سے پڑھوں کہ دل کو قرار ملے اور جیسے ہی صفحہ کھلا اور پہلی نظر جس آیت پر پڑی وہ یہی تھی۔

''اور بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اُس کی آنکھوں سے ساون بھادوں شروع ہوگئی۔قرآن پاک کے صفحے بھیگتے گئے۔دل کا درد آنسوؤں میں بہتا گیا۔اور جب گھنٹہ بھر بعد وہ اُٹھی تو خاصی پرسکون تھی۔

اُس نے احمد سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔اُس کی شامیں کس کے ساتھ بسر ہوتی ہیں؟ بس اُس نے تو ہونٹوں پر تالے ڈال لئے تھے۔اور لوحِ دل پر لکھ لیا تھا

کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ماں سب جانتی تھی۔دوپہر کے لئے احمد کا کھانا دفتر جاتا تو یہ دو آدمیوں کا ہوتا۔ ماں کھانے لے جانے والے کو تاکید کرتی کہ شہناز کا بھی ہے اُسے بھی کہنا کھا لے۔بیٹے کی یاری اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔

اور پھر احمد نے اُس سے نکاح کرلیا۔ماں سچ بن کر گئی اور اُسے گھر لے آئی۔وہ اُن دنوں پورے دنوں سے تھی۔وسیع وعریض آنگن میں کرسی پر آنکھیں بند کئے خاموش نیم دراز تھی۔کبھی کبھی آنکھیں کھول کر بے کراں آسمان کی وسعتوں کو دیکھ لیتی اور پھر انہیں بند کر لیتی۔

خادمہ اور پھوپھی نے تیل کی کپی سیاہ آہنی گیٹ کے دونوں پٹوں کے کونوں میں انڈیل دی۔بوئل گرین ٹیونا باہر کھڑی تھی جس میں احمد اپنی ماں اور نئی دلہن کے ساتھ بیٹھا تھا۔اُس نے بند آنکھیں کھولیں۔اُس کا چہرہ پیلا پھٹک ہو رہا تھا۔دُلہن گاڑی سے نکل رہی تھی۔

کہیں درد کی لہریں اُٹھی تھیں۔اُس نے ہونٹ بھینچ لئے اور اپنے آپ سے کہا۔

''تو اپنے بندوں کا حال جانتا ہے۔جس کرب اور اذیت سے میں دوچار ہوں تو اُس سے بھی باخبر ہے۔میں تجھ سے شکوہ نہیں کروں گی کہ میرے دل کو تسکین ملتی ہے جب میرا دل کہتا ہے کہ صبر رائیگاں نہیں جاتا۔''

اور ڈیڑھ گھنٹے بعد اُس نے اُسی گھر میں دس پونڈ کے بچے کو جنم دیا۔ایسا خوبصورت اور صحت مند بچہ جسے دیکھ کر احمد اور اُس کی ماں گنگ سے ہو گئے۔

بیٹی کے ہاں بیٹے کی پیدائش اور اُس پر سوت آنے کی دونوں خبریں فوزیہ کی ماں کو اکٹھے ہی ملی تھیں۔ایسے میں دل کا غبار نکالنے کے لئے میرا ہی گھر تھا جہاں وہ آئی۔آنسو بہہ

رہے تھے اور وہ بول رہی تھی۔

''کہتے ہیں تیرے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ یہ دیر اتنی لمبی نہ ہو کہ میں دنیا سے ہی چلی جاؤں۔ اِن کھلی آنکھوں کے ساتھ مجھے اُن کا انجام دکھا جنہوں نے میری بیٹی کو اِس حال میں پہنچایا۔''

اِس دنیا میں بہتیرے لوگ ہیں جو صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ایسے ہی لوگوں میں فوزیہ بھی تھی۔ اُس کے بیٹے کی پیدائش کو شہناز کی خوش بختی سے منسوب کیا گیا۔

''بھاگوان بہو گھر آئی ہے پوتا لائی ہے۔'' اُس کی ساس ہر آئے گئے سے کہتی۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے انہیں خرمستیاں کرتے دیکھتی اور آنکھیں بند کر لیتی۔ کانوں میں روئی ٹھونس لیتی۔ کبھی کبھی احمد مضطرب سا ہو جاتا۔ اُس سے بات کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ کسی نہ کسی مصروفیت کی آڑ لیتی اور جب وہ کہتا۔

''تمہارے پاس مجھ سے بات کرنے کے لئے بھی وقت نہیں۔''

وہ اِک ذرا آنکھیں اوپر اٹھاتی خاموش آنکھیں جن میں غالباً طوفان مچلتے ہوتے۔ سفید ہونٹوں کو ذرا سا وا کرتی اور کہتی۔

''پھوپھو خفا ہوں گی۔'' اور اُٹھ کر وہاں سے چل دیتی۔

ایک سال بعد ایک اور بیٹا آ گیا۔ شہناز جل کر ہی تو رہ گئی۔ احمد پوری طرح اُس کے جال میں اُلجھا ہوا تھا۔ مگر جیسے وہ خوفزدہ سی تھی کہ اُن کے درمیان وہ مضبوط کڑیاں جنہیں بچے کہا جاتا ہے غائب ہیں۔ اور اُن کے پیدا ہونے کے امکانات بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ شادی سے قبل کے اسقاط نے رحم میں خرابیاں کر دی تھیں جنہیں ابھی وزنی دوائیوں کے پیکٹ بھی ٹھیک کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ بچے کی پیدائش پر اُس نے احمد کا گریبان پکڑا اور بولی۔

''تو تم جھوٹ بولتے تھے مجھ سے فریب کرتے تھے کہ تمہارا اب فوزیہ سے کوئی ناطہ نہیں۔ یہ بچہ کہاں سے آیا؟''

''یہ میں نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ تمہارا بچہ ہوگا۔''

''میرا؟'' اُس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں۔'' احمد کا جواب تھا۔

''میں نے فوزیہ سے کہہ دیا ہے جاؤ بچہ اُس سے لے لو۔''

دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے اُس کے کمرے میں آئے۔ شہناز نے بچے کو اٹھایا اور بولی۔

''احمد کا فیصلہ ہے یہ بچہ میرا ہوگا۔''

اُس وقت دودھ کی دھاریں اُس کی چھاتی سے بہہ رہی تھیں۔ ساری قمیض بھیگ گئی تھی۔ اُس نے دونوں کو دیکھا اور ہونٹوں پر قفل لگا لیا۔

بچہ شہناز پالنے لگی۔ دفتر سے تین ماہ کی چھٹی لی۔ آیا کا بندوبست کیا۔ یہ اُس کا بچہ تھا۔ اُس کا بیٹا جسے اُس نے نو ماہ تک اپنے خون سے سینچا پر جسے اُس سے چھین لیا گیا۔ دودھ دھاروں بہتا۔ اُس کی آنکھیں تنہائی میں دھاروں پانی بہاتیں۔ جی چاہتا، بچہ چھین کر بھاگ جائے۔ مگر کہاں؟ ماں کے گھر جہاں بھاوج ہے۔ جو اُسے ایک آنکھ دیکھنا گوارہ نہیں کرتی۔ جہاں بے حس بھائی ہے جس نے پلٹ کر یہ نہ دیکھا کہ وہ کس حال میں ہے؟ جہاں غمزدہ ماں ہے۔ نہیں وہ کہیں نہیں جائے گی۔ وہ اُس نیلی چھت والے کا انصاف دیکھے گی۔

سب احمد کے دوست کی شادی میں گئے تھے، شہناز، احمد، فوزیہ کی ساس اور چھوٹا بچہ خوب سج دھج نکالی تھی۔ بن سنور کر گئے تھے۔ بچہ ایسا پیارا اور خوبصورت لگ رہا تھا کہ فوزیہ کی آنکھیں اُسے دیکھتے نہ تھکتیں۔ اندر باہر جاتے چور آنکھوں سے وہ اُسے دیکھ رہی

تھی۔

گھر میں وہ اور اُس کی بیٹی ہی تھیں۔ بڑا بیٹا بھی باپ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ دن کے تیسرے پہر اُسے اطلاع ملی کہ احمد کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ احمد کا دوست زبیر اُسے بتانے آیا تھا۔ حادثے کا سن کر اُس کی زبان سے دو لفظ نکلے۔

''ہائے میرے بچے!'' وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ دیر بعد ہوش میں آئی زبیر نے بتایا۔

''بھابھی! بچے تو بالکل ٹھیک ہیں۔ ہاں بڑوں کی حالت تشویشناک ہے۔''

اُس نے چادر اٹھا کر اوڑھی اور اُس کے ساتھ ہسپتال آئی۔ شہناز دم توڑ چکی تھی۔ ساس دم توڑ رہی تھی۔ احمد ابھی کشمکش سے دوچار تھا۔

آدھے باراتی ہسپتال پہنچے ہوئے تھے۔ دونوں بچے لوگوں نے سنبھالے ہوئے تھے۔ والہانہ انداز میں جھپٹ کر اُس نے اپنے جگر گوشوں کو سینے سے لگایا اور اُس نے ساس کی جان کنی کی حالت کو دیکھا اور دھیرے سے کہا۔

''خدا تمہیں معاف کرے۔''

اور لفظ ادا ہی ہوئے تھے کہ اُس کی گردن ڈھلک گئی اور کوئی پانچ منٹ بعد احمد نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا۔ تین لاشیں چارپائیوں پر آنگن میں پڑی تھیں۔ رقیہ کا اکلوتا بیٹا وجیہہ احمد، خوش شکل رقیہ اور اُس کی خوبصورت بہو شہناز۔

وہ دری پر بیٹھی تھی اُس کی آنکھ سے ایک قطرہ نہیں بہا تھا۔ لوگوں نے کہا اُسے سکتہ ہو گیا ہے اُسے رلاؤ کہیں دماغ پر اثر نہ ہو جائے۔

کیسا مقام عبرت تھا جو لوگ کسی حد تک صورت حال سے واقف تھے وہ استغفار پڑھ رہے تھے۔

میں اُن دنوں سری لنکا ایک ثقافتی وفد کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو اِس حادثے کے بارے میں پتہ چلا۔ شام ہوئی تو فوزیہ کے گھر افسوس کے لئے گئی۔

یہ گرمیوں کی شام تھی۔ وسیع وعریض صحن نکھرا ہوا تھا۔ اطراف میں اُگے بوٹے مسکرا رہے تھے۔ پیڈسٹل فین چل رہا تھا۔ کوٹ میں اُس کا چھوٹا بیٹا لیٹا دولتیاں چلا رہا تھا۔ اور وہ سادہ سے کپڑوں میں کرسی پر بیٹھی بیٹی اور بیٹے کو شربوزے کاٹ کر کھلا رہی تھی۔ ذرا فاصلے پر اُس کی ماں عصر کی نماز ادا کر رہی تھی۔ پورا گھر ایک الوہی سکون اور طمانیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ فوزیہ گلے ملی اور جب میں نے تعزیت کے لئے زبان کھولنا چاہی اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دھیمے سے بولی۔

''خدا مغفرت کرے۔ میرا صبر اور قدرت کا انتقام دونوں ہی زبردست تھے!''

☆☆☆

داستان ساتھ لائے

طاہر جمال میرا فسٹ کزن ہے۔ جوانی کے شہ زور گھوڑے پر نیا نیا بیٹھا ہے۔ بھاگ دوڑ اور اُچھل کود کی تیز چابک کے سڑاکوں سے گھوڑی کو بوکھلائے دیتا ہے۔ موٹر بائیک کے تیز رفتار پہیے بیچاری سڑک کا کلیجہ چھلنی کئے دیتے ہیں۔ کسی پل کسی لمحے اُس کے تھرکتے وجود کو قرار نہیں۔ ایک دن پتہ چلا کہ ایکسیڈنٹ کر بیٹھا ہے کسی سوزوکی وین سے ٹکرا کر کچے پر گرا تو چھ فٹ قامت اپنے لئے عذاب بن گئی۔ ٹانگ پر وجود گرا تو دائیں ٹانگ دو جگہ سے ٹوٹ گئی۔ پاک فضائیہ کا شاہین ہونے کی وجہ سے فوری طور پر سی ایم ایچ میں داخل ہوا۔ ہمیں پتہ چلا تو ساری کزنیں اور بہنیں دعاؤں کے لئے ہاتھوں کے پیالے اُٹھائے ہسپتال اکھٹی ہو گئیں۔ دفعتاً میری کزن مسز علوی بولیں۔

''ارے یہاں میری دوست آصفہ کے میاں میجر احمد ہیں۔ آصفہ میرے ساتھ ملتان کالج پڑھاتی رہی ہے۔ اب تبدیل ہو کر یہاں آئی ہے۔ چند دن ہوئے مجھے مال پر ملی تھی۔ گھر آنے کا کہہ رہی تھی۔ بہت خوش تھی کہ ایک طویل عرصے کے بعد دونوں میاں بیوی

ایک سٹیشن پر اکٹھے ہوئے ہیں۔اُس سے ملتے ہیں۔میجر ڈاکٹر احمد بہت نفیس انسان ہے۔''

شام کو ہم آفیسرز کالونی میجر ڈاکٹر احمد اور اُن کی بیوی آصفہ سے ملنے اُن کے گھر گئے۔آصفہ کے ہاں بچے کی ولادت ہونے والی تھی۔بیچاری بوکھلائے ہوئے تھی۔ڈاکٹر صاحب گھر نہیں تھے۔آصفہ نے کافی تسلی دی کہ سرجن ڈاکٹر کرنل سے احمد کے گہرے تعلقات ہیں۔فکر کی کوئی بات نہیں۔

اُسے طاہر کا نام، رینک وغیرہ نوٹ کروا کر ہم لوگ آ گئے۔ڈاکٹر احمد نے طاہر کا خصوصی خیال رکھا۔ایک دن میری ہسپتال میں ہی اُن سے ملاقات ہوگئی۔میرے میاں سے بہت تپاک سے ملے۔ہم نے اُنہیں گھر آنے کا کہا جسے سنتے ہوئے اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے قبول کرلیا کہ وہ انشاءاللہ آصفہ کی ڈیلیوری سے فراغت کے بعد اُس کے ساتھ آئیں گے۔

ڈاکٹر احمد بہت نوعمر جاذبِ نظر اور دلکش شخصیت کا حامل انسان تھا۔آصفہ سے عمر میں چھوٹا لگتا تھا۔میں نے اپنی کزن سے اِس پر جب بات کی تو اُس نے میرے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! پر آصفہ اِس سلسلے میں کچھ کہتی نہیں۔ایک دو بار میں نے پوچھا بھی تھا، بس ٹال گئی۔''

پھر یوں ہوا کہ میجر احمد اور میرے میاں کی دوستی ہوگئی۔ایک دن دونوں میاں بیوی ہمارے گھر آئے۔وہ اپنے لئے کوئی زمین کا پلاٹ خریدنا چاہتے تھے۔میرے میاں سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ہم دونوں نے اُنہیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اور پراپرٹی ڈیلر کے پاس لے گئے۔

''اگر تم یہ بتاؤ کہ تمہاری شادی میجر احمد کے ساتھ کیسے ہوئی تو یہ وقت بہت ہی

اچھی طرح کٹے گا۔ یہ میں جانتی ہوں کہ اس شادی کے پیچھے ایک داستان ضرور ہے۔"

وہ ہنسی اور بولی۔

"تم نے یہ کیسے جانا؟ کیا مسز علوی نے کچھ بتایا؟"

"ارے مسز علوی بیچاری تو خاک نہیں جانتی۔ بس یہ میرا قیافہ ہے اور میرے قیافے سو فی صد نہیں تو پچانوے فی صد ضرور درست ہوتے ہیں۔"

اب وہ پھر ہنسی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"تمہارے بارے میں میرا قیاس بھی یہی ہے کہ تمہارے پیچھے بھی ایک کہانی سرسراتی ہے۔ پہلے تم سناؤ۔"

میری ہنسی فوارے کی طرح پھوٹی۔

"تم نے وہ بات کی کہ بچپنے میں جب ہم ایک دوسرے کے عشقیہ راز جاننے کی کوشش کرتے تو ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ دوسرے کا کمزور پہلو اُس کے ہاتھ میں رہے تاکہ بوقتِ ضرورت طعنہ زنی میں کوئی اُسے مات نہ دے سکے۔"

اب اُس کے ہنسنے کی باری تھی۔

باہر شام گہری ہو رہی تھی۔ چھاؤنی کی شفاف سڑکیں بڑی سنسان اور ویران لگتی تھی۔ اِکا دُکا لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ میں نے سر سیٹ کی بیک سے ٹکا لیا تھا اور اسے دیکھا تھا۔ قوس و قزح کے سات رنگ اس کی آنکھوں سے چھن چھن کر تے باہر آ رہے تھے۔

بحیثیت ایک لیکچرار کالج میں تعینات ہونا بھی ایک زبردست گلیمر رکھتا ہے خصوصاً جب انسان نیا نیا تعلیم سے فارغ ہوا ہو۔ پر جوش اور پر عزم ہو۔ کچھ کرنے اور کرانے کے جذبے سے سرشار ہو۔

کلاس میں لیکچر دیتی تو یوں ڈوب کر کہ زمان و مکان کی قید سے یکسر آزاد ہو جاتی۔

طالبات دیوانی تھیں ۔ میں جہاں پاؤں رکھتی وہ ہاتھ رکھتیں ۔ راستوں میں جگمٹھے لگا کر ایک نظر دیکھنے کے لئے کھڑی ہو جاتیں ۔ سارے کالج میں شور تھا میرے لمبے بالوں کا جو شیش ناگوں کی طرح میری پشت پر پھنکارے مارتے پھرتے ۔ میرے لیکچر دینے کے انداز کا، میری دلکش شخصیت کا۔

میرے پرستاروں میں ساجدہ بتول تھی جو جانے کتنی بار مجھے یہ کہہ بیٹھی تھی کہ مِس! آپ ہمارے گھر آئیں ۔ طالبات سے زیادہ میل ملاپ بڑھانا مجھے پسند نہیں تھا ۔ پر ساجدہ کے بلاوے میں اتنا خلوص اور اپنائیت ہوتی کہ میں ایک دن مجبور ہوگئی کہ اُس کی خواہش کو تکمیل دے دوں ۔

یہ بڑا خوبصورت سا دن تھا ۔ صبح سے آسمان پر بادل تھے اور ہوائیں تیز چلتی تھیں ۔ بہار کے نشیلے دن جو خوامخواہ ہی زندگی سے لگن اور محبت کو دو چند کر دیتے ہیں ۔ میں نے حسبِ وعدہ جب ساجدہ کے دروازے پر دستک دی تو وہ جیسے دروازے کے پاس ہی موجود تھی ۔ ابھی میرا دستک والا ہاتھ نیچے بھی نہیں آیا تھا کہ کنڈی کھل گئی ۔ چھوٹے شہروں میں ڈیوڑھیوں اور کشادہ صحنوں کا رواج ہے ۔ چوب کاری کے دلکش ڈیزائن والا دروازہ کھلا اور اُس نے مسکراتی آنکھوں اور ہونٹوں سے مجھے خوش آمدید کہا ۔

صحن میں اُس کی ماں اور بہنیں میرے لئے چشم براہ تھیں ۔ سب لوگ ہنستے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے خیر و عافیت پوچھتے ہوئے کمرے میں آ گئے ۔ کشادہ کمرے میں نیوی بلیو صوفے پر بیٹھتے ہوئے میں نے ایک طائرانہ نظر سے کمرے کا جائزہ لیا اور مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ گھر اوسط درجے کا نمائندہ ہے ۔

تبھی کمرے میں ایک نوجوان لڑکا داخل ہوا ۔ سفید شلوار قمیص میں جس نے نہایت مؤدبانہ انداز میں مجھے سلام کیا ۔ ساجدہ نے بتایا کہ یہ اُس کا بھائی ہے اور نشتر

میڈیکل کالج ملتان میں میڈیکل کا سٹوڈنٹ ہے۔

اس نوجوان نے پہلی نظر میں مجھے متاثر نہیں کیا۔ وہ دلکش صورت کا مالک ضرور تھا پر سنجیدگی کا جو عنصر مجھ جیسی سمجھ دار لڑکی کسی مرد میں دیکھنا چاہتی ہے وہ اس میں مفقود تھا۔

وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتا تھا پر شرماتا بھی تھا۔ میں نے اُسے قابل توجہ نہیں سمجھا۔ بس ساجدہ کی ماں بہنوں سے باتیں کرتی رہی۔ پھر یوں ہوا کہ میری تبدیلی ملتان ڈگری کالج میں ہوگئی۔ جس دن میری الوداعی پارٹی تھی ساجدہ کی آنکھیں رو رو کر سوج گئیں۔ میں نے محبت سے اُس کا سر تھپتھپایا اور کہا۔

''بے وقوف اتنے جذباتی نہیں بنتے۔ زندگی جذباتی لوگوں کے لئے روگ بنی جاتی ہے۔''

اس نے آنکھوں سے لبریز آنکھیں اوپر اٹھائیں، میری طرف دیکھا اور کہا۔

''مِس! میرا جی چاہتا ہے آپ کو اپنی بھابھی بنالوں تاکہ آپ کا اور میرا ناطہ دائمی ہو جائے۔''

کہنے کو تو میں کھلکھلا کر ہنس پڑی پر مجھے اُس کی یہ معصومانہ خواہش کچھ مضطرب کر گئی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا کہ

''پاگل ہوگئی ہو؟ بھلا ہر وہ چیز جو آدمی کو اچھی لگتی ہے آدمی اُسے اپنا نہیں سکتا۔''

ملتان آ کر بہت دنوں تک میں ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر سکی۔ مجھے شہر، اپنا کالج اور لڑکیاں یاد آتی تھیں خاص طور پر ساجدہ بتول۔

ایک شام جب رم جھم بارش برستی تھی اور شام وقت سے قبل ہی رات میں بدل گئی تھی۔ مجھے پیغام ملا کہ وزیٹنگ روم میں کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔

''کون ہے؟'' میں نے چوکیدار سے دریافت کیا۔

''بی بی جی کوئی مرد ہیں ۔نام تو نہیں بتایا بس آپ کو بلانے کا کہہ رہے تھے۔''

میں وزیٹنگ روم میں پہنچی وہاں ساجدہ کا بھائی احمد موجود تھا۔وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہوا۔اُس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ اور تکلف کے مجھے بتایا تھا کہ وہ میرے لئے چند چیزیں لایا ہے جو ساجدہ نے بھیجی ہیں۔اس وقت وہ اُس شرمیلے سے لڑکے سے بہت مختلف نظر آیا تھا جسے میں نے پہلی بار اُس کے گھر دیکھا تھا۔شاید اُس وقت وہ اپنی بہنوں کی موجودگی سے حجاب محسوس کرتا تھا۔

میں اور وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔وہ مجھ سے پوچھتا تھا کہ ہوسٹل میں رہنے کا تجربہ کیسا ہے؟

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چھ سالوں سے ہوسٹلوں میں ہی رہتی چلی آئی ہوں۔عادی ہوں اِس ماحول کی۔''

باہر بارش تیز ہوگئی تھی۔اُس نے مجھے اپنا فون نمبر اور اپنے کمرے کا نمبر بتایا اور رخصت ہوگیا۔

میں نے کمرے میں آکر ساجدہ کا بھیجا ہوا پیکٹ کھولا۔نہایت خوبصورت رنگوں کے کڑھے ہوئے کُرتے اور دستی رومال تھا اس میں۔

مجھے اُس کے وہ الفاظ یاد آئے تھے جو اُس نے مجھے دم واپسی کہے تھے۔میں نے چہرہ اُٹھایا میرے سامنے ڈائننگ ٹیبل تھی۔دفعتاً مجھے یوں لگا جیسے شیشے کے اندر ڈاکٹر احمد بیٹھتا مجھے دیکھتا ہوا رکہتا ہو آخر ساجدہ کی یہ خواہش پوری ہونے میں قباحت ہی کیا ہے؟

میری کانوں کی لویں تانبے کی طرح تپ گئی تھیں اور آنکھوں میں نشیلے خواب شام کے سایوں کی مانند اُتر آئے تھے۔پر چند لمحوں بعد میں نے اِن خیالات کو یہ کہتے ہوئے

جھٹک دیا تھا کہ بھلا میرا اُس کا کیا مقابلہ؟ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔

ابھی اِسی بات کو ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ میری دوست کا اپینڈکس کا آپریشن نشتر ہسپتال میں ہوا۔ وہ رات کو اچھی بھلی سوئی تھی۔ کوئی دو بجے درد ہوا فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے فوراً آپریشن کا فیصلہ کیا۔

کوئی دو بجے چند طلبہ کمرے میں داخل ہوئے۔ میں اس وقت فہمیدہ کے بیڈ کے پاس کھڑی تھی۔ ان طلبہ میں احمد بھی تھا۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکا۔ ایک ایک مریض کے پاس وہ آ کر رکتے۔ اس کی ہسٹری معلوم کرتے۔ ایک لائن مکمل کرنے کے بعد جب وہ مڑے دفعتاً احمد کی نگاہ اٹھی اور میری نظروں سے ٹکرا گئی۔ اُس کی آنکھوں میں شناسائی کے رنگ تو اُبھرے پر اُس نے اُنہیں کوئی کی زبان نہیں دی۔ وہ سب مریضہ کے گرد آ کر کھڑے ہو گئے۔ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ زیادہ تر سوال احمد کی جانب سے تھے۔

اُس کی آواز اور لہجے کا اعتماد دیکھ کر تو میں حیرت زدہ سی ہو گئی تھی۔ وہ ایک پراعتماد اور حد درجہ ذمہ دار لڑکا نظر آتا تھا۔ اُس کا وہ شرمیلے انداز میں باتیں کرنا مجھے اپنا واہمہ لگا اور بس یہی اُس کا انداز مجھے متاثر کر گیا تھا۔ دل ہارنے کے لئے کوئی بہت وقت درکار نہیں ہوتا۔ بسا اوقات تو پل ہی لگتا ہے۔

کوئی دو گھنٹے بعد وہ دوبارہ آیا۔ سیدھا میرے پاس آیا۔ شناسائی کے ساتھ رنگ اب اُس کی آنکھوں میں موجود تھے۔ اُس نے میٹھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجئے گا اُس وقت میں ایک ڈاکٹر تھا اور آپ ایک مریضہ کی عزیز۔ میں ڈیوٹی کے دوران کوئی ذاتی بات کرنا ٹھیک نہیں سمجھتا ہوں۔ یہ غلط ہے یا صحیح یہ میرا اصول ہے۔''

اور میں اُسے ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ کہتی کیا؟ میں بھی اصولوں سے پیار کرنے والی

لڑکی تھی۔

وہ ہر روز شام کو آتا۔ میرے پاس دو گھنٹے بیٹھتا۔ دنیا جہان کی باتیں کرتا۔ اُن دنوں وہ ہاؤس جاب کر رہا تھا۔

فہمیدہ ٹھیک ہوگئی اور ہم ہوسٹل آ گئے۔ ایک دن وہ ہوسٹل آیا پر معمول کے مطابق بیٹھنے کی بجائے اُس نے کہا۔

''آیئے کہیں باہر چلتے ہیں۔ آپ کے اس کمرے میں بہت گھٹن ہے۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ آدمی بات ہی ڈھنگ سے نہیں کر پاتا ہے۔''

میں ہچکچائی۔ اُس کے ساتھ باہر جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ اُس نے میری ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے میرے قریب آ کر دھیرے سے کہا۔

''مجھ پر اعتماد نہیں یا خود سے خوف زدہ ہیں؟''

میرا چہرہ مارے خفت اور شرمندگی کے تپ سا گیا۔ میں نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی۔

''مجھے دونوں پر اعتماد ہے۔''

وہ ہنس پڑا اور پھر بڑی موہنی سی ہنسی لبوں پر لاتے ہوئے بولا۔

''میں اتنی پیاری بات کہنے کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔''

ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چلتے باہر آ گئے۔ گرم شام ابھی بھی اپنی تمازت کا اخراج دوپہر والی شدت سے ہی کر رہی تھی۔ ہم دونوں پسینے سے شرابور تھے پر چلتے جا رہے تھے۔ ایک کشادہ پارک میں جب درختوں کے ایک جھنڈ تلے ہم نے ڈیرہ جمالیا تب اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔ آپ کا کیا

جواب ہوگا؟"

میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔میرے رخسار یقیناً اُن گلابوں کی طرح دہک رہے تھے جو ہمارے قریب ہی کیاریوں میں اُگے ہوئے تھے۔میں نے اُس کی طرف قصداً نہیں دیکھا۔بس نگاہیں جھکائے بیٹھی رہی۔

وہ ایک بار پھر بولا۔

"آپ نے کوئی جواب نہیں دیا؟"

اور جو جواب میں نے دیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے اور جب لڑکی بڑی ہو تو معاملہ ٹھیک نہیں رہتا۔

"ارے بڑی ہو تو کتنی بڑی ہو؟ کوئی سال دو سال یا تین سال کی چھوٹائی بڑائی بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے؟ایسی منفی باتوں سے اپنا ذہن پراگندہ مت کرو۔مثبت انداز میں سوچو۔اسلام کی خاتون اول بھی اپنے شوہر سے بڑی تھیں۔"

اور اِس بار میں نے کہنا ضروری سمجھا تھا۔

"احمد میرے سوچنے یا نہ سوچنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔معاملہ تمہارے گھر والوں کا ہے۔"

یہ دن میری زندگی کے حسین ترین دن تھے۔میں خوابوں میں انجانے دیسوں کی سیر کرتی۔میری آنکھیں دن میں بھی خواب دیکھنے لگی تھیں۔کوئی چاہتا ہے، پیار کرتا ہے، یہ احساس کتنا قوی تھا۔سارے شریر میں خوشی اور طمانیت کی لہریں دوڑتی رہتی تھیں۔

اور جب اُس کی ہاؤس جاب پوری ہوگئی اور وہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا کہ کل وہ اپنے شہر جا رہا ہے۔گھر جا کر سب سے پہلا مرحلہ والدین کو آمادہ کرنے کا ہے۔ان کی رضامندی کے بعد وہ فوراً مجھے خط لکھے گا۔وہ ساری باتیں مجھے جلدی جلدی بتا رہا تھا۔

میں نے زیرلب اُس کے لئے اور اپنے لئے دعا کی۔

اُس شام ہم دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ہم نے اکٹھے کھانا کھایا۔ ڈھیر ساری باتیں کیں۔دفعتاً میں نے کہا۔

''اگر تمہارے والدین آمادہ نہ ہوئے تو بتاؤ ایسی صورت میں تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟''

اُس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''یہ مت کہو اور ایسا مت سوچو۔احمد صرف اور صرف تم سے شادی کرے گا۔وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جو رسم و رواج پر خوشیاں بھینٹ چڑھا دے۔میں نے تم سے پیار کیا ہے اور میں اپنا پیار نباہوں گا۔''

میرا دل پھول کی طرح کِھل اٹھا تھا۔میں اپنے مقدر پر سرشار تھی کہ ایسا پیار کرنے والا مرد میری زندگی میں داخل ہوا۔

وہ چلا گیا۔اُس کا خیال آرمی جوائن کرنے کا تھا۔اُس کا خط مجھے پورے ڈیڑھ ماہ بعد ملا۔یہ آزاد کشمیر سے پوسٹ کیا گیا تھا۔میں انتظار کی سولی پر چڑھ کر ریزہ ریزہ ہوئی بیٹھی تھی۔بھوکی شیرنی کی طرح اُس کے خط پر جھپٹی۔کھولا اور پڑھا۔ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے نے مجھے بتایا کہ میرا رنگ پیلا پھٹک ہوگیا تھا اور ہونٹ سفید پڑ گئے تھے۔وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔

اُس کی ماں نے اعتراض کیا تھا۔اتنی پڑھی لکھی اُن کے خاندان کے لئے ٹھیک نہیں رہے گی۔احمد کے سب بہن بھائی چھوٹے ہیں اور وہ اُن کی کفالت کو ایک گراں بوجھ سمجھے گی۔

احمد نے یہ سب لکھ کر آخر میں مجھے تسلی دی تھی کہ مجھے ہرگز دل برداشتہ نہیں ہونا۔

وہ مجھے ہر قیمت پر حال کرے گا۔اولین کوشش والدین کی رضامندی کے ساتھ ہوگی ۔وگرنہ پھر دوسرا راستہ تو کھلا ہے۔پر میں بجھ گئی تھی۔میرا اندر باہر، دکھ اور یاس کی پھوار میں بھیگ گیا تھا۔میری آنکھوں سے حزن و یاس ٹپکنے لگا تھا۔میری رگ رگ میں غم لہریں مارنے لگا تھا۔

وہ رات میری روتے کٹی تھی۔صبح مجھے یوں محسوس ہوتی تھی جیسے میری آرزوؤں کے ماتم میں نڈھال ہو۔چند دن بعد میری طبیعت نے کچھ سنبھالا کھایا۔میں نے اُسے لکھا تھا کہ وہ میرے لئے ہرگز اپنے والدین سے مقابلہ آرا نہ ہو۔والدین کو دکھ پہنچانا کسی طرح ٹھیک نہیں۔اُن کا دل دُکھے گا تو مجھے بھی قلبی تکلیف ہوگی۔

پراحمد نے یہ سب باتیں گویا ایک کان سے سنیں اور دوسرے سے اُڑا دیں۔وہ محبت کی راہوں کا ثابت قدم مسافر ثابت ہوا۔وہ جب مجھ سے ملنے آیا اور میں نے اُس سے التجا کی کہ وہ میرا خیال چھوڑ دے۔اُس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا اور بولا۔

''آصفہ مجھے یقین ہے کہ تم اُن کے یہ توہمات مٹا دو گی کہ پڑھی لکھی لڑکیاں اچھی بیویاں ثابت نہیں ہوتیں۔وہ اپنے حقوق اور اپنی ذات کی بات زیادہ کرتی ہیں اور میاں کے فرائض کو پس پشت ڈال دیتی ہیں۔تم ویسا ہی کرو گی جیسا میں چاہوں گا۔''

میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔میں نے اس کے شانے پر سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔میں ایثار پسند عورت ہوں۔''

میں نہیں چاہتی تھی کہ ہنگامہ آرائی کی صورت پیدا ہو۔لیکن وہ کب مانتا تھا۔میرے گھر والوں کے اختلاف کا تو کوئی سوال نہیں تھا۔میری بوڑھی ماں میرے دم کے ساتھ زندہ تھی۔ایک بھائی تھا جو باہر کی دنیا میں گم ہو گیا تھا۔

اس نے مجھ سے نکاح کیا۔اِس نکاح میں میری ساتھی پروفیسرز شریک ہوئیں۔

مجھے ساجدہ کے شامل نہ ہونے کا قلبی دکھ تھا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ تھی پر صورت حال ایسی تھی کہ مجھے اُس کے ارمانوں کو بھی تہ تیغ کرنا پڑا۔

میں احمد کے ساتھ آزاد زکشمیر آ گئی تھی۔ یہاں آنے کے بعد میں نے اپنی ساس کو خط لکھا جس میں اُن سے التجا کی کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ میں یقیناً اُن کے لئے ایک اچھی بہو ثابت ہوں گی۔ پر مہینوں انتظار کے بعد بھی مجھے کوئی خط نہ ملا۔ ہاں البتہ ساجدہ کے خط ضرور ملے۔ لیکن اُس نے جواب دینے سے منع کر دیا تھا۔

میری زندگی خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتی تھی۔ احمد دیوانہ وار مجھ پر فدا تھا۔ لیکن عجیب سی بات تھی کہ مجھے احساس ہوتا تھا جیسے اِن خوشیوں کے گلے میں پھانس سی چبھی ہوئی ہے۔

ایک دن جو ہسپتال سے آئے تو اُن کے ہاتھ میں تار تھا۔ یہ تار اُن کے والد کی بیماری کے سلسلے میں تھا۔ احمد مجھے چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نہیں مانی۔ میرے خیال میں یہی موقع تھا کہ میں اُن کا دل جیت سکتی تھی۔

گھر پر افسردگی کی فضا طاری تھی۔ احمد کے والد ہسپتال میں داخل تھے۔ ساجدہ سے بڑی بہن کی شادی کا مسئلہ تھا لڑکے والوں نے کافی جہیز کا مطالبہ کر دیا تھا۔ اُن کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ رشتہ نہایت معقول اور اچھا تھا۔ یہ صورت حال جب مجھ پر آشکار ہوئی میں نے اپنی ساس کے پاؤں پکڑ لئے۔

''ماجدہ اور ساجدہ میری بہنیں ہیں۔ ان پر میرا بھی اتنا حق ہے جتنا احمد کا۔ ایسے نازک اور کڑے وقت میں میں جی جان سے حاضر ہوں۔ میرے پاس اپنی کمائی کا اتنا پیسا ہے کہ ماجدہ عزت و آبرو سے اپنے گھر جا سکتی ہے۔''

میری ساس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ میں نے چیک کاٹے، روپیہ آیا

اور ماجدہ گھر سے رخصت ہوئی ۔احمد کے والد ہسپتال ہی میں تھے پر ذہن سے وہ بوجھ اُتر گیا تھا جس نے اُنہیں چارپائی پر ڈال دیا تھا۔ وہ تندرست ہو کر گھر آ گئے اور میں احمد کے ساتھ جانے کی بجائے اپنی ملازمت پر آ گئی ۔میرا خیال تھا کہ اب ساجدہ کو مل جل کر دہلیز سے اٹھا دینا چاہیے۔

حقیقت ہے کہ میں نے اپنے سسرال کو اپنے خلوص اور پیار سے جیتا۔ میں نے من وتو کا فرق مٹا دیا۔دونوں لڑکوں کو بیاہا، ساجدہ کی شادی کی، ساس سُسر کو حج کروایا۔

ہم رائے اور معیار کے زاویئے انسانوں کی کسی صنف پر عائد نہیں کر سکتے ۔جس طرح پانچوں انگلیاں اپنی لمبائی، چوڑائی اور ساخت کے اعتبار سے ایک جیسی نہیں ہوتیں اسی طرح انسان بھی مختلف ہیں۔

کہانی ختم ہوگئی ۔شام رات میں بدل گئی تھی ۔سڑکوں کی روشنیاں فضا کو بہت پراسرار بنا رہی تھیں ۔جب میجر احمد اور میرے میاں آئے ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھیں ۔میجر احمد نے حیرت سے کہا۔

''ارے دو عورتوں کی موجودگی میں اتنی خاموشی۔''

جب گاڑی چل پڑی آصفہ نے میرا ہاتھ دبایا۔

''اب اپنے بارے میں کب بتاؤ گی؟''

میں ہنس پڑی تھی اُس کے کان کے قریب ہونٹوں سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی تھی۔

''بھئی تم جب چاہو سننے کے لئے آ جانا ۔جیسی کچی پکی دال پکا کر یہاں تک آئی ہوں تمہیں چکھا دوں گی۔''

☆☆☆

ریاضت

کوئی ایک برائی تھوڑی تھی اُس میں جو آدمی گنوانے بیٹھے۔ وہ تو پانچوں عیب شرعی تھا۔ جو اُس کا پسندیدہ شغل تھا۔ شراب وہ پیتا۔ دھوکا دہی اُس کا معمول تھا۔ دیگر اُلٹے کاموں میں بھی ایک نمبر یا تھا۔ گھر گھرانہ جس کا وہ تخم تاثیر تھا وہ تو ٹھیک ٹھاک تھا۔ اگر نماز روزے کا اتنا پابند نہ تھا تو اخلاقی طور پر پرد یوالیہ بھی نہ تھا۔ ماں سیدھی سادی اَن پڑھ جس نے اُس کے بچپنے کی کبھی کبھار کی اُلٹی پلٹی حرکتوں کو سنجیدگی سے دیکھا ہی نہیں۔ اب اگر وہ یہ جانتی کہ انسانی ذات کے اندر کی تہہ در تہہ پرتیں ایسی ہی غفلتوں پر اچھائی یا برائی کا رنگ پکڑتی چلی جاتی ہیں تو وہ اسے سمجھاتی بجھاتی نہ۔

لاڈلا بیٹا تھا۔ اوپر تلے کی تین بیٹیوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ جتنے بھی لاڈ پیار ہوتے کم تھے۔ پانچ سال کی عمر میں سکول داخل کروایا۔ مٹھائی کا ڈبہ باپ کے ہاتھ میں تھا اور چہرے پر زمانے بھر کا شوق۔ ماسٹر جی کی میز پر مٹھائی رکھتے ہوئے وہ بولا۔

''سرکار بڑا مہنگا پتر ہے۔ دھیان رکھنا ہے آپ نے۔ پھولوں کی طرح پالا ہے جی۔''

اور اُستاد بہت کچھ سمجھ گیا۔ ایک ایک جماعت میں وہ دو دو بار فیل ہوا۔ لٹھ کا لٹھ ہو گیا مگر میٹرک سے آگے نہ جا پایا۔ اول درجے کا شرارتی۔ کوئی لڑکا اور اُستاد اُس کی شرارتوں سے محفوظ نہ رہے۔ ہڈیاں روز کٹتیں مگر اثر نہ تھا۔

جب وہ اٹھارہ سال کا ہوا تو گھر سے غائب ہو گیا۔ ماں بیوہ ہو گئی اور باپ اور بہنیں غم سے نڈھال، ڈیوڑھی کی دہلیز پر بیٹھی صبح سے شام کرتیں مگر اُس کی صورت دکھائی نہ دی۔ پورے ڈیڑھ ماہ بعد اُس کا خط انگلینڈ سے آیا کہ میں لندن میں ٹھیک ٹھاک ہوں کوئی فکر نہ کرنا۔ ماں باپ اور گھر والوں نے اِسی پر شکر کیا کہ چلو اُس کی کوئی اطلاع تو ملی۔ یہ تو پتہ چلا زندہ ہے ورنہ پولیس تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی تھی اور وہ خود بھی نا اُمید ہو گئے تھے۔

وہ گجرانوالہ کے سڑے بسے ماحول سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں پہنچا تھا جو رنگینیوں سے لبریز تھی۔ یہ اچھا زمانہ تھا تارکین وطن پر اِتنی پابندیاں نہ تھیں۔ فیکٹریوں اور ملّوں کے دروازے ایشیا کے مزدوروں کے لئے کھلے تھے۔ وہ یہاں اپنے ایک دوست کے پاس آیا تھا جس کا چچا یہاں کا شہری تھا۔ فیکٹری میں فوراً ہی اُسے ملازمت مل گئی۔ چند دن دوست کے پاس رہا پھر ایسی جگہ چلا گیا جہاں بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی لوگ رہتے تھے۔

شروع شروع میں دبا دبا رہا۔ گھر خط اور پیسے باقاعدگی سے بھیجتا رہا۔ ایک دو ملنے والوں کے ہاتھ گھر والوں کے لئے بہت سی چیزیں بھی بھیجیں۔ پھر آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ پیسے بھیجنے بند کر دیئے اور خط بھی لکھنے کم ہو گئے۔ وہ شراب پیتا اور جوا کھیلتا۔ مگر ایک بات ضرور تھی کہ اُس نے اپنا گھر خرید لیا تھا اور اُس گھر میں ایک عورت کو بھی لے آیا تھا۔

لندن سے محمد سلیم پاکستان آیا۔ وہ گجرات کا رہنے والا تھا۔ گوجرانوالہ رُکا۔ اقبال احمد نے کچھ چیزیں اُس کے ہاتھ اپنی ماں بہنوں کے لئے بھیجی تھیں۔ ماں نے محمد سلیم کو اپنے

پاس بٹھالیا اور اُس کی تفصیل پوچھنے لگیں۔

''ماں جی! آپ اقبال کی اب شادی کر دیں۔ اُسے خط لکھیں کہ وہ وطن آئے۔ مل بھی جائے اور بیاہ بھی کر لے۔ وہاں عورت کے بغیر رہنا بہت مشکل ہے۔''

ماں جی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''تو مجھے سچ سچ بتا اُس نے وہاں کوئی بیاہ تو نہیں کیا ہوا؟''

''ارے نہیں! اِس کی آپ فکر نہ کریں۔''

اور ماں نے اُس کے لئے لڑکیاں دیکھنی شروع کر دیں۔ اپنی برادری کا ہی گھر تھا۔ لڑکی چندے آفتاب تھی ایسی خوبصورت کہ اندھیرے میں بٹھاؤ اور اُجالا ہو۔

اُسے خط لکھا گیا کہ تمہارے لئے نیک سیرت اور خوبصورت لڑکی ڈھونڈ لی گئی ہے۔ بس تم آجاؤ مل بھی جانا اور دلہن بھی لے جانا۔ اقبال اُن دنوں ذہنی طور پر پریشان تھا۔ مارگریٹ کو اُس نے معاہدے کے تحت اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا مگر وہ ایسی تیز طرار عورت تھی کہ اُس نے اقبال کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ اُس کے ہاتھوں وہ ایسا عاجز ہوا کہ مدت پور ہونے سے پہلے ہی اُسے چھوڑ دیا۔

اُسے اب عورت کی ضرورت تھی اور ماں کا خط اُس کی ضرورت کی تکمیل کر رہا تھا۔ مگر وہ پاکستان کیسے جاتا؟ اُس نے تو سب کچھ مارگریٹ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا وہ اُسے مقروض کر گئی تھی۔

پاکستان اُس نے خط لکھا کہ اُس نے پرانی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ ملازمت اختیار کی ہے۔ اُس کا آنا مشکل ہے۔ ٹیلیفون پر نکاح کر دیں۔ میں ٹکٹ اور ویزا بھیج دوں گا اور اُسے جہاز میں بٹھا کر مجھے اطلاع دے دیں۔

پچیس تیس سال قبل کا زمانہ آج سے بہت مختلف تھا۔ لڑکی کی شادی بیرون وطن

کرنے میں بڑا اگیمر تھا۔لہٰذا جب ماں نے لڑکی والوں سے بات کی تو انہوں نے رضامندی کا اظہار اور یوں اقبال احمد کی شادی فاطمہ سے ہوگئی۔کاغذات اُسے بھیجے گئے اور اُس نے ویزہ اور ہوائی ٹکٹ بھیج دیا۔

فاطمہ کو چند گھنٹوں کے لئے کراچی رکنا پڑا۔یہ اقبال کے ملنے والوں کا گھر تھا۔ خاتون خانہ نے اُس کی پیشانی پر پیار کیا اور کہا۔

''جتنی صورت حسین ہے خدا کرے بخت بھی اتنا ہی حسین ہو۔''

وہ اقبال کے لچھنوں کو جانتی تھی۔چائے پانی سے فارغ ہو کر اُس نے نئی نویلی دلہن سے کہا۔

''ایک بات یاد رکھنا بیٹی!صبر اور ایثار پتھروں کو پگھلا دیتے ہیں۔تمہارا شوہر جوا کھیلتا ہے۔اور بھی بہت سے بدعتوں کا شکار ہے۔سنو گی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ گی۔مگر صبر کا دامن تھامو گی اور جھکو گی تو ایک دن انشاءاللہ اُسے جھکا لو گی۔''

اور نئی نویلی دلہن کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس نے خاتون خانہ کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کیا آپ سچ کہتی ہیں؟میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا؟اور اُس خاتون نے فاطمہ کے شانے تھپتھپائے۔

''حوصلے سے بیٹی۔اللہ کی تائید تمہیں حاصل ہو۔''

ائیر پورٹ پر اقبال اُس کے استقبال کے لئے موجود تھا۔تصویر اُسے پہنچ گئی تھی اور اُس وقت بھی وہ اُس کی جیب میں تھی۔وہ ہراساں سی دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔کشمیری حسن کا مکمل شاہکار چاکلیٹی گرم سوٹ میں چھپنا پڑتا تھا۔اقبال کے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دوڑی تھی۔اُسے امید نہیں تھی کہ ماں اور بہنیں ایسا انمول ہیرا اُسے بھیجیں گی۔ اس وقت برفباری ہو رہی تھی اور اُس کے شانوں پر پھیلی ہوئی خوبصورت چادر پر سفیدی کی

تہہ سی جم گئی تھی ۔ ویٹنگ روم میں اقبال نے اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑا، اُس کی آنکھوں میں جھانکا ۔ چادر اُتار کر جھٹکی اور اسے دیکھتے ہوئے بولا ۔

''کہو سفر ٹھیک کٹا کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ؟''

اس نے بس دھیرے سے اتنا کہا ۔

''نہیں ۔''

اور گاڑی میں بٹھا کر وہ اُسے گھر لے آیا ۔ عورت کے بغیر مرد کا گھر جیسے ہو سکتا ہے بس یہ بھی ویسا ہی گھر تھا ۔ جگہ جگہ سگریٹوں کے ٹکڑے، گندے برتن ، جرابیں اور رومال بکھرے پڑے تھے ۔ کھانے سے پہلے اُس نے کہا ۔

''میں نے تمہیں دلہن بنے نہیں دیکھا ۔ تم عروسی جوڑا تو ساتھ لائی ہو ۔ اسے پہنو اور پوری دلہن بنو ۔ میں کھانا میز پر لگاتا ہوں ۔ پھر اکٹھے کھاتے ہیں ۔''

مگر کھانے سے پہلے اُسنے عجیب سی بات کر دی ۔ دلہن بن کر وہ جائے نماز پر کھڑی ہو گئی اور اُس نے اقبال کو بھی اپنے ساتھ کھڑا کر لیا ۔ اپنا روپہلی دوپٹہ اس کے سر پر دیتے ہوئے بولی ۔

''آؤ نا اللہ کے حضور جھک کر دعا کریں کہ ہماری نئی زندگی خوش گوار اور خوشیوں سے بھرپور رہو ۔''

اُس پر اُس کے حُسن کا سحر چھا گیا تھا یا اُس نے التجا ہی ایسے درد بھرے لہجے میں کی تھی کہ اُس نے ہاتھ بھی دعا کے لئے اٹھا دیئے اور زبان سے بھی وہ سب کچھ کہا جو وہ کہہ رہی تھی ۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے اُس سے ایک بات اور بھی کہہ دی ۔

''مجھ سے وعدہ کرو اگر تم جوئے میں اپنا سب کچھ ہار جاؤ تو خیر صلا ۔ مگر مجھے کبھی داؤ پر نہ لگانا ۔ عورت مرد کی عزت اور اُس کی غیرت ہوتی ہے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا ۔''

اور وہ ہکا بکا رہ گیا۔ چند لمحوں تک اُسے سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ کیا کہے اور کیا پوچھے؟ مگر جب وہ اپنے حواسوں میں آیا اُس نے کہا۔

''مجھے یہ بتاؤ تم نے ایسی بات کیوں کہی؟''

''جواری کا کوئی دین مذہب نہیں ہوتا نا۔ ہارتا ہے تو جھنجلا کر سب کچھ داؤ پر لگانے کو تل جاتا ہے۔ جیتتا ہے تو ساری دنیا کو اپنے قدموں میں محسوس کرتا ہے۔ میرا ایک چچا تھا وہ بھی جواری تھا۔ اُس کے گھر بھی بہت خوبصورت بیوی تھی اور وہ اُس سے پیار بھی بہت کرتا تھا۔ اُس بیوی پر اُس کے کئی دوستوں کی نظریں تھیں۔ ایک دن شراب پی کر بازی جمی۔ پہلے پیسے ہارے پھر گھر کی اشیاء اور پھر بیوی داؤ پر لگ گئی اور وہ بھی ہار گیا۔ خدا جانے سچ ہارا یا سازش سے ہرایا گیا۔ چار یار دروازے پر کھڑے ہو گئے اور اُسے روتی پیٹتی کو کھینچتے لے گئے۔''

''تمہیں مجھ سے کچھ خوف محسوس ہوا؟'' اُس نے پوچھا تھا۔

''نہیں بس میں نے اپنے آپ کو تقدیر بنانے والے کے سپرد کر دیا ہے۔''

اقبال نے بہت ٹھنڈی سانس لی اور اپنے آپ سے کہا۔

''اِسے یہ سب باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟''

پھر اُس نے سوچا۔

''یہ سچ ہے اچھائی اور برائی کی اپنی اپنی خوشبو ہے اور سفر کرتی ہے۔''

مگر چند لمحوں بعد وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا، چلو ایک لحاظ سے اچھا ہوا یہ سب پہلے سے جانتی ہے۔

دو ماہ بہت اچھی طرح کٹے۔ اُس نے لچے لفنگے یاروں کے ساتھ محفلیں نہیں سجائیں۔ وقت پر گھر آتا۔ دونوں کھانا کھاتے وہ تھوڑی سی شراب پیتا اور پھر گھومنے پھرنے

نکل جاتے ۔اُن دنوں اقبال جسم کی ایک نئی آگ میں جلنے لگا تھا۔مگر جونہی تیسرا ماہ شروع ہوا وہ اپنی پرانی ڈگر پر لوٹنے لگا۔دیر سے گھر آنے لگا تو فاطمہ نے ایک دن پوچھا۔غصے سے چیخا۔

''کتنے دن تمہارے جسم کے سحر میں کھویا رہتا؟ منہ بدمزہ ہو گیا ہے میرا۔''

اور موٹے موٹے آنسو جو آنکھوں میں اُمڈ آئے تھے اُس نے اپنی لانبی پوروں سے صاف کر ڈالے اور خاموشی سے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

دفتر سے آتا تو چار پانچ مرد ساتھ ہوتے۔کمرے میں گھس کر شراب کے دور چلتے۔جوا کھیلا جاتا اور وہ اپنے کمرے میں لاک کئے نماز پڑھتی رہتی۔آنسو آنکھوں سے بہتے جاتے۔جائے نماز کی سجدے والی جگہ بھیگ جاتی۔قرآن مجید کے اوراق گیلے ہو جاتے اور جب وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُس کے حضور دعا مانگتی تو اس کے جسم کی ایک ایک رگ، ایک ایک مُو، ایک ایک حصہ اس آیت کو دہراتا۔

''بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اُس نے دونوں ہونٹوں کو سی لیا تھا۔وہ تو اِس بات پر ہی اللہ کا شکر ادا کرتی تھی کہ وہ اسے اپنے لچے لفنگے یاروں کی ساقی گیری کے لئے نہیں بلاتا ورنہ اُس سے تو کسی بھی اچھائی کی توقع فضول تھی۔

اور ایک رات ایسا ہوا۔وہ بری طرح ہارا اور اس ہار کا سارا نزلہ اُس پر گرا۔وہ سو رہی تھی جب اُس نے ایک جھٹکے سے اُسے بازو سے کھینچ کر قالین پر گرا لیا۔

''تیری نحوست نے مجھے دو کوڑی کر دیا ہے۔نکل جا میرے گھر سے ابھی اسی وقت چلی جا۔میں یہ تیری خوبصورت شکل قطعی نہیں دیکھنا چاہتا۔''

اور اُس نے اُسے دھکا دے کر گھر سے نکال دیا اور گھر اندر سے لاک کر لیا۔

ساتھ کا کامیج ایک پاکستانی فیملی کا تھا۔مسز رضیہ سلیمان مخلص اور مہربان سی عورت تھی۔یہ بھی خدا کا احسان تھا کہ اُس کا شوہر کسی نجی کام سے نیویارک گیا ہوا تھا۔اُس نے دستک دی، بیل بجائی اور جب دروازہ کھلا، مسز سلیمان اُسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔باہر قیامت کی سردی تھی اور وہ معمولی سے کپڑوں میں کھڑی تھی۔اندر آ کر اس نے جب مختصراً اُسے بتایا تو مسز سلیمان نے کہا وہ پولیس کو فون کرتی ہے۔مگر فاطمہ نے اُس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔

''نہیں میری بہن وہ سرکشی پر اُتر آئے گا۔''

''آخر ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟ تین ماہ بعد ایک بچہ اس دنیا میں آنے والا ہے اُس پر کیا اثر پڑے گا؟''

''صبر کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔مجھے اُمید ہے کہ ضرور لوٹے گا۔وہ اپنے طرزِ عمل پر پشیمان ہوگا اور اپنا چلن بدلے گا۔''

''اور میں بھی تمہیں یہ بتا دینا چاہتی ہوں۔'' مسز سلیمان غصے سے بولی کہ

''تم اُس کی اصلاح کی جن موہوم اُمیدوں پر زندہ ہو وہ کبھی پوری نہیں ہوں گی۔''

''رب اتنا تہی دامن نہیں کہ اتنی سی آرزو پوری نہ کر سکے۔''

فاطمہ کو گرم دودھ پلا کر مسز سلیمان نے آرام کے لئے لٹا دیا۔صبح سویرے وہ جاگ گئی اور بہت خاموشی سے اپنے گھر آ گئی۔اقبال نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ہار اور شراب دونوں کے اثرات زائل ہو گئے تھے۔وہ شرمسار نظر آتا تھا۔کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اُس نے فاطمہ سے معافی مانگی اور فاطمہ نے کپ میں کافی بناتے ہوئے افسردگی سے بس اتنا کہا۔

''وقت کم ہے۔ناشتہ کیجئے۔''

ایسی معافیاں آئے دن کا معمول تھیں۔ وہ صبح معافی مانگتا اور رات کو وحشی بن جاتا۔ تین ماہ بعد ولادت ہوئی بہت ہی خوبصورت اور من موہنی بچی نے جنم لیا تھا۔ وہ تو معلوم نہیں کہاں تھا؟ مسز سلیمان ہی اُسے لے کر ہسپتال رہیں۔ انہوں نے ہی اُسے سنبھالا۔ چوتھے دن جب منہ پھلائے آیا۔ اُسے غصہ تھا کہ لڑکی کیوں پیدا ہوئی ہے؟ لڑکا ہونا چاہیے تھا۔ اپنی اس ناراضگی کا اظہار بھی اُس نے کیا۔ وہ چپ چاپ بیڈ پر لیٹی اسے دیکھتی اور اس کے غصے کو پیتی رہی۔ اِس پر وہ بھڑکا۔

''میسنی کہیں کی! گونگے کا گڑ کھائے رہتی ہو۔ میں تو کہتا ہوں بھونکا چلے جاتا ہوں۔''

اور اُس نے آہستگی سے کہا۔

''گھبراتے کیوں ہیں؟ پروردگار بیٹا بھی دے گا۔''

وہ اس بات پر حیران ہوتا تھا کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ اُسے غصہ نہیں آتا۔ ایک دن اُس نے طنزیہ کہا بھی۔

''تمہارا خمیر کسی بہت ہی ٹھنڈی مٹی سے اٹھا ہوا لگتا ہے۔''

اور پہلی بار اُس نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔

''مصلحتیں اگر انسانی ہونٹوں پر تالے لگا دیتی ہیں تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان میں بنیادی جذبات کا فقدان ہے۔ ہر انسان اپنے اندر انا رکھتا ہے۔ بس فرق اگر ہے تو ماحول کا۔ میں تمہارے اِس جہنم سے نکل کر کسی اور جہنم میں نہیں گرنا چاہتی۔ رہا ماں باپ کا گھر تو اُس کے دروازے بھی اپنے گھروں میں سکھی بیٹیوں کی ہی پذیرائی کرتے ہیں اور میں اپنے سکھی ہونے کا بھرم نہیں کھونا چاہتی۔''

اقبال حیران تھا میٹرک پڑھی ہوئی اس عورت نے کیسی گہری بات کی ہے؟

بیٹا بھی آ گیا تھا۔زندگی کی گاڑی بس دھکا سٹارٹ کی سی کیفیت میں تھی۔اب دو تبدیلیاں اور آئی تھیں۔اقبال عورتوں کو بھی لانے لگا تھا۔شراب پی کر وہ غل غپاڑہ مچاتے۔ وہ بلی کے بچے کی طرح اپنے کمرے میں سہمی سہمی پھرتی۔اُسے ڈر لگتا تھا کہ بیٹی جاگ گئی تو پوچھے گی کہ یہ سب کیا ہے؟ اور شاید یہ ممتا تھی کہ وہ اُس سے اُلجھنے لگی تھی کہ ایسی بے ہودہ حرکتیں اُس چھت تلے نہیں ہونی چاہئیں جہاں اُس کے بچے رہتے ہیں۔وہ تو اپنے بچوں کو ایسے نیک اور صالح بچوں کی صورت میں پروان چڑھانا چاہتی تھی جن پر قوم اور انسانیت فخر کر سکے۔

مسز سلیمان اب بھی اکثر کہتیں کہ وہ اُسے چھوڑ دے۔اُس کے لبوں پر اُداس سی مسکراہٹ بکھر جاتی۔

''نوشہ تقدیر تو سامنے آ گیا ہے۔جو کچھ ملنا تھا مل گیا ہے۔بس اب تو میری دعائیں اور صبر ہے جو شاید میری قسمت کے دھارے کو بدل دے۔''

''بس تو پھر بیٹھی رہو اور اُس کے ظلم کی چکی میں پستی رہو۔تمہارے ہی جیسی عورتوں نے مرد کو بگاڑا ہوا ہے۔''

اُس کے لبوں پر مجروح سی ہنسی بکھری۔اُس شب بہت غل غپاڑہ مچا۔چار لفنگی قسم کی عورتیں اور تین مرد کمرے میں آئے۔کمرے میں شراب کا دور چلا۔اُنہوں نے اتنی پی کہ مدہوشی میں سارے گھر میں دندناتے پھرے۔دو مردوں نے اُس کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ چلاتے چلے جاتے تھے کہ اُسے کھولے۔وہ سینے پر ہاتھ رکھی اُن کی اول جلول بکواس سنتی اور ہول کھاتی رہی۔پھر سجدے میں گری اور اِس شدت سے بلبلا کر روئی کہ بے سُدھ ہو گئی۔صبح جب اُس کی آنکھ کھلی اور وہ لاؤنج میں آئی۔چیزیں یوں بکھری پڑی تھیں کہ جیسے کسی قافلے نے پڑاؤ ڈالا ہو اور صبح دم کوچ کر گیا ہو۔اقبال صوفے پر آڑا ترچھا سو رہا تھا اور وہ سب

غائب پڑی تھیں کہ جیسے کسی قافلے نے پڑاؤ ڈالا ہو اور صبح دم کوچ کر گیا ہو۔ اقبال صوفے پر آڑا ترچھا سو رہا تھا اور وہ سب غائب تھے۔

اُس نے ناشتہ بنایا۔ بچوں کو تیار کیا۔ اُنہیں سکول بھیجا۔ اقبال کو جگایا اور پوچھا کہ وہ ناشتہ کیا کرے گا؟

جب وہ ناشتے کی میز پر آیا۔ فاطمہ نے کہا۔

''دیکھو میرے صبر کو اتنا مت آزماؤ کہ میں انتقامی کاروائی پر اتر آؤں۔ میں رنڈی نہیں۔ کون تھے وہ بدمعاش جو رات کو میرا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے۔''

اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا پر اُس کی زبان بولنے سے قاصر رہی۔

پھر ایک معجزہ ہوا۔ وہ اُس دن وقت پر گھر آیا۔ اُس نے رات کا کھانا بچوں کے ساتھ کھایا۔ بیٹھ کر اُن کے ساتھ ٹی وی دیکھا اور جب وہ بچوں کو سلانے کے لئے اُٹھی۔ وہ اس کے ساتھ اُٹھا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات بکھرے ہوئے تھے۔ اُس نے شرمندہ شرمندہ لہجے میں کہا۔

''مجھے بھی نماز پڑھاؤ۔''

پھر وہ سجدے میں گری تو جو آنسو آج اس کی آنکھوں سے بہے وہ خوشی اور تشکر کے تھے اور جب اُس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو وہ بولا۔

''میرے لئے دعا کرو کہ خدا مجھے سیدھا راستہ دکھائے۔''

اور خدا نے اُسے سیدھا راستہ دکھایا بھی اور اُس پر چلنے کی توفیق بھی دی۔

دن بدن اُس میں انقلاب آتا گیا۔ اُس نے نماز شروع کی۔ شراب نہ ملنے پر جسم ٹوٹتا تو وہ مشقت والے کاموں میں جت گیا کہ توجہ بٹ جائے۔ ایسٹ اینڈ کی مسجد میں جمعہ کے روز جاتا اور نماز کے بعد دیر تک دعا مانگتا۔ دوستوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ گھر خوشی

اور سکون کا گہوارہ بن گیا تھا۔ بچے بہت ذہین و لائق نکلے۔ سکول کے زمانے میں بیٹی نے تین بار ملکہ الزبتھ سے انعام لیا۔ کیمبرج سے بار ایٹ لاء کیا۔ بیٹا انجینئر بنا۔ دونوں بچے لندن جیسے ماحول میں رہتے ہوئے بھی اپنی مذہبی اقدار کے پابند رہے۔ مسز سلیمان کبھی کبھی ہنستے ہوئے کہتیں۔

''تمہارے صبر، تمہارے ایثار اور تمہاری عظمت کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

اور فاطمہ کے لبوں پر بڑی میٹھی میٹھی سی مسکراہٹ بکھر جاتی۔

''آپ کو یقین نہیں تھا مسٹر سلیمان اور اصل آج کی پڑھی لکھی جدید عورت بہت بے صبری واقع ہوئی ہے۔ وہ مرد سے مساوی حقوق کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ جھکنا نہیں جھکانا چاہتی ہے۔ اِس غیر فطری خواہش کے نتیجے میں تناؤ بڑھ جاتا ہے۔ وہ ٹوٹے ہوئے گھر اور مضطرب بچے قوم کو دیتی ہے۔

مسز سلیمان! عورت تو گھر سے باہر بھی خطرات کی سولیوں پر لٹکی رہتی ہے۔ میں گھر کی سولی پر چڑھی اور مصلوب ہونے کی بجائے فتح یاب ہوئی۔ میرے صبر نے ایک انسان کی زندگی کے چلن کو بدلا اور آج وہ سینکڑوں لوگوں کے چلن بدلنے میں مصروف ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔'' مسز سلیمان مسکرا کر کھڑی ہو جاتی۔ پاؤں کی ایڑیوں کو جوڑتی اور کھٹ سے سیلوٹ مارتی اور ہنستے ہوئے کہتی۔

''تمہیں سلام! تمہارے روشن کردار اور تمہاری پاکیزہ سوچوں کو سلام۔ تم مثال ہو آج کی عورت کے لئے۔''

☆☆☆

ٹوٹی کہانی کمند

وہ ہم دونوں کی مشترکہ دوست تھی۔ چٹا گانگ ہل ٹریکس کے ساحلی علاقے رانگا متی کی منزہ جس کی چنبیلیوں جیسے خدوخال والے چہرے پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ تیرتی رہتی تھی۔

اُس نے کہا شہزادی۔

''میں تمہیں اِس شان سے بیاہنے آؤں گا کہ دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔''

اُس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹا اور گفتگو کو جاری رکھا۔

اُس کا کہا حرف بہ حرف سچا ہوا۔ وہ اِس شان وشوکت سے آیا کہ عزیز، رشتہ دار، میل ملاقاتی، اڑوس پڑوس سبھی حیران رہ گئے۔ سچ مچ وہ شکل وصورت کی ہی نہیں قسمت کی بھی شہزادی نکلی۔

تم یقین کرو گی؟ اُس نے اپنی تکونی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑیں۔ بارات کی

شان وشوکت کا وہ عالم کہ کاروں سے اُس کی لمبی چوڑی گلی بھری ہوئی تھی۔ بڑی کے جوڑے ایک سے ایک بڑھ کر تھے۔ ثمینہ ساڑھی میں اتراتی پھر رہی تھی۔

''بھئی شہزادی سے دوستی نند بھاوج کے رشتے میں بدل کر اپنا بھرم رکھ لے۔''

میں نے بے اختیار کہا۔

منزہ کا باپ ایک مدت سے پنجاب میں رہ رہا تھا۔ سارے بچے یہیں پیدا ہوئے اور یہیں بڑھے پلے۔ منزہ گھر میں بنگالی بولتی تھی مگر اُس کے بہن بھائیوں کا پڑھنا لکھنا اُردو کے ساتھ ساتھ اُن کی روزمرہ بول چال میں پنجابی زبان کا استعمال بھی تھا۔ شہزادی منزہ کی گہری دوست تھی۔ میری بھی اُس سے شناسائی تھی مگر اِس حد تک نہیں کہ اُسے دوستی کا نام دیا جا سکتا۔ منزہ ہمسائی ہونے کے ساتھ اچھی دوست بھی تھی۔

وہ دونوں بہنیں سارے سکول میں منفرد نظر آتیں۔ شکلوں سے ماں جائیاں ہرگز نہیں لگتی تھیں۔ ایک ہی کلاس میں تھیں۔ ایک ہی بینچ پر بیٹھتیں۔ تفریح کے دوران بانہوں میں بانہیں ڈال کر کوریڈورز میں گھومتیں۔ دونوں ایک دوسرے میں اِتنی گم تھیں کہ کسی تیسرے کی انہیں ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔

اور پھر ایک تیسری لڑکی اُن میں شامل ہوئی۔ انتہائی حسین وجمیل شہزادیوں جیسا بانکپن اور تمکنت لئے۔ نام کی بھی شہزادی تھی۔

مِس منگت رائے کلاس کو ریاضی پڑھا رہی تھیں۔ جب وہ مائی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ تختہ سیاہ پر مس منگت رائے کا تیزی سے چلتا ہاتھ رکا۔ بڑی گہری نظر سے انہوں نے اُسے دیکھا جو بڑی گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اُسے اپنے پاس بٹھانے کے لئے سبھی لڑکیاں کوشاں تھیں مگر منزہ اِس میں کامیاب ہوئی۔ پندرہ بیس منٹ پیریڈ ختم ہونے باقی تھے اور اس مختصر سے وقفے میں وہ اُس سے کئی سوال پوچھ چکی تھی۔

گھنٹی بجی، اُس نے کمرے سے باہر قدم رکھا اور دونوں بہنیں جھپٹ کر اُس کے پاس آئیں۔ اپنے پاس بٹھانے کے لئے اُنہوں نے بہتیرا زور مارا مگر وہ نہ مانی ہی نہیں۔ دونوں مایوس ہو کر لوٹ آئیں تو تہینہ نے ثمینہ سے کہا۔

''بڑی بد دماغ لگتی ہے۔ دفع کرو۔''

پر ثمینہ کو وہ بے حد پسند آ گئی اور پھر دوستی کر کے چھوڑی۔ ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش میں پتہ چلا کہ دونوں ایک ہی برادری سے تعلق رکھتی ہیں۔ مزید کریدا گیا تو حسب ونسب کی کوئی کڑی بہت آگے جا کر ایک ہو جاتی تھی۔

اُن کے گھروں کے درمیان ایک محلّہ حائل تھا۔ شہزادی اپنے ننہال میں رہتی تھی۔ وہیں سے ایک مڈل سکول سے وظیفے کا امتحان پاس کر کے آئی تھی۔

ایک تپتی دوپہر میں جب وہ منزہ اور تہینہ ثمینہ پسینے میں نہائی سکول سے گھروں کو جا رہی تھیں۔ ثمینہ کے گھر کے سامنے رک کر شہزادی نے خدا حافظ کہنا چاہا۔ جب تہینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

''امی جان نے پسندے پکائے ہاں۔ کھا کر شام ڈھلے جانا۔''

''نہیں امی خفا ہوں گی۔'' شہزادی نے عذر پیش کیا۔

''ارے چھوڑو وقار بتا آئے گا کہ تم ہمارے ہاں ہو۔'' ثمینہ بولی۔

پسندے کھانے کی دعوت اُنہوں نے منزہ کو بھی دی مگر دونوں دعوتوں کے انداز میں فرق تھا۔ منزہ شکریہ کہتے ہوئے راہ لگی اور شہزادی اُن کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔

اب اگر اُسے یہ معلوم ہو جاتا کہ گھر کے ہال کمرے میں آرام دہ کرسی پر نیم دراز خیبر میڈیکل کالج کے سال سوم کا طالب علم وقار احمد جو ثمینہ تہینہ کا لاڈلا بھائی بھی موجود ہے تو وہ اپنے رخساروں پر گھومتی پھرتی بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑس لیتی اور دوپٹے کے

پلو سے چہرے پر جمی دن بھر کی گرد کو صاف ہی کر لیتی۔

وہ اُجالے سے اندھیرے میں آئی تھی۔تھوڑی دیر تک پتہ ہی نہ چلا۔ثمینہ تمہینہ بھیا! آپ کب آئے؟ کہتے ہوئے اُس سے لپٹ گئیں۔وہ ہونقوں کی طرح دادی اماں کی چارپائی کے پاس کھڑی تھی۔جب اُس نے سنا۔

''بھئی اِس ذات شریف کا تعارف نہیں کراؤ گی؟''

اور اُس کا تعارف ہوا۔اُس نے دیکھا۔اُس کا قد درمیانہ سا تھا۔گندمی رنگت پر آنکھیں اتنی موٹی تھیں کہ اچھا تاثر نہیں دیتی تھیں۔

اُسی کمرے میں دسترخوان بچھا جہاں سب گھر والوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔اتنی شدید بھوک تھی مگر ساری بھوک ختم ہوگئی تھی بس لقمے ہی توڑتی رہی۔

شام کی چائے پینے سے جب اُس نے انکار کیا تو وہ دادی اماں کے پاس بیٹھا تھا فوراً بولا۔

''ڈرتی ہو چائے پینے سے کالی ہو جاؤ گی۔''

اُس نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔اِتنی سی بات پر اُس کا چہرہ تانبے کی طرح تپنے لگا تھا۔نچلے متوسط گھرانے کی پروردہ لڑکی جو اوپر تلے کی چار بہنوں کے بعد وارد ہوئی تھی توجہ اور اہمیت سے کافی حد تک محروم تھی۔

دو کالی موٹی آنکھوں نے اُسے دلچسپی اور انتہائی رغبت سے دیکھا تھا اور گفتگو میں اُس کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔گھر لوٹتے وقت اُس پر ہلکا سا خمار تھا۔پر یہ خمار جلدی ہی ٹوٹ گیا تھا۔جب دہلیز پر قدم رکھتے ہی اماں کی لتاڑ نے اُس کا استقبال کیا اور جب وہ چھوٹی میز پر کتابیں رکھ رہی تھی۔ماں کی آواز اُس وقت تک سارے گھر میں گونج رہی تھی۔

''یہ چونچلے میرے گھر میں نہیں چل سکتے۔سکول پڑھنے کے لئے جاتی ہو

دوستیاں پالنے کے لئے نہیں۔''

اُس دن کے بعد اُس کا دل کئی بار چاہا۔ دونوں بہنوں نے اصرار بھی کیا۔ مگر ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کا خوف جانے کی راہ میں حائل رہا۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ اُس کی بڑی بہن کا رشتہ اچانک طے پا گیا۔ عرصے سے اُس کی شادی کے لئے کوشش ہو رہی تھی مگر کہیں بات نہیں بن رہی تھی۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات ہوئی۔ برادری کے ناطے اُس کے پورے خاندان کو دعوت دی گئی۔ تیل مہندی پر آنے کے لئے بھی اصرار ہوا۔

پورا خاندان آیا۔ مہندی والی رات کا ہنگامہ سرد ہوا تو شہزادی کے باپ نے اُس کی ماں کے پاس بیٹھ کر ثمینہ کے ڈاکٹر بھائی کی تعریف کی۔

''ایسا نیک اور صالح بیٹا سردار بیگم میں بتا نہیں سکتا۔'' وہ مخاطب ہوئے۔

''دوسرے لوگوں کی طرح کرسی پر ڈٹ کر بیٹھنے کی بجائے اُس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کام بتایئے کہ میں آپ کا ہاتھ بٹا سکوں۔ میرا جی نہال ہو گیا۔ جو کچھ کرنے کے لئے میں نے اُسے کہا اُس نے پوری ذمہ داری سے کیا۔''

اُس وقت وہ بھی وہیں قریب بیٹھی سب سن رہی تھی۔ پانچ بہنوں کے بعد دو چھوٹے بھائی تھے جو کسی بھی اہم کام میں باپ کا ہاتھ نہیں بٹا سکتے تھے۔ ماں اور باپ کو اکثر ہی اِس بات کا دکھ رہتا کہ بڑا بیٹا ہوتا تو اُن کے گھریلو حالات یقیناً مختلف ہوتے۔ مہندی اور بارات کے دن وہ بہت مصروف رہا۔ مختلف کاموں کے سلسلے میں اُس کا اندر آنا بھی ہوا۔ شہزادی نیلے رنگ کے کپڑوں میں کوئی خوبصورت جل پری لگ رہی تھی کہ ایک بار جب اُس کا ٹکراؤ ہوا تو اُس نے بے اختیار ہی اُس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

''تم بھلا یہاں کیا کر رہی ہو؟ آؤ تمہیں کسی جھیل پر چھوڑ آؤں۔ جل پری تو نظر آؤ

گی۔"

وہ شادی کی گہما گہمی میں اُلجھی ضرور رہی مگر اُس کا دماغ غیر حاضر رہا۔کوئی میٹھے میٹھے انداز میں اُس سے بار بار سرگوشیاں کرتا رہا۔

"آؤ تمہیں تو کسی جھیل پر چھوڑ آؤں جل پری تو نظر آؤ گی۔"

دونوں محبت کر بیٹھے تھے۔ثمینہ اُس کی راز دار تھی۔اُن کے ساتھ ساتھ وہ بھی بھول گئی تھی کہ احسن بچپن سے ہی پھوپھی زاد سے منسوب ہے۔لڑا کا پھوپھی کی بیٹی ثمینہ کو پسند نہیں آئی تھی۔شاید شہزادی کو بھائی سے قریب کرنے میں اسی ناپسندیدگی کا جذبہ کارفرما تھا۔

ایسے ہی سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی شام کو جب وہ شہزادی کو اُس کے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔اُس نے راستے میں شادی کے متعلق اُس کی رائے دریافت کی اور جان کر احسن کو دکھ ہوا کہ وہ نا اُمیدسی ہے۔یاس بھرے اُس کے لہجے کو محسوس کیا اور بولا۔

"تو اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟"

"یہ بات نہیں۔خود سوچو مالی لحاظ سے تم لوگوں کی پوزیشن ہمارے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔تم لائق ہو، رشتہ دار تمہیں بھلا کب چھوڑیں گے؟" اُس نے صاف گوئی سے کام لیا۔بے وقوف کہتے ہوئے اُس نے اُس کے سر پر چپت لگائی۔

وہ اُس وقت گلی سے گزر رہے تھے جہاں کافی روشنی تھی۔ذرا تاریکی والے حصے میں آئے تو اُس نے بات آگے بڑھائی۔

"سنو! میں تمہیں اپنا کر اپنی زندگی روشنی سے بھرنا چاہتا ہوں۔اندھیرے مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

شہزادی اُس کا مطلب سمجھی۔اُس کی پھوپھی زاد کی رنگت سانولی تھی۔

وہ گھر آئے ۔وہ اُس کی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔شہزادی کی خالہ سیالکوٹ سے آئی تھی اور وہاں ہونے والی کسی شادی کی شان وشوکت کے بارے میں ماں کو بتا رہی تھی ۔وہ چپ بیٹھا سنتا رہا۔چائے کا کپ پی کر اُٹھنے لگا تو باہر کی سمت کھلنے والے دروازے کی بجائے ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف بڑھا۔شہزادی وہیں نل کے پاس بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔وہ گھٹنوں کے بل جھکا اور مدھم مگر پیار بھری آواز میں بولا۔

''میں تمہیں اِس شان سے بیاہنے آؤں گا کہ دنیا دیکھے گی۔''

میڈیکل کے فائنل ائیر سے فارغ ہو کر اُس نے گھر میں اپنی پسند کا اعلان کیا۔ تہلکہ مچنے والی بات نہ تھی۔اُس کی ماں کی نند سے ساری عمر نہیں بنی تھی۔دونوں لڑکیاں بھی شہزادی کے حق میں تھیں۔رہا باپ اور چھوٹا بھائی اُنہوں نے زور دیا مگر شنوائی نہ ہوئی۔

منزہ اُس کے مقدر پر رشک کرتی کبھی کی جا چکی تھی۔خالی چائے کی پیالی پر مکھیاں بھن بھن کرتی پھر رہی تھیں۔میں نے اُسے اٹھایا اور باورچی خانے میں چلی آئی۔

شب عروسی کو اُس نے اُس کا زرتار گھونگھٹ اٹھایا۔چودھویں کے چاند کی طرح دمکتا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھاما اور جذبات سے بوجھل آواز میں بولا۔

''میں خوش نصیب ہوں کہ تمہیں چاہا اور پالیا۔وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ میری وفادار رہو گی۔''

اِس جملے پر شہزادی نے سٹپٹا کر آنکھیں کھولیں اور قدرے حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

''کیا میری محبت پر تمہیں بھروسہ نہیں؟''

احسن ''دوہا'' میں ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ایک ماہ کی چھٹی پر وطن آیا تھا۔ فریقین کے درمیان پہلی تلخی اُس وقت پیدا ہوئی جب شہزادی جانے کے لئے تیاریوں میں

مصروف تھی۔ ساس نے اُس کی دونوں کلائیوں میں پڑی چوبیس چوڑیوں کو بغور دیکھا اور کہا۔

''اِن سب کو اتار کر مجھے دے دو۔ تم عرب کی ایک ایسی ریاست میں جا رہی ہو جہاں سونا بہت سستا ہے۔ نیا زیور بنالینا۔''

تیزی سے کام کرتے اُس کے ہاتھ رک گئے۔ بے یقینی سے اُس نے ساس کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولی۔

''مگر امی جان وہاں احسن کے بہت سے ملنے والے ہوں گے اُسکی ننگی بُچی دلہن دیکھ کر کیا کہیں گے؟ یوں بھی جاتے ہی زیور کپڑا بنانا کچھ اچھا نہیں لگے گا۔''

احسن نے بھی دبے لفظوں میں ماں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اُن کی ایک نہ چلی۔ تنہائی میں احسن نے اُس کے مغموم چہرے کو دیکھا اور کہا۔

''تم گھبراؤ نہیں میں تمہیں سر سے پاؤں تک سونے میں لاد دوں گا۔''

مغموم سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر بکھر گئی۔ شوہر کے سینے پر سر رکھتے ہوئے وہ بولی۔

''کیسی باتیں کرتے ہو؟ تمہارے ہوتے ہوئے بھی مجھے بھلا کسی زیور کی ضرورت ہے؟'' اور پھر وہ دوہا چلی گئی۔

ایک شام جب وہ یونیورسٹی سے تھکی تھکائی آ کر بستر پر لیٹی ہی تھی کہ منزہ آ گئی۔ شہزادی نے اُسے خط لکھا تھا جسے وہ میرے پاس لائی تھی۔ میں نے اشتیاق سے پڑھنا شروع کیا۔

میرا خیال ہے منزہ کسی بڑی شبھ اور بابرکت گھڑی میں مجھے میری اماں نے جنا ہوگا۔ بنانے والے نے میری قسمت پر خاص توجہ دی ہوگی جبھی تو اِس پرتعیش ماحول میں اپنے

آپ کو کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہوں۔ میں نے کہاں اِن آسائشوں کا تصور کیا تھا جو مجھے یہاں بڑے آرام سے مل گئی ہیں۔ میرا فلیٹ اتنا خوبصورت اور آراستہ پیراستہ ہے کہ اِس پر کسی محل کا گمان ہوتا ہے۔ دبیز قالینوں پر چلتی ہوں تو میرے پاؤں کبھی کبھی ڈگمگا جاتے ہیں۔ یہاں نوکروں کی بہت تنگی ہے مگر احسن نے پھر بھی میرے لئے ایک نوکر کا بندوبست کر دیا ہے۔ میری طبیعت آج کل بہت خراب رہتی ہے۔ شادی کے بعد طبیعت خراب ہونے کا مطلب تمہیں سمجھ آ ہی گیا ہوگا۔

احسن میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں اگر صبح سو رہی ہوں تو مجھے کبھی نہیں جگاتے۔ احسن کے دوست میری خوبصورتی، سلیقے اور خوش پوشاکی سے بہت متاثر ہیں۔ سب لوگ احسن کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ رشک تو میرے مقدر پر کرنا چاہیے جو ایسا شاندار نکلا۔

اُس نے کسی پاکستان آنے والے کے ہاتھ منزہ کے لئے ساڑھی اور پرفیوم بھیجے۔ ساڑھی کا کپڑا ایسا نفیس تھا کہ میں بہت دیر تک اُس پر ہاتھ پھیرتے ہوئی اُس کی نفاست کو سراہتی رہی۔

پھر پتہ چلا کہ اُس کے ہاں بیٹے نے جنم لیا۔ وہی ساس نندیں جو کبھی اُس پر واری صدقے ہوتی تھیں اُس میں سو سو کیڑے نکالنے لگی تھیں۔ وہ ہاں میں اُن کے کئی عزیز رہتے تھے جو اکثر پاکستان کا چکر لگاتے رہتے۔ اُن سے انہیں پتہ چلا کہ وہ بڑے ٹھاٹھ بھاٹ سے رہتی ہے۔ ائیر کنڈیشن گاڑی میں سیر کے لئے جاتی ہے۔ ہوائی جہازوں میں سفر کرتی ہے۔ ایسی خوبصورت نکلی ہے کہ جدھر سے گزرتی ہے لوگ اُسے دیکھتے ہوئے اپنا راستہ بھول جاتے ہیں۔

اور یہی باتیں اُن کے لئے تکلیف دہ تھیں۔ بچے کی ولادت میں کچھ پیچیدگی تھی۔

پاکستان میں آنے کے بجائے ڈیلیوری کے لئے انگلینڈ چلی گئی۔ ساس نندوں نے حشر کر ڈالا۔ جگہ جگہ گھر گھر اُسے بدنام کیا۔ برتن چھوٹا تھا کھانا زیادہ پڑ گیا۔ کیا کرتی بیچاری؟ اپنی اوقات کلو کوئی یاد رکھتا ہے۔

ٹھیک ہو کر وہ وطن آئی۔ بھاری بھاری اٹیچی کیس کپڑوں اور چیزوں سے ٹھنسے پڑے تھے۔ اُس نے ساس نندوں کے سامنے رکھ دیئے۔ سوغات کے طور پر بھی اس نے اپنے والدین اور بھائی بہنوں کو ایک گز کپڑا نہ دیا۔ کسی نے پوچھا تو کہنے لگی۔

''تم جانتی ہو۔ سکھاوت پتھروں کو بھی پھاڑ دیتی ہے۔ یہ تو پھر انسان ہیں۔ اپنی طرف سے میں انہیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتی۔''

وہ ایک ماہ رہی۔ جلی کٹی سنتی رہی۔ اپنا خون پیتی رہی۔ ضبط کرتی چہرے پر مسکراہٹ سجائے، ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ پھر ایک دن واپس دوبا چلی گئی۔

منزہ کے ایک خط کے جواب میں اُس نے لکھا۔

''تمہیں غصہ آتا ہے مجھ پر کہ میں اُن کے اعتراضات شربت کے گھونٹ سمجھ کر کیوں پی جاتی ہوں؟ اور اپنی مدافعت میں بولنے کی بجائے لبوں کو سیئے رکھتی ہوں۔ میری جان تمہارا غصہ بجا مگر سوچو تو احسن نے مجھے اِتنے سکھ دیئے ہیں کہ اُن کے سامنے خاموش رہ کر انہیں تھوڑی دیر کے لئے خوش رکھنا کوئی بڑی قربانی نہیں۔ وہ بھی تھوڑے بہت وقت کے لئے۔''

پھر میں انگلینڈ چلی گئی اور مجھے شہزادی کے متعلق کوئی خبر سننے کو نہ ملی۔

پکاڈلی کے ٹیوب سٹیشن میں مجھے ایک خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا جو ہندوستانی تھی۔ بڑا ملیح چہرہ تھا۔ جنوبی ہند کے کسی علاقے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں تو پاکستانی جان کر

اُس کی طرف بڑھی تھی۔ باتیں ہوئیں تو پتہ چلا کہ اُس نے دوہا میں کافی وقت گزارا ہے۔ دوہا کا سن کر ممکن ہی نہ تھا کہ میں شہزادی سے متعلق کوئی بات نہ پوچھوں۔ اُس نام سن کر وہ چونکی۔ وہ شہزادی ناں جس کی شخصیت میں بڑا گلیمر تھا۔ بڑی بانکی سجیلی نازنین۔ سارا دوہا اُس کے حُسن کا دیوانہ تھا۔ جس تقریب میں چلی جاتی وہی مہک اُٹھتی۔

''ہاں ہاں وہی۔'' میں ہلکے سے مسکرادی۔

قدرت نے جتنا روپ دیا تھا مقدر اُتنا ہی کھوٹا کر دیا۔ اُس کے شوہر کو کینسر ہوگیا تھا اور دس ماہ بیمار رہ کر وفات پا گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اِردگرد جگمگاتی روشنیاں بجھ گئی ہیں اور ہر سو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہے۔ مجھے خیال ہی نہ رہا تھا کہ میں کہاں کھڑی ہوں؟ کیونکہ میرا ہاتھ سینے پر دوہتڑ کے انداز میں پڑنا شروع ہوگیا تھا۔

''تمہاری عزیز تھی؟'' اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' میں نے دکھ سے کہا اور اُس سے معذرت کر کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

ایک طویل مدت بعد میں نے منزہ کو لکھا جس کا جواب مجھے ایک ماہ بعد ملا۔

تو میری جان وہ بخت کی جن بلندیوں پر پہنچی تھی وہاں سے دھڑام سے نیچے گر گئی ہے۔ وہ ہنسی خوشی پاکستان سے گئی تھی۔ اُس کے چھوٹے سے خاندان میں ایک بیٹی کا اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ہنستی اور شوہر سے کہتی۔

''تمہیں زیادہ بچوں سے گھبراہٹ ہوتی ہے مگر مجھے ڈھیر سارے بچے چاہئیں۔ ہنستے مسکراتے، روتے، منہ بسورتے، ستاتے بچے میری جان ہیں۔ وہ ماں کیسی خوش نصیب ہے جس کی ساری اولاد لائق ہو۔''

جواباً ڈاکٹر احسن مسکراتا۔

''بھئی دیکھو نا! بچے زیادہ ہو جائیں اور مجھے کچھ ہو جائے تو تمہاری جان تو عذاب میں پھنس گئی۔''

اور وہ خفگی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔

''کیسی اول فول باتیں کرنا شروع کر دیتے۔''

اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس کی خوراک کم ہوتی جا رہی ہے۔کھانے کی میز پر وہ ایک پھلکے سے زیادہ نہ کھا پاتا۔کبھی کبھی پیٹ میں درد کی شکایت بھی کرتا۔

''تم کیسے ڈاکٹر ہو کہ اپنے جسمانی نقص کو بھی نہیں سمجھ سکتے؟''

اُس کا تفصیلی معائنہ ہوا اور اُسے علاج کے لئے ویانا بھیج دیا گیا جہاں اُس کا آپریشن ہوا اور وہ صحت مند ہو کر واپس اُس کے پاس آیا۔مگر یہ صحت مندی عارضی تھی۔اُسے دوبارہ تکلیف شروع ہو گئی۔اب کی بار اُس کا رخ پاکستان کی طرف تھا۔شہزادی اُس کے ساتھ نہ آسکی۔چند دن پہلے اُس کا بچہ ضائع ہو گیا تھا۔ڈاکٹروں نے ہوائی سفر سے منع کر دیا تھا۔تین ماہ بعد وہ پھر دوہا صحت مند ہو کر آیا۔ہوائی اڈے پر شہزادی اُس کے استقبال کے لئے موجود تھی۔احسن کی صحت بہت اچھی ہو رہی تھی۔آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ رات کو شوہر کے گلے لگ کر بہت روئی۔اُس کے نرم اور ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے بڑی ٹھہری ٹھہری آواز میں کہنا شروع کیا۔

''شہزادی! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کیا تکلیف ہے؟ کینسر کا مریض ہوں اور تھوڑے وقت کا مہمان۔ویانا میں جو آپریشن ہوا تھا وہ یقیناً کامیاب ہوتا اگر یہ کچھ عرصہ پہلے ہو جاتا مگر اب بہت مشکل ہے۔''

اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شوہر کو دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔جس پر وہ

بولا۔

''یوں بات نہیں بنے گی جانِ احسن! تمہارا حوصلہ اب پہاڑ جتنا ہونا چاہیے۔''

اب کی بار جب وہ بیمار ہوا تو سب اکھٹے آئے۔ چند دن ہی زندہ رہا اور پھر اُسے تنہا چھوڑ گیا۔

اُسے مرے ابھی دو دن بھی نہ ہوئے تھے جب اُس کی ساس نندوں نے کہنا شروع کر دیا۔

''ارے اِس ناگن کا کیا ہے یہ تو دوسرا کر لے گی۔ بیٹا گیا تو ہمارا۔ کوکھ اُجڑی تو ہماری۔ یہ بھلا بیٹھے گی کہیں۔''

اُس نے سب سنا اور چپ رہی۔ نفرت کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ وہ عدت پوری کئے بغیر والدین کے گھر آ گئی۔

سسرال والے تو اُسے گھر سے نکال کر مطمئن تھے مگر جلد ہی اُن پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مرنے والے نے ساری جمع پونجی اُس کے نام کی ہوئی ہے اور یوں وہ لاکھوں کی وارث ہے۔

اب وہ آئے گئے سے سنتی کہ اُس کی ساس کہتی ہے۔

''ارے کیا پتہ کتنی لمبی زندگی ہے؟ کوئی اس کی بیوگی کے دن تھے۔ میں چھوٹے سے نکاح کر دوں گی۔''

اور پھر جب ایک دن جب وہ چھت پر جانے کے لئے اُس برآمدے سے گزری جہاں چارپائی پر بیٹھی اُس کی ماں بہت مغموم اور پریشان نظر آ رہی تھی۔

''شہزادی تو بھی تو کچھ بول۔''

اسے محسوس ہوا تھا کہ ماں کی آواز بہت بھاری ہے۔ اُس نے دکھ سے لبریز ایک

نگاہ ماں پر ڈالی، مڑی اور پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے بولی۔

''ماں ایسی لایعنی اور فضول باتوں پر غور کرنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔''

اور جاتی گرمیوں کی ایک ٹھنڈی شام اُس کے سسرالی خاندان میں سے اُس کی ممانی ساس یہی سوال لے کر اُس کے گھر آئی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی اُس کی باتیں سنتی رہی اور پھر رُندھے گلے سے بولی۔

''میری ساس نندوں کا خیال ہے کہ زبان صرف اُن کے منہ میں ہے اور شکوے شکایت صرف اُنہیں ہی ہیں۔ مگر اُنہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میری زبان اُن کی زبانوں سے زیادہ لمبی ہے۔ اِس میں زہر گھلا ہوا ہے۔ یہ کسی خوف اور ڈر کے باعث اندر نہیں ہے۔ بلکہ اُس احترام کے پیشِ نظر ہے جو مجھے اُن کا ہے۔ میری ساس نے میرے شوہر جیسے عظیم انسان کو جنا۔ اُسے پالا، لکھایا پڑھایا اور میرے حوالے کیا۔ اُس کے ساتھ گزرے چار سال میری ساری زندگی پر حاوی ہیں۔ رہا شادی کا سوال اب میں عورت نہیں صرف ایک ماں ہوں۔ ایک ماں جس کا نام ایثار اور قربانی ہے۔''

مغرب کی نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کو صاف کرتی اُٹھی اور اُسکے حضور جھک گئی جس نے اُسے چھوٹی عمر میں سکھ اور دکھ کی انتہاؤں پر پہنچا دیا تھا۔

میرے بچے گیلری میں کھڑے باہر سڑک پر گزرنے والی ٹریفک دیکھ رہے تھے۔ میاں برآمدے میں بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ایک نظر اُن سب پر ڈالی۔ خط تہہ کیا، گیلی آنکھیں صاف کیں اور کچن کی جانب قدم اُٹھاتی گئی۔

☆☆☆

ذرا سن تو فسانہ میرا

جہاز سے اُتر کر ائیر پورٹ کے بور اور تھکا دینے والے جھمیلوں سے نکل گاڑی میں بیٹھی تھی بلکہ بیٹھی بھی کہاں ابھی آدھی اندر آدھی باہر تھی جب بیٹی نے سٹیرنگ پر بیٹھے ہوئے زمانے بھر کا طنز لہجے میں گھولتے ہوئے کہا۔

"اماں یہ چھٹنکی برابر اٹیچی کیس آپ باہر سے لائی ہیں۔ یہ تو آپ کے کپڑوں سے ہی بھرے ہوں گے۔"

ثمرہ ہے تو بیٹی پر ہے پکی حرامزادی۔ اللہ گواہ ہے اس کی پیدائش میں میری طرف سے کوئی رتی برابر ہیرا پھیری نہیں تھی۔ سو فیصد حلال والا معاملہ تھا۔ تو پھر وہ کس پر پڑی؟ سات پشتوں میں نہ کوئی ایسا کمینہ، نہ لالچی، نہ خودغرض۔

سات ماہ بعد میں میکسیکو اور سان فرانسسکو میں بیٹے بیٹی کے ہاں چلّے کروا کے واپس آئی ہوں۔ لمبے سفر نے ہڈی ہڈی پٹخا دی ہے۔ جوڑ جوڑ میں اینٹھن اور بوٹی بوٹی تھکن کی دُکھن سے بھری ہوئی ہے۔

اب اِس اولاد کو دیکھو بجائے یہ پوچھنے کہ اماں سفر کیسا گزرا؟ بہت تو نہیں تھکیں؟

میں نے گھر اچھی طرح صاف کروا دیا ہے۔ زرینہ گھر میں موجود ہے اماں مجھے اور بچوں کو آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ خدا کا شکر ہے آپ آ گئیں۔

ایسی دل کو خوش کرنے والی کسی بھی بات کی بجائے اُس نے ایک تھپڑ مارتے ہوئے پیغام دیا کہ اتنے مہینے جو تحائف کے انتظار میں گزارے اور بچوں نے فرمائشیں کیں وہ تو سب اکارت گئیں نا۔

بھلا میں بھی کیا کروں؟ اُن کی لمبی چوڑی فہرستیں اب جی جلانے لگی ہیں۔ فون کرو مجال ہے جو احوال پوچھ لیں۔ ہیلو کے بعد فرمائشیں شروع۔ اماں یہ لے آنا۔ میرے لئے وہ آنا۔

اِس بار میں بھی ستی پڑی تھی۔ جب بھی کبھی بازار گئی اللہ گواہ ہے میرے سامنے صرف ایک چہرہ آیا۔ میری خادمہ زرینہ کا۔ مؤدب، خاموش میری خدمت کے لئے ہمہ وقت مستعد۔ نہ کوئی فرمائش۔

اُس وقت تو یوں بھی ذہن تھکا ہوا تھا۔ جیٹ لیگ کا شکار ہوئی تھی۔ جسم کی ہر چیز اپ سیٹ تھی۔ نیند آنکھوں میں جھولتی جھومتی تھی۔ جی چاہتا تھا سر کہیں ٹکاؤں اور دوبارہ نہ اُٹھاؤں۔ شکر ہے گھر کھلا تھا۔ میری جانثار خادمہ زرینہ نے صفائی ستھرائی سے اُسی چمکا رکھا تھا۔ بیڈ روم صاف تھا۔

چھوٹے چھوٹے دو اٹیچی کیس جنہوں نے ثمرہ کو مایوس کیا تھا اور جنہیں بے دلی سے اُتار کر زرینہ کے حوالے کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ یہ جا وہ جا۔ اندر آنے کی زحمت تک گوارہ نہیں کی۔ زرینہ نے سلیقے سے دیوار کے ساتھ ٹکا دیئے تھے۔

میں نے نمرہ کو دعائیں دیں کہ اُس نے ثمرہ کو کوئی دس بار فون کیا اور زرینہ کو بلوانے اور گھر کی چابی اُسے دینے کی تاکید کی تھی۔ زرینہ کی سمجھداری اور ذمہ داری سے مجھے

وہی توقع تھی جس کا مظاہرہ میں نے گھر آ کر دیکھا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اپنی خاموش خدمات کے عوض اولاد کی بجائے میرے دل کے اندر بہت دور تک اُتر گئی تھی۔

بڑے بے قدرے لوگوں کے ہاتھ میں بیاہی گئی جنہوں نے مار مار کر اُس کا حشر کر دیا۔ طلاق تو پھر بھی نہیں چاہتی تھی۔ پر شاید قدرت کو اُس کی مظلومیت پر رحم آ گیا۔ اُنہوں نے خود ہی ایک دن کاغذ ہاتھ میں تھما کر چلتا کر دیا۔ خدا کو شاید میری کوئی نیکی پسند آ گئی کہ میرا اُس سے ٹکراؤ ہوا۔ اور اب تو میں چاہتی تھی کہ کوئی بھلا مانس سا لڑکا مل جائے تو اُسے بیاہ دوں اور اُسے بھی اپنے پاس رکھ لوں۔

اولاد تو بہر حال اولاد ہوتی ہے پر آج کل کی اولاد کو کہاں اِتنی توفیق کہ وہ خدمت گزار ہو۔ ہوگی نصیبوں والوں کی جو ماؤں کے تلوے تلے جنت کے متلاشی رہتے ہیں۔

یہاں تو اولادیں ناکوں ناک گلے شکووں سے بھری ہوئی ہیں۔ جو ملک میں ہیں اُن کی بات چھوڑو اور جو پردیس میں ہیں اُنہیں بھی اعتراض۔ بیٹی کو شکایت کہ آخر پاکستان کیوں بھاگی جاتی ہیں میرے پاس رہیں۔ یہی شکایت بیٹے کو بھی ہے۔ بے بی سٹنگ پر کتنے پیسے اُٹھتے ہیں؟ چلو ماں کو اِس کام پر لگاؤ۔ مفت کی نوکرانی۔ دھیلا نہ پولا رنگ چوکھا۔ ظاہر ہے نانی دادی پرورش میں کہاں ڈنڈی مارے گی؟ اپنی جان ہلکا کر دے گی۔

سات ماہ جیسے سولی پر چڑھی۔ پہلے بیٹی کے ہاں۔ پھر بیٹے کے گھر۔ شکر کا کلمہ پڑھا جس دن اِس قید با مشقت سے رہائی ملی۔

پتہ نہیں کتنی دیر سوتی رہی۔ سارا دن گزرا، رات گزری، کوئی ٹینشن نہیں تھی۔

اللہ میرے ہپو بات ہوگئی تھی۔ دودھ کا وقت ہو گیا ہے۔ پیمپر چینج کرنا ہے۔ مالش کرنی ہے بچے کو نہلانا ہے۔ بچوں کے پالنے اور اُن کے سلسلے میں مشقت کا بھی وقت ہوتا ہے۔ جوانی اور طاقت دونوں پاس ہوتے ہیں۔ انسان اِس کشٹ کو ممتا کے بل پر چاہتوں

سے جھیل جاتا ہے پر ساٹھ کے بعد وہ توانائیاں کہیں پاس رہتی ہیں کیا؟

میرا حلقہ احباب خاصا وسیع ہے۔بہت سے خواتین تنظیموں کی ممبر ہوں۔کم وبیش تمام ممبر خواتین پڑھی لکھی پروفیشنل اور روشن خیال ہیں۔

ایک پر لطف ناشتہ اور مزے دار چائے پینے کے بعد میں نے پہلا فون اپنے دوست تہمینہ کے گھر کیا۔تہمینہ کے بچے بھی باہر کے ملکوں میں سیٹل ہیں۔ہم دونوں بغیر شوہروں کے ہیں۔اُس نے طلاق لے رکھی ہے اور میں بیوہ ہوں۔

بڑی چہکار تھی تہمینہ کے لہجے میں۔

''چلو شکر ہے تم واپس آئیں۔سبھی تمہیں مس کر رہے تھے۔''

پھر اُس نے مجھے میری عدم موجودگی میں ہونے والی ساری اہم خبریں سنائیں۔ پورا اخبار کا پلندہ تھا۔

ہاں پر ایک خبر اور بھی ہے۔یقیناً تمہارے لئے حد درجہ حیران کن ہوگی۔پر وہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔کل شام آؤ۔کھانا کھائیں گے اور خبر سے تمہاری تواضع کروں گی۔

ایسا تجسس بھرا چٹخارے دار لہجہ تھا کہ میں نے بتیری منتیں کیں کہ کچھ پھوٹ دو۔ مجال ہے جو اُس نے ایڑی لگنے دی۔اب گلے سے لے کر منہ تک بھرے تجسس سے ڈیڑھ دن گزارنا بہت مشکل کام تھا۔اگلے دن شام کو اُس کے گھر پہنچی۔

تہمینہ اپنے بیڈروم میں تھی۔میں سیدھی وہیں چلی گئی۔وہ انٹرنیٹ پر بیٹھی تھی۔کس قدر والہانہ محبت بھرا اظہار تھا ہم دونوں کے ملنے میں۔چھیاں ڈال کر ہم بیڈ پر ہی براجمان ہو گئیں۔

''چلو اب بتاؤ۔'' میں بیڈ پر لم لیٹ ہوتے ہوتے بولی۔

''دھیرج۔'' اُس کے لبوں پر پھیلی پراسراری مسکراہٹ گہری ہو رہی تھی۔

''چائے کا ذرا کہہ آؤں۔'' وہ باہر نکل گئی۔

میں نے تپائی پر رکھا اخبار اُٹھالیا۔اُف اخبار پڑھنے کو بھی ترس گئی تھی۔موٹی موٹی سرخیوں پر نظر ڈال کر میں نے ادارتی صفحہ نکال لیا۔تھوڑی دیر بعد ہی تہمینہ بھی آ گئی۔اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے میں نے کہا۔

''تم نے یہ کیا شرلاک ہومز کا سا انداز اختیار کر رکھا ہے۔بکو بھی اب۔''

''بھئی میں نے شادی کر لی ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

یہ کوئی معمولی خبر نہ تھی اِتنی زبردست اور چونکا دینے والی میں نیم دراز تھی۔یہ سنتے ہی ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''بڑا جی داری والا کام کیا ہے تو نے۔کون ہے وہ؟''

اب میں بے اختیار اُس کے بارے میں جاننے پر متوجہ ہوئی۔سچی بات ہے کہ یہ ایک طرح میرے حیرت واستعجاب کے سمندر میں گرنے والی بات تھی۔ہم عورتیں تو ازلی بزدل ہیں اِس معاملے میں۔

''ہاں کرنل ضیا سے تو نہیں۔''

''ارے نہیں۔کولی مارو اُسے۔زمانے بھر کا بزدل۔''

''تو پھر کون ہے؟'' میں مزید متجسس ہوئی۔

وہ بڑے شانت سے لہجے میں بولی تھی۔

''بھئی دو ٹانگوں، دو بازوؤں والا ایک انسان ہے۔اضافی خوبیاں بتاتی ہوں۔''

وہ پھر ہنسی۔

''بڑا خوبصورت اور جی دار ہے۔میرے گھر روغن کرنے آیا تھا۔میں نے دیکھا خاصا ہنر مند لڑکا ہے۔بہت اچھی گاڑی چلاتی جانتا ہے۔کھانا بھی پکا لیتا ہے۔بجلی کے کام

میں مہارت ہے۔سودا سلف لانے میں بھی خاصا تیز ہے اور سب سے بڑی بات ایماندار اور سچا تھا۔اور تم جانتی ہو کہ میں اِن سب کاموں کے لئے لوگوں کی کتنی محتاج رہتی ہوں۔''

''کم بخت کچھ سوچا تو ہوتا۔تم جیسی پڑھی لکھی انٹلیکچوئل عورت اُس سے بات کیسے کرتی ہوگی؟''

''میری جان انٹلیکچوئل باتیں کرنے کے لئے تم لوگ جو ہو۔''

اُس کا قہقہہ فضا میں بکھرا اور میں حیرت زدہ اُسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

گھنا درخت

اُس نے جھریوں بھرے پوپلے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھاما اور سر اُس کے کمزور شانے پر ٹکا دیا۔ محبت بھرے بوسوں کی بارش اُس کی گردن پر ہوتی رہی اور وہ سرشار سا اُس میں نہاتا رہا۔ ایرو ڈرم کے وسیع و عریض ویٹنگ روم میں ایک طائرانہ نظر دوڑانے سے ہی وہ اُنہیں پہچان گیا تھا۔ چھینٹ کی فالسائی رنگ کی خوب گھیر دار شلوار، ململ کی سیاہ کُرتی اور سفید دوپٹہ۔ کانوں میں میل خوردہ چاندی کی ڈنڈیاں ہلکورے کھاتی تھیں۔

دادی سے فارغ ہو کر وہ ماں کی طرف بڑھا۔ اُس سے ملنے کے بعد اُس کی نظریں ماموں کے محبت بھرے چہرے پر جمیں اور اُن کی چوڑی چھاتی سے لپٹ گیا۔ اُس کے اردگرد بہت سے لوگ کھڑے تھے جنہیں وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ سب صرف اُس کے استقبال کے لئے آئے تھے۔ لیکن وہ اپنے سادہ لوح دیہاتی بھائی، باپ اور عاجز سے ماموں کی طرف ہی متوجہ رہا۔ بس سرسری دعا سلام باقی سب سے ضرور ہوئی۔ اس ہجوم میں اُس نے ذرا فاصلے پر بے نیازی سے کھڑی فاطمہ کو دیکھا۔ ہنستے ہوئے وہ اُس کی طرف لپکا اور اُس کے سر پر ہاتھ جماتے ہوئے بولا۔

''ارے پھاماں تو اتنی بڑی ہوگئی ہے؟''

اور اُس بڑی سی لڑکی نے آنکھیں پٹپٹا کر اُسے دیکھا۔ دوپٹے کا سرا دانتوں سے مسلا اور دھیرے سے بولی۔

''کیوں مجھے بڑا نہیں ہونا چاہیے تھا؟''

وہ اپنی ماں، ماموں، باپ اور بھائی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا اور گھر آ گیا۔ کھانا بہت پرتکلف تھا۔ کھاتے کھاتے اُس نے ماموں کی طرح رخ پھیر کر کہا۔

''آپ نے اتنی تکلیف کیوں کی؟ بلاوجہ اتنا خرچہ کر ڈالا۔''

فاطمہ کا باپ ابھی جواب سوچ رہا تھا کہ فاطمہ کی خالہ فوراً بول اُٹھی۔

''ارے کہاں! یہ کھانا تو اماں نے پکوایا ہے۔''

''ناحق تکلیف کی۔'' اُس نے سر جھکا کر کہا۔

''پردیس جا کر بہت روکھے ہو گئے ہو۔ غیروں والی باتیں شروع کر دی ہیں۔ اے اللہ قسم ہمیں جو تمہاری خوشی ہے، وہ یہاں سے باہر ہے۔''

وہ اس بار چپ رہا۔ چائے سے فارغ ہو کر اُٹھنے لگا تو فاطمہ کی نانی بولیں۔

''ہال کمرے میں جا کر آرام کرو، تھکے ہوئے لگتے ہو۔''

کچھ کہے بغیر وہ کھانے کے کمرے سے نکلا اور اپنے ماموں کے کمرے میں آ گیا۔ پانچ چھ سال کے عرصے میں اس کمرے میں بس اتنا انقلاب ہی آیا تھا کہ پہلے جہاں چارپائی بچھی ہوتی تھی وہاں اب پلنگ پڑا ہوا تھا، صاف ستھری چادر بچھی تھی۔ ممانی بچوں کے ساتھ اپنے کمرے میں تھی۔ وہ اُن سے اور بچوں سے باتیں کرنے لگا۔ ممانی نے خود ہی کہا۔

''تھکے ہوئے ہو، لیٹ جاؤ۔ بچوں کو باہر بھجوا دیتی ہوں۔''

وہ سوگیا۔چار بجے کے قریب اٹھا۔آنگن میں سب لوگ بیٹھے تھے۔ممانی سے اُس نے بالکل ایسے ہی کہا جیسے آج سے پانچ سال قبل وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

''مامی، پھاماں سے کہیے، چائے بنا کردے!''

''وہ معلوم نہیں کہاں ہے؟ثمینہ بنائے دیتی ہے۔''

فاطمہ کی نانی فوراً بول اُٹھیں۔

وہ نہ نہ کرتا رہا مگر نانی اُس کی سنتی!

ثمینہ نے چائے بنائی اور اُسے پینی پڑی۔

ماموں، ممانی اور اُن کے بچوں کے لئے جو چیزیں وہ لایا تھا وہ اُس نے انہیں دیں۔فاطمہ کی جالائیں، ماموں اور نانی سب دیکھ رہے تھے کہ اُس کا جھکاؤ ماموں ممانی کی طرف کتنا ہے؟ پانچ سال باہر رہنے کے باوجود اُس کی عادات میں ذرا فرق نہ آیا تھا اور اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ فاطمہ کی ماں اور باپ دونوں کو مجبور کیا جائے۔

اگلی صبح وہ گاؤں کے لئے روانہ ہوگیا۔اُس کے سیدھے سادے گاؤں میں بڑی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ریں ریں کرتے رہٹوں کی جگہ ٹیوب ویل لے چکے تھے۔ہلوں کی جگہ ٹریکٹر چل رہے تھے۔وہ چوپال میں بیٹھا تو سارا گاؤں اُسے دیکھنے اور ملنے کے لئے آیا۔وہ لندن سے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔عورتوں نے اُس کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرے اور کہا۔

''اے حسین! تو ذرا نہیں بدلا۔''

شام پڑنے پر گھر آیا۔سفید اور قرمزی سوت کی بنی ہوئی چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ماں نے پھولوں والی نئی چنگیر میں سنہری مکئی کی روٹیاں اور ساگ کا کٹورا اُس کے سامنے رکھا۔مکھن کا پیڑا گرم ساگ کی حرکت سے آہستہ آہستہ پگھل کر کٹورے میں جا بھاگتا

پھر رہا تھا۔ مکھن ساگ اور مکئی کی روٹی کی مخصوص خوشبو نے اُس کی اشتہا کو دگنا کر دیا۔ اُس نے لقمہ توڑا ہی تھا کہ صحن کے آخری سرے پر بیٹھا اُس کا باپ، جو سنکوے سے چارپائیوں کی ادوائن کے لئے رسی بٹ رہا تھا زور سے پکارا۔

''ذرا احتیاط سے کھانا۔ تمہارا معدہ اب اِن کھانوں کا عادی نہیں رہا۔''

اُس نے انگلی پر لگا ہوا مکھن چاٹا اور بولا۔

''ارے میاں جی چھوڑیئے، کیا آپ سمجھتے ہیں میں ڈاکٹر بن کر لندن میں پانچ سال رہ کر اِن کھانوں کا عادی نہیں رہا۔ میں انہیں ہضم کرنا اچھی طرح جانتا ہوں۔''

کھانا کھا کر اس نے سگریٹ سلگایا۔ باہر ٹھنڈ پڑ رہی تھی نورا نے دونوں بھینسیں باڑے میں باندھ دی تھیں۔ وہ اندر کمرے میں آ گیا۔ پچھلے سال گاؤں میں بجلی آ گئی تھی گھر میں خوب روشنی تھی۔ اُس کی دادی کمرے میں بیٹھی حقہ گڑگڑا رہی تھی۔ ماں باہر اُس کی چھوٹی بہن کو آواز دے رہی تھی۔

''ویدا دُودھ کو جمن لگا دیا ہے؟''

''ماں تم خود لگا دو میں گائے کو پرالی ڈالنے جا رہی ہوں۔''

اُس کی ماں بھی تھوڑی دیر بعد اندر آئی۔ ساس کے پاس ہی وہ بھی بیٹھ گئی۔ حقہ اب دونوں ہاتھوں میں گردش کرنے لگا تھا۔

''دیکھ بیٹے۔'' ماں نے حقے کی نے ساس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تو اب لائق ہو گیا ہے۔ خدا نے تجھے بہت بڑا ڈاکٹر بنا دیا ہے۔ تیری شادی کا بوجھ اب میرے سر پر ہے۔ میرا ارادہ تو تیرے ماموں کے ہاں تھا۔ مگر تیری ممانی کا میکہ اپنی چھوٹی لڑکی کے لئے خواش مند ہے۔ پچھلی دفعہ جب میں اُن کے ہاں گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ تیری ممانی بھی بہن بھائیوں کے سامنے مجبور سی ہو گئی ہے۔ بات ہوئی تو بولی۔

''سب کہتے ہیں کہ بہن بیٹھی ہے تو بیٹی کی شادی کے لئے اتنی جلدی اچھی نہیں۔''

اُس کی باتوں سے مجھے بھی یہ محسوس ہوا جیسے وہ بھی یہی چاہتی ہے۔ دیکھا جائے تو لڑکی وہ زیادہ خوبصورت ہے۔ بڑے بھائیوں کی بہن ہے، بہت کچھ لائے گی بھی۔''

''ماں ایسا سوچنا آپ نے کب سے شروع کر دیا ہے؟ آپ کو چیزوں کی خواہش ہے تو حکم کیجئے میں قیمتی اشیاء آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ بڑے بھائیوں کی وہ نک چڑھی بہن مجھے بالکل پسند نہیں۔ یوں بھی ذرا غور کیجیے مجھے اس منزل تک پہنچانے میں آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے اُس بھائی کا بھی بڑا حصہ ہے جو بڑے مخلص ہیں۔ بڑی محبت والے ہیں مگر اپنی غربت کی وجہ سے اپنی کھاتی پیتی سسرال میں عاجز سے بنے رہتے ہیں۔''

ساتھ والی رابو نے اُس کی ماں کو پکارا تھا۔ وہ اُٹھ کر باہر انگنائی میں چلی گئی۔ رابو کی بہو کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ تکلیف شروع تھی وہ ماں کو بلانے آئی تھی۔ ماں یونہی اوڑھنی کی بکل مارے اُس کے ساتھ چلی گئی۔

وہ سگریٹ پیتا رہا اور دھوئیں کے مرغولوں میں ماضی کی یادوں میں بھٹکتا رہا۔ ماضی نے اُسے جفاکش اور محنتی بنایا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں وہ دس کوس کا فاصلہ طے کر کے شہر پڑھنے جاتا۔ کروشیے کے بنے تھیلے میں اُس کی کتابیں، چھوٹے سے کپڑے میں بندھا پراٹھا اور اُس پر رکھی اچار کی پھانک۔ سفید لٹھے کی شلوار بھی ان چیزوں کے ساتھ تھیلے میں ٹھنسی ہوتی۔ شہر کے قریب پہنچ جاتا تو تھیلے میں سے چُرمُر ہوئی شلوار نکال کر پہن لیتا اور دھوتی اُس میں ٹھونس دیتا۔

گھر واپس آ کر وہ بھائی اور باپ کے ساتھ کھیتوں پر کام کرتا اور رات کو لالٹین کی مدھم روشنی میں پڑھتا۔

گھر کی غربت نے اُسے اِس قدر حساس اور محنت کش بنا دیا تھا کہ میٹرک میں وہ

پورے ضلع میں اول آیا۔اُس نے وظیفہ حاصل کیااور لاہور ماموں کے پاس پڑھنے کے لئے آ گیا۔

شہر میں آ کر رہنے اور پڑھنے کا تجربہ بالکل نیا تھا۔یوں وہ دو تین بار پہلے بھی ماموں کے پاس آ کر رہا تھا۔مگر وہ محض چند دنوں کی مہمان داری تھی۔ماموں ریڈ کراس کے دفتر میں مکینک تھے اور اپنی سسرال کے گھر اُن کی طرف سے دیئے گئے ایک چھوٹے سے کمرے میں بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔

شہر کی چوٹی کے کالج میں اُس کا نام درج ہوگیا اور وہ داخلے کے سب مرحلوں سے گزر کر گھر آیا۔تو ماموں نے پاس بٹھا کر محبت سے پوچھا کہ اُس کے پاس پہننے کو کوئی پتلون بھی ہے؟

''میں نے تو وہ کبھی پہنی ہی نہیں۔''

اُس کا جواب اتنا معصومانہ تھا کہ ماموں بے اختیار ہنس پڑے۔

''نہیں پہنی تو اب پہننی پڑے گی بیٹے !اِس شہر میں پتلون کے بغیر گزارہ نہیں۔''

پھر وہ اُسے لے کر لاہور کے مشہور لنڈے بازار میں گئے۔جہاں سے اُنہوں نے اُس کے لئے چند پتلونیں اور قمیصیں خریدیں۔

اُس کے ماموں کے پانچ بچے تھے،دو بیٹیاں اور تین بیٹے۔

وہ بے اختیار ہنس پڑا تھا جب اُسے آٹھ نو سال کی وہ لڑکی یاد آئی۔چھینٹ کی شلوار اور ململ بنیان میں کولھے پر چھوٹے بھائی کو اٹھائے وہ سارا دن ماں کی گھرکیاں سنتی۔ممانی اُس کی ذرا سی خطا پر روئی کی طرح اُسے دھنک ڈالتی۔وہ گھر کے کسی کونے میں اُسے منہ چھپائے روتے دیکھتا تو چمکار کر پاس بلاتا اور دلاسا دیتا۔

اُس کی ذرا سی توجہ نے اُسے اُس کی گرویدہ بنا دیا۔نچلی منزل میں کاٹھ کباڑ سے

بھرے ہوئے ایک کمرے میں تھوڑی سی جگہ اُسے پڑھنے اور سونے کے لئے دے دی گئی تھی۔ ماموں نے بہتیرا چاہا کہ اتنے ڈھیر سارے بند کمروں میں سے ایک کمرہ اُس کے لئے کھول دیا جائے مگر اُن کی ساس آمادہ نہ ہوئی۔

وہیں شام کو وہ اپنی کتابیں اُٹھا کر آجاتی۔ زمین پر بوری بچھا کر بیٹھ جاتی اور تھوڑی دیر بعد ''یہ لفظ کیا ہے؟'' پوچھتی اور یاد کرتی۔ وہ اگر کوئی کام کرنے کے لئے کہتا تو بھاگ بھاگ کر کرتی۔

اُسے احساس ہوا کہ اس گھر میں اس لڑکی کے ساتھ بڑی زیادتی ہوتی ہے۔ ماں، نانی اور خالاؤں کے گھونسے دن میں بیسیوں بار اُس کی کمر پر پڑتے۔ ذرا سی غلطی پر لعن طعن اور پھٹکار کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا جو کئی گھنٹے جاری رہتا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ پیار کی بھوکی ہے اور اُس کے سینے میں دھڑکتا ننھا سا دل بہت معصوم ہے۔ پڑھتے پڑھتے وہ کبھی آنکھ اٹھا کر اُسے دیکھتا تو اُسے اپنی طرف دیکھتے پاتا۔ اُس کے رخساروں پر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہتا۔

''پھاماں کیا دیکھتی ہو؟''

وہ شرمندہ سی ہو کر سر جھکا لیتی اور دھیرے سے بولی۔

''آپ اتنی موٹی موٹی کتابیں کیسے پڑھ لیتے ہیں؟''

''جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو تمہیں بھی پڑھنی آجائیں گی۔'' وہ ہنس کر کہتا۔

مڈل کا امتحان پاس کر کے پھاماں ہائی سکول میں داخل ہوگئی۔ وہ بدستور اُس کا کمرہ صاف کرتی، کپڑے دھوتی، استری کر کے بکس میں رکھتی، ممانی گھر پر نہ ہوتی تو کھانا بھی پکاتی، سونے سے پہلے اُسے چائے یا گرم دودھ کا ایک گلاس دے کر جاتی۔

وہ اُن دنوں برٹش کونسل کی طرف سے سمندر پار وظیفے کے لئے اُمیدوار تھا۔ اُس

کی ٹانگوں سے لپٹنے والی لڑکی اب جوان ہو چکی تھی اور جب وہ برطانیہ کے لئے رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ فاطمہ دن بہ دن پیلی ہوتی جا رہی ہے۔ کئی بار اُس کا جی چاہا کہ وہ اُس سے تنہائی میں بات کرے مگر جانے کیا جھجھک حائل تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ کر سکا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن روانہ ہو گیا۔

جب ذرا فرصت ملی تو ماموں کو مفصل خط لکھا۔ پورا خط لکھ چکنے کے بعد اُس نے اضافہ کیا۔

''تم کیسی ہو پھاماں؟ تمہارا نتیجہ اُمید ہے نکل چکا ہوگا۔ کس کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ ہے؟''

جواب فاطمہ نے لکھا تھا جو اُس کے ماموں نے لکھوایا۔ خط کے آخر میں اُس نے اپنی طرف سے لکھا۔

''میں ساری باتیں آپ سے کر لیتی تھی، اب یہاں میری لایعنی باتیں سننے والا کوئی نہیں۔ میں نے فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے مگر ابا کا خیال مجھے آگے پڑھانے کا نہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ میں کالج کے اخراجات میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

بہت جلد حسین کا خط آ گیا۔ اُس نے ماموں سے درخواست کی تھی کہ وہ فاطمہ کو کالج میں داخل کرا دیں۔ وہ اُس کے سارے اخراجات برداشت کرے گا۔ ماموں کے بچوں کی زندگی سدھارنے کے لئے وہ جان کی بازی لگا سکتا ہے۔

وہ گنوار دیہاتی لڑکا جسے پڑھنے اور رہنے کے لئے ماموں کے سسرال نے ایک کمرہ نہیں دیا تھا، اب اُن کی نظروں میں کھُب گیا تھا۔ یوں بھی وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور خوش رو لڑکا تھا۔

''ارے اتنے لائق اور خوبصورت لڑکے کے لئے فاطمہ ہرگز موزوں نہیں۔ ثمینہ

ٹھیک رہے گی۔'' ماموں کی ساس نے بیٹیوں کے کان میں پھونک ماری۔

گھر میں ہوتی یہ سرگوشیاں فاطمہ کے کانوں میں بھی پڑیں۔طنز بھری مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور وہ اپنے آپ سے بولی۔

''کہاں میں اور کہاں ڈاکٹر حسین، مجھ جیسی لڑکی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ہواؤں میں اپنا نشیمن بناتی پھرے۔''

اُس کی ننھیال نے پختہ فیصلہ کرلیا تھا کہ حسین کی شادی ثمینہ سے ہوگی۔

اُدھر ثمینہ کا پاؤں زمین پر نہ پڑتا۔اِتراا اِترا کر حسین کی باتیں سہیلیوں سے کرتی تو فاطمہ جل کر کوئلہ ہو جاتی۔باپ جب بھانجے کو خط لکھواتا تو چپکی لکھتی رہتی۔اُس نے اپنی طرف سے لکھنا بند کر دیا تھا۔ایک دو بار حسین نے لکھا بھی۔اُس نے پڑھا جواب دینے کو دل چاہا مگر حالات کا رخ دیکھتے ہوئے خاموش ہوگئی۔جو چیز اپنی نہیں اُس کے بارے میں دماغ خراب کرنے سے فائدہ!

وقت اور حالات نے اُسے بہت حساس اور سمجھدار بنا دیا تھا۔یوں بھی تلخیاں سہنے کی وہ بچپن سے عادی ہو چکی تھی۔

وہ کیمسٹری میں ایم ایس سی کے پہلے سال میں تھی کہ حسین کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ اُس کی آمد کا خط اُس نے سب سے پہلے پڑھا اور ماں باپ کو پڑھ کر سنایا۔پھر نانی کو دے دیا کہ اُنہیں اُس کی واپسی سے زیادہ دلچسپی تھی۔حسین نے خط لکھا تھا کہ وہ یورپ کی سیر سے فارغ ہو کر عمرہ کرے گا اور یہی کوئی اپریل تک وطن پہنچ جائے گا۔

حسین کے آنے کے دن جیسے قریب آتے گئے نانی کے ہاں چہل پہل شروع ہوگئی۔انتظامات شاندار سطح پر کئے گئے۔پورے گھر کو سجایا گیا۔ایک کمرہ خاص طور پر اُس کے لئے آراستہ ہوا۔فاطمہ کے باپ نے یہ سب خاموش تماشائی کے طور پر دیکھا۔بیٹی بچی

نہیں تھی جس کے بارے وہ آنکھیں بند کر لیتا۔رات کو اس نے بیوی سے بات کی۔

''میرا خیال ہے حسین فاطمہ کو پسند کرتا ہے، جبھی تو اُس کی پڑھائی کے لئے وہ اتنا کوشاں تھا۔''

''بھلے لوگ! خیال تو میرا بھی یہی تھا پر اُن سب کا کہنا ہے کہ بھلا وہ فاطمہ کو خاک پسند کرے گا نہ عقل نہ شکل۔''

فاطمہ کا باپ بھی سسرال والوں کی امارت سے دبتا تھا۔اتنے بڑے گھر میں یہ چھوٹا سا کمرہ اُنہوں نے دے رکھا تھا تھوڑی بہت مالی امداد بھی کرتے تھے۔

مارچ کا مہینہ آ گیا۔فضا میں جونکھار اور حُسن رچ گیا تھا اُسے دیکھ کر فاطمہ کا دل خون ہوا جاتا۔۔۔اور پھر جب اُس کے آنے کا تار آیا تو گھر کے سب لوگوں کے ساتھ مل کر نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے ائیر پورٹ جانا پڑا۔حسین پر نظر پڑی تو ویسا ہی سادہ اور مخلص دکھائی دیا جیسا پانچ سال قبل تھا۔

تیسرے دن جانے سے قبل اُس نے ماں سے ماموں کے پاس جانے اور بات چیت کرنے کو کہا۔

ماں اگلے دن لاہور پہنچ گئی۔ فاطمہ یونیورسٹی گئی تھی، لوٹی تو پھوپھی کو آنگن میں پیڑھی پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے دیکھا۔ جی لرز سا گیا۔شاید ثمینہ کی بات پوچھنے آئی ہوں۔رات پڑی، بھائی بہن اور بھاوج اپنے کمرے میں بیٹھے۔

''حمیدہ! تم اور تمہارے میکے والے ثمینہ کے لئے چاہتے ہیں مگر میرا بیٹا راضی نہیں وہ اپنے اُس ماموں کی بیٹی کا طلبگار ہے جس نے اُس کے لئے بہت تکلیفیں اُٹھائی ہیں۔''

فاطمہ کی ماں کا دل باغ باغ ہو گیا۔نند کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''ہمیں حسین سے زیادہ کون عزیز ہوسکتا ہے۔ پر تم جانو میرے میکے والے جینا حرام کر دیں گے۔ اچھا ہوگا اگر آپ اماں سے سوال کریں، میری پوزیشن خراب نہیں ہوگی۔''

''کوئی ضرورت نہیں اُن سے پوچھنے کی۔ ہمیں گھر سے نکال دیں گے نا! اللہ مالک ہے۔'' باپ نے کہا۔

صبح ہوئی فاطمہ کی پھوپھی نے مٹھائی کا ڈبہ منگوایا اور اُسے لے کر بھاوج کی ماں کے پاس گئی۔ سارے گھر میں خبر پھیل گئی۔ نانی، خالائیں تو جیسے انگاروں پر لوٹ گئیں۔

''اس کلوٹی کلموہی کا مقدر اتنا حسین!'' بے اختیار سب نے کڑھ کر سوچا۔ ایک نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''رحم آ گیا ہوگا بے چارے کو۔ اسے تو اوڑھنے پہننے کا سلیقہ نہیں۔ نام ڈبوئے گی اُس ڈاکٹر کا۔ پچھتائے گا وہ ایک دن۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ایسی باتیں سن سن کر فاطمہ کے کان پک گئے۔ تلملا کر ایک دن بول اُٹھی۔

''اتنے ڈھیر سارے لوگ جو خون کے ناطے میں ظلم کر رہے ہیں۔ آخر کسی کو رحم بھی تو آتا ہے، وہ ہمارے گھر اتنے سال رہا اُس نے ہمارا نمک کھایا، اب رحم کھائے گا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔''

گھر میں رہنے اور کھانے کی بات کو خوب اُچھالا گیا۔ حسین کے کانوں تک بھی پہنچائی گئی لیکن اُس نے نوٹس ہی نہ لیا۔ بڑی سادگی سے نکاح ہوا۔ ماموں کا پیسہ خرچ کروائے بغیر وہ اُسے گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔

اُس کے گلے اور ہاتھوں میں طلائی ہار چوڑیاں پہناتے ہوئے وہ بولا۔

''مانا میں نے تمہارے گھر کا نمک کھایا ہے پر اس کی مٹی تو پلید نہیں کرنی تھی نا۔''

''لوگوں نے آپ کو داتا اور سخی بنا ڈالا تھا۔اس کے جواب میں مجھے کچھ تو کہنا تھا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے واقعی تم پر رحم کھایا ہے؟''

''ہرگز نہیں۔''

وہ یقین اور اعتماد سے بولی۔

''آخر تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟''

وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر مسکرائی۔اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''میرا رنگ سانولا ضرور ہے،مگر اس میں کشش ہے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''بہت خوب۔اپنے منہ خود ہی میاں مٹھو۔''

''کیوں، کچھ غلط کہا میں نے؟''

''اچھا آگے چلو۔''

''میں ایک ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکی ہوں۔پڑھائی کے مواقع ملتے رہیں تو ایک دن آپ کے ہم پلہ ہو سکتی ہوں۔آپ خود سخت محنت سے اِس منزل پر پہنچے ہیں۔ان سب کے ساتھ ساتھ آپ کے بے حد پیارے سے ماموں کی بیٹی ہوں۔اب بتایئے اِن سب باتوں کے ہوتے ہوئے آپ کے مجھ پر رحم کھانے کی کیا تک تھی؟''

ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرے وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم وہی ہو نا جو دھپ دھپ مار کھاتی تھیں اور اشک شوئی کے لئے میرے پاس بھاگی آتی تھی۔ماشاءاللہ اب تو بڑی ذہین فطین ہو گئی ہو!''

اب اُس کے کھل کر ہنسنے کی باری تھی۔ہنس چکی تو گردن کو ذرا سا خم دے کر بولی۔

''آخر آپ کی کزن ہوں، کوئی مذاق تھوڑی ہے۔''

''مجھے اکثر وہ لڑکی یاد آتی جو مجھ سے اپنے دل کی ساری باتیں کرتی تھی، جو میرے کپڑے دھوتی، انہیں پریس کرتی، میری بکھری چیزوں کو ترتیب سے رکھتی اور مجھے اکثر کھانا پکا کر کھلاتی۔ وہ لڑکی جس کے دل میں میرے لئے خلوص اور محبت تھی۔ وہ میرے اُس ماموں کی بیٹی تھی جس نے مجھے گھنا پھل دار درخت بنانے کے لئے سخت محنت کی تھی۔ اُس گھنے درخت کے نیچے صرف اُس کی بیٹی کو آرام کرنے کا حق پہنچتا تھا۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیسے کسی اور طرف جا سکتا تھا؟ اب یہ میری خوش قسمتی ہے کہ وہ لڑکی ذہین بھی ہے اور پرکشش بھی۔''

☆☆☆

یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی

دین دار گھرانے کی پروردہ تھی پر وہ اس دین داری کے ہاتھوں سخت عاجز تھی۔ بس نہ چلتا تھا کہ کیسے اس خول کو جس میں اس کے گھر والے لپٹے اپنے آپ کو باہر کی غلاظتوں اور آلائشوں سے محفوظ سمجھتے تھے، پھاڑ کر کسی آزاد پنچھی کی طرح فضاؤں میں اُڑا جائے۔

بس صبح صادق کا اُجالا بکھرا اور ابا میاں کی پکار شروع ہوئی۔

''اُٹھ جاؤ اسماء بیٹی!''

وہ آنکھوں کے پٹ ذرا سے کھولتی اور ہوں کہہ کر کروٹ بدل لیتی۔

''دیکھو بیٹی نماز نہیں ملے گی۔ نماز نیند سے بہتر ہے۔''

''اللہ میرے۔''

وہ بڑبڑ کرتے اُٹھ بیٹھتی۔

گرمیوں کی دلکش صبح کو نسیم سحر کے جھونکوں سے آنکھیں بند ہو جاتیں۔ ہاتھ پاؤں

جھوٹے پڑے ہوتے۔بس وہ چار چھینٹے منہ پر ڈالے،وضو کیااور جانماز پر کھڑی ہوگئی۔ زبان سے رٹا رٹایا نکلتا۔ذہن اِدھر اُدھر بھٹکتا، دوسجدے کئے اور بھاگ کر پھر بستر پر دراز ہوگئی۔سارا گھر قرآن پاک کی تلاوت سے گونج رہا ہوتا۔بڑی آپا قرآن پاک بند کر کے کہتیں۔

''بھئی تھوڑا سا پڑھ بھی لیتیں۔'' اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑ کرتی۔

''تمہی پڑھو اور مجھے بخشو۔''

پھر بڑی آپا کا زبردست دھمو کا اُسے بیدار کرتا۔اس وقت تک سورج کافی اونچا ہو چکا ہوتا۔ٹھنڈی ہوا کے ساتھ چڑھتے سورج کی تپش فضا کو ہلکا سا گرم کئے ہوئے ہوتی۔

''تمہیں کالج نہیں جانا کیا؟ سب لوگ ناشتے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔جلدی آؤ۔''

اور وہ بکھرے بالوں کو سمیٹتی دگڑ دگڑ کرتی نیچے آجاتی۔آنگن میں چٹائی پر سب بہن بھائی بہن بیٹھے ہوتے۔اماں گرم گرم پھلکے اُتارتی جاتیں۔

''اللہ!اماں کبھی پراٹھے بھی بنالیا کرو۔تھوڑا سا حلوہ مل جائے اور گرم گرم چائے تو کیسا مزہ آئے۔''

جو ملتا ہے شکر کر کے کھالیا کرو۔اماں کچھ لتاڑنے کے موڈ میں ہوتی جب بڑی آپا کہتی۔

''ارے چھوڑیئے بھی اماں یہ تو سدا کی بھونکڑ ہے۔''

بڑے بھیا اور بڑی آپا دونوں میڈیکل کے سٹوڈنٹ تھے۔بڑی آپا خوب لمبی چوڑی چادر سے اپنا آپ ڈھانپ کر کالج کے لئے نکل جاتی۔وہ جب موٹی ململ کا ڈوپٹہ اوڑھتی تو اپنے آپ سے کہتی۔

''جب بڑے ہی ایسے ہوں گے تو چھوٹے بے چارے کیا کریں؟ بھئی اتنی ماڈرن لڑکیاں ہیں ان کے کالج میں اور یہ ان جھول کپڑوں میں ذرا سکی محسوس نہیں کرتیں۔''

وہ اپنے لباس کی تراش خراش پر خاصا دھیان دیتی۔ یہ اور بات ہے کہ جتنا ماڈرن وہ بننا چاہتی تھی اتنا بن نہیں سکتی تھی۔ گھر کا ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

اس گھر کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ والی بات تھی۔ اماں تو سر سے دوپٹہ اُترنے پر پھٹکارتی ہی تھیں پر چھوٹی خالہ پچھلے دنوں دس سال بعد کویت سے آئیں تو انہوں نے بھی اسے ننگے سر دیکھ کر لیکچر دینا شروع کر دیا۔

پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ بی ایس سی سے فارغ ہوئی تھی کہ اس کے لئے ایک اونچے گھر کا رشتہ آیا۔ لڑکا کسی بینک میں سنیئر منیجر تھا۔ باہر سے پڑھ کر آیا تھا۔ کار، کوٹھی اور مختصر خاندان تھا۔ لڑکے نے اُسے کالج آتے جاتے دیکھا تھا۔ موٹی ململ کے ڈوپٹے میں اس کا دلکش اور صبیح چہرہ اُس کے دل میں اُتر گیا۔ پتہ کروایا۔ شریف لوگ تھے۔ زندگی کی جدوجہد میں اوپر جانے کے لئے سارا خاندان سرگرم عمل تھا۔ دو بہن بھائی ڈاکٹر اور ایک انجینئر بن چکے تھے۔ زبیر نے ماں کو بھیجا۔ اماں نے معزز خاتون کو عزت و احترام سے بٹھایا اور مدعا جان کر کہا۔

''ابھی شادیوں کے بارے میں تو میں نے کچھ نہیں سوچا۔ بچے کسی منزل پر پہنچ جائیں تبھی کچھ ہوگا۔ گھر کی حالت آپ کے سامنے ہے۔ ساری دولت یہ اولاد ہی ہے جسے لائق بنانے کے لئے ہم دن رات محنت مشقت کر رہے ہیں اور اسماء تو یوں بھی سب سے چھوٹی ہے۔ اس کا ابھی کیا سوال ہے؟ پڑھنے والی بچی ہے کسی قابل ہو جائے پھر دیکھا جائے گا۔''

مگر زبیر اُن نوجوانوں میں سے تھا جنہیں جب کوئی شے پسند آجائے تو وہ اسے

حاصل کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔اس کی ماں ناکام لوٹی تھیں اور انہوں نے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

''لڑکی تو بلاشبہ خوبصورت ہے۔مگر خالی خولی شکل کو لے کر کیا کرنا ہے؟ گھر گھرانا تو گردن گردن غریبی کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔کسی وقت حالات ضرور بدل جائیں گے۔ ہاں ایک زمانہ لگے گا۔ہمارے معیار کے نہیں ہیں وہ لوگ۔''

مگر زبیر کے سر سے یہ تمام باتیں یوں گزر گئیں جیسے اس نے ہاتھ اُٹھا کر اپنے ناک پر بیٹھی مکھی کو اُڑا دیا ہو۔بے نیازی سے بولا۔

''اماں آپ پرانے وقتوں کی باتیں کرتی ہیں۔آج کل ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔لڑکی تو گدڑی میں لعل ہے۔ایسی خوبصورت اور شاندار کہ انسان بس دیکھتا رہ جائے۔اماں اب شادی تو بس اسی سے ہوگی۔یہ زبیر خان کی ضد ہے۔''

اور اُس نے خود لڑکی کے ماں باپ سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔دفتر سے واپسی پر وہ اُن کے گھر کے سامنے رُکا۔گاڑی بند کی اور دروازے پر دستک دی۔کوئی دس منٹ بعد اندر سے مترنم آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟ کس سے ملنا ہے؟''

''آپ جو بھی ہیں دروازہ کھولیں اور دیکھیں باہر کون ہے؟''

ڈیوڑھی میں اسماء تھی۔اس نے جھجکتے ہوئے ذرا سا پٹ کھولا۔سامنے سوٹڈ بوٹڈ نوجوان کو پایا۔جو اُس پر نظر پڑتے ہی گلاب کی طرح کِھل اٹھا۔وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''مجھے آپ کی امی سے ملنا تھا۔'' زبیر نے آہستگی سے کہا۔

''وہ گھر پر نہیں۔'' زبیر نے محسوس کیا کہ آواز گھبرائی ہوئی ہے۔

''آپ کی باجی یا بھائی جان تو ہوں گے۔ان سے ملوا دیں۔''

''سب لوگ باہر ہیں۔میں اکیلی ہوں۔''

زبیر نے دائیں بائیں دیکھا گھر میں کوئی نہیں تھا۔اس نے دروازے میں سے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے بیٹھک میں بٹھایئے ۔میں اُن کی واپسی کا انتظار کروں گا۔''

اسماء گھر میں آنے والے اس رشتے کی سن گن جان چکی تھی۔یہ بہت تعجب خیز بات تھی کہ کسی نے اُسے دیکھ کر پسند کرلیا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔جس ماحول میں اُس نے آنکھ کھولی تھی وہاں کتابوں کے ساتھ زندگی میں پہلے کچھ بن جانے کے سوا کچھ نہیں سنا تھا۔لطیف نسوانی جذبات سوئے پڑے تھے۔اور اب اس کے یوں اندر آجانے سے اُس کے ہاتھ پاؤں پھول سے گئے تھے۔

''اللہ میرے۔کوئی آ گیا تو کیا کہے گا؟''

زبیر ڈیوڑھی سے ملحقہ چھوٹی سی بیٹھک میں بیٹھ گیا تھا جس کی سفیدی دیواروں سے اُکھڑی پڑی تھی۔ایک پلنگ جس پر ہلکے نیلے رنگ کی چادر جس پر رنگ برنگے دھاگوں کے پھول بنے ہوئے تھے بچھی تھی۔دو کرسیاں اور چھوٹی سی گول میز بھی ایک کونے میں نظر آتی تھی۔

اسماء باورچی خانے میں دھڑ دھڑ کرتے دل سے یہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے؟ اماں دوسری گلی میں کسی واقف کے ہاں پرسہ دینے گئی ہوئی تھیں۔انہیں کون بلانے جائے؟ باورچی خانے کی کھڑکی سے وہ گاڑی کو گلی میں کھڑے دیکھ چکی تھی۔اس کے گرد محلے کے بچوں کا ہجوم تھا۔

اپنے گھر پر اُس نے ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی۔اپنے آپ کو بھی دیکھا۔کچھ سوچا۔ سنی سنائی کہانیاں اُسے یاد آئیں۔اُسے غصہ آیا۔

''کس لئے آیا ہے یہاں؟'' اور وہ ہمت سے اُٹھی۔ سامنے کرسی پر زبیر بیٹھا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ پر رسالے سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا تو مسکرایا اور بولا۔

''آپ کا نام نہیں جانتا۔ نام بتایئے۔''

اور اسماء نے حد درجہ بے نیازی سے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''باہر آپ کی گاڑی کو بچے خراب کر رہے ہیں۔ مجھے کسی بڑے کے آنے کا کوئی علم نہیں۔ مہربانی فرما کر آپ تشریف لے جائیں۔''

اس نے بات سنی، اس کے چہرے کو دیکھا، غور کیا اور بولا۔

''جانے کا سوال نہیں۔ مل کر ہی جاؤں گا۔ باقی گاڑی کی مجھے پرواہ نہیں آپ فکر نہ کریں۔''

وہ لوٹ آئی۔ دالان سے اگلے کمرے میں دیوار میں ٹنگے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اُس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''میں کیا اتنی خوبصورت ہوں؟''

اور آئینے کے جواب کی بجائے اس کے کانوں میں اپنی سہیلیوں کے فقرے گونج گئے جو اکثر اس کی خوبصورتی پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا کرتی تھیں۔

''اِس سادگی پر لشکارے پڑتے ہیں۔ ذرا سا بناؤ سنگھار تو اِس حُسن کو قیامت بنا دے گا۔''

اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ بناؤ سنگار تو دور کی بات ہے اس کی اماں تو اُس کے صاف رہنے پر بھی چیختی ہے۔

''تو میری صورت نے اسے اس قدر اپیل Appeal کیا ہے کہ وہ اس ڈبہ نما بیٹھک میں دھرنا مار کر بیٹھ گیا ہے۔''

مگر اب وہ یوں بھی پریشان ہونا شروع ہوگئی تھی کہ اگر بھائیوں میں سے کوئی آ گیا اور اسے اندر بیٹھے دیکھا تو سوچیں گے کہ اسے اندر کس نے بٹھایا؟

''اللہ! اگر ابا آ گئے تو کیا سوچیں گے؟ گھر میں میرے سوا کوئی نہیں تو یہ شخص کیسے اندر آ گیا؟''

ڈیڑھ گھنٹہ تک وہ اندر آتی جاتی رہی۔ہول کھاتی رہی۔

زبیر کو شاید کچھ اندازہ ہوا۔وہ خود ہی اُٹھ کر باہر چلا گیا اور اسماء نے دیکھا وہ گاڑی میں بیٹھ کر اسے سٹارٹ start کر چکا تھا۔

تمام تر خوف کے باوجود جیسے وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اُٹھ کر جائے۔جی دھک سے رہ گیا۔جیسے خوش بختی نے دروازے پر دستک دی ہے اور پھر روٹھ کر چلی جائے۔

مگر رات کو کوئی آٹھ بجے کے قریب زبیر پھر آ گیا۔گھر میں سبھی تھے۔اسماء نے ڈر کے مارے دوپہر کے واقعہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔بھیا لوگ ملے۔ابا اماں نے بات چیت کی۔یہ غیر معمولی سی بات تھی کہ اتنا بڑا افسران کے گھر سوالی بن کر آیا۔بڑے بھیا کو اسماء پر کچھ شک سا ہوا۔انہوں نے اس سے پوچھا۔اُس نے روتے ہوئے خدا کی قسم کھائی کہ وہ اُس شخص کو جانتی تک نہیں۔

زبیر جونک کی طرح اُن کی جان کو چمٹ گیا تھا۔گھر کے سب لوگوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ رشتہ اچھا ہے۔خواہش مند ہے۔چلو کئے دیتے ہیں۔

اور اس طرح اس کی زندگی میں ایک انقلاب سا آ گیا۔جس زندگی کے بارے میں اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔وہ زندگی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اسے مل رہی تھی۔قیمتی

زیورات اور عروسی لباس میں اُس نے اسماء کا زرتار گھونگھٹ اُٹھایا۔ اُس کے چاند جیسے دمکتے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر جذبات سے بوجھل آواز میں بولا۔

''میں خوش نصیب ہوں کہ تمہیں پسند کیا اور پالیا۔''

اور اُس اسماء نے جسے حقیقت پر ابھی تک خواب کا گمان ہو رہا تھا اپنی لانبی پلکیں اُٹھائیں اور دھیرے سے بولی۔

''آپ کو مجھ میں کیا نظر آیا تھا؟''

اور زبیر ہنس پڑا۔ اُس کے کانوں میں جھولتے طلائی جھمکوں کے موتیوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔

''یہ دل کے معاملات ہیں۔ یہاں استدلال بیکار ہو جاتا ہے۔ کیوں اور کس لئے کا سکہ اس دنیا میں نہیں چلتا۔''

اور اسماء واقعی خوش نصیب تھی۔ زبیر بیوہ ماں کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ ایک بہن تھی جو خلیج میکسیکو میں رہتی تھی وہ شادی پر نہیں آسکی تھی۔ سجا سجایا گھر، کار اور زندگی سے متعلق تمام سہولتیں اُسے حاصل تھیں۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سٹول پر بیٹھ کر ان گنت پرفیومز کی شیشیوں کو باری باری سونگھتی۔ خوشبو کے سحر سے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہتی۔

''مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کوئی ایسی نیکی کی ہے جس کے عوض اللہ نے مجھے یہ سب کچھ دے دیا ہے۔''

زبیر کے ساتھ اب وہ گھومنے پھرنے باہر جاتی تو دوپٹہ گلے میں ڈال لیتی۔ اپنے لمبے بال اُسے کھٹکنے لگے تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے اُس نے شوہر سے کہنا شروع کر دیا۔

''مجھے شولڈر کٹ بال بہت پسند ہیں۔ بالوں کو اس انداز میں کٹوانا چاہتی

ہوں۔'' اورزبیر نے بے نیازی سے کہا۔

''بھئی بال تمہارے اپنے ہیں۔جیسے چاہو کٹوا لو۔مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟''

اور بالوں کو اس نے اپنے پسندیدہ انداز میں تراشوالیا۔

اس بار جب وہ میاں کے ساتھ ماں سے ملنے گئی تو اس نے بالوں کو شانوں پر جھولتے اور رسمی نما ڈوپٹہ کو گلے میں ہی رکھا۔

سارا شہر وہ ننگے سر گھوم آتی پر جب ماں کے گھر آتی تو نہ چاہتے ہوئے بھی دوپٹہ اوڑھ لیتی۔یہ اور بات تھی کہ بعد میں وہ اپنی اس کمزوری پر خوب اُلجھتی اور تہیہ کرتی آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔

ماں نے اُسے حیرت سے دیکھا۔بڑی آپا بھی قدرے متعجب سی تھیں۔تینوں چھوٹے بھائی گھر پر تھے وہ بھی حیران سے تھے۔جون ہی تو بدلی ہوئی تھی اس کی۔ماں نے تنہائی میں بیٹی سے کہا۔

''تو نیک اور صالح گھر کی بچی ہے۔یہ نو دولتیوں والی حرکتیں خاندانی لوگوں کو زیب نہیں دیتیں۔ہم ایمان کی سلامتی چاہتے ہیں۔''

اور اُس نے ماں کی سرزنش پر قدرے رُکھائی سے کہا۔

''اماں اب میں شادی شدہ ہوں۔میرے لئے آپ سے زیادہ اپنے شوہر کی رائے کا احترام مقدم ہے۔''

اماں گھٹ سی گئیں۔وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر بیٹی کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔اس دم اُنہیں یوں لگا جیسے اُن کی ساری تربیت، ساری محنت اور سارے کئے کرائے پر پانی پھر گیا ہو۔

وہ اُمید سے ہوئی تو ایک دن شوہر سے بولی۔

''میں چاہتی ہوں میرے ہاں بیٹی ہو۔ میں بچی کی تربیت مثالی کروں گی۔ بہترین سکول میں پڑھاؤں گی۔فضول قسم کی شرم اور جھجک جو ہم جیسے طبقہ کی لڑکیوں میں سدا ہوتی ہے وہ کم از کم اُس میں نہ ہو۔''

''ارے بھئی کچھ ہونے تو دو۔پھر یہ ہوائی قلعے بھی بنالینا۔''

وہ اس کے احساسات سے یکسر بے نیاز اس کی بچگانہ باتوں پر ہنس پڑتا۔ پر بیٹا ہوا اور وہ سخت مایوس ہوئی۔دکھ سے بولی۔

''میں نے تو بیٹی چاہی تھی پھر یہ بیٹا کیسے آ گیا؟''

''اب خدائی تو تمہارے تابع ہونے سے رہی،اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔'' زبیر بولا۔

لیکن شکر کرنے سے بہت چڑتی تھی۔کیسے کیسے ارمان تھے؟ سب کا ہی بیڑہ غرق ہوگیا۔پر جب گیارہ ماہ بعد بیٹی آ گئی تو مانو جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔خوشی سے ایڑی زمین پر ٹکتی نہ تھی۔ابا اسے دیکھنے آئے تو رابعہ نام تجویز کیا مگر اس نے ناک بھوں چڑھائی۔

''اتنے ماڈرن زمانے میں ایسا سڑا بسا نام۔اپنی پسند کا نام رکھوں گی۔''

فلموں کی بہت کریزی تھی۔شوہر مصروف ہوتا تو سہیلیوں ساتھ بچوں کو بھی لے جاتی۔ایک دن کسی نے کہا۔

''اتنے چھوٹے بچوں کو فلموں کی لت ڈال رہی ہو۔انہیں مت لے جایا کرو۔''

اور وہ فلسفہ بگھارنے لگ جاتی۔نفسیات کے حوالے شروع ہو جاتے۔

یہ تو خیر معمول کی بات تھی کہ اس کی سہیلیاں اس کے ہاں اکثر دوپہر کو تاش کھیلنے آ جاتیں۔ریکارڈ پلیئر بجتا،کمرے میں قہقہے گونجتے اور چار سالہ بچی ایسے انداز میں کولہے

مٹکاتی کہ اس کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا۔

''بھئی تمہاری بیٹی بڑی برائٹ ہے۔''

ایک لقمہ دیتی۔ دوسری کہنا نہ بھولتی۔

''کسی ڈانس ماسٹر کی خدمات لینا۔''

اس مشورے پر وہ خاموش سے ہو جاتی۔ ماڈرن ضرور تھی، بچی کی طریقے سے تربیت کرنا چاہتی تھی مگر گانے والے اور ڈانس اُسے ذاتی طور پر ناپسند تھے۔ سب کی موجودگی میں بچی نے اُچھل کود کر لی وہ اور بات تھی۔

جس دن اس کا کونونٹ میں داخلہ ہوا اس نے سکھ کا سانس بھرا۔ گاڑی میں بیٹھی اور اماں کے گھر آئی۔ اس وقت وہ خوش تھی اور چاہتی تھی لوگ اس کی خوشی میں شامل ہوں۔ چہک چہک کر اس نے اماں کو یہ خوشی کی خبر سنائی۔

بڑی آپا تو انگلینڈ چلی گئی تھیں۔ بھائی کینیڈا تھا اور بڑا بھائی امریکہ جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ بہن سے ملا۔ بچی کو پیار کیا اور جانا کہ بچی کونونٹ میں داخل ہوئی ہے۔ وہ خاموشی سے بیٹھا اُن مشکلات کا ذکر سنتا رہا جو داخلے کے سلسلے میں آئی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

''تم نے اسے قرآن پاک پڑھانے کا بھی کوئی بندوبست کیا ہے؟''

''بڑی بھیا! ابھی تو یہ بہت چھوٹی ہے۔ اتنی سی عمر میں اس پر دو تین زبانوں کا بوجھ ٹھیک نہیں رہے گا۔''

''انگریزی کا بوجھ نہیں ہوگا؟'' بڑے بھیا کب چوکنے والے تھے۔

''اس کی تو خیر عادی سی ہوگئی ہے۔''

''انگریزی اور بائبل پڑھانا تمہیں منظور ہے لیکن اپنی کتاب کے لئے تمہارے

پاس کوئی جذبہ نہیں؟''

اماں مسکین سی شکل بنائے پاس بیٹھی تھیں۔کس حسرت سے بولی تھیں۔

''میرے بچے بولنا سیکھتے تو یہی خواہش ہوتی کہ وہ سب سے پہلے اللہ کہیں۔ بہت چھوٹی عمروں میں میرے بچوں نے قرآن پاک پڑھ لیا تھا۔گو غریبی بھی بہت تھی پر اپنا زیور بیچ بیچ کر میں نے ان کی آمین کی۔''

بڑے بھائی کا لحاظ تھا ورنہ اُس کا تو جی چاہا پلٹ کر اماں کو سنائے۔بہت عقلمندی کے کام کیے۔ایسی فضول خرچیوں میں زیور جیسی چیزوں کو ضائع کیا۔بیٹی کو بیاہا تو ایک چھلّہ بھی نہ پہنا سکیں۔

گھر لوٹی تو بڑی بددل تھی۔

''کیسے کم ظرف ہیں یہ میرے خون کے ناطے۔جی جلانے والی باتیں کرتے ہیں۔''

شوہر گھر آیا اسے کچھ افسردہ پایا۔پوچھا وہ جیسے بھری بیٹھی تھی۔پھٹ پڑی۔

''ارے بیوقوف دل چھوٹا کرتی ہو۔ہر انسان کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔قرآن پاک بھی ضرور پڑھائیں گے مگر ذرا بڑی ہو جائے۔تھوڑا سا شعور آجائے۔''

بڑی ہونے اور شعور آنے والی بات کب تھی وہاں؟ ان کی مصروف زندگی کا ایک ایک لمحہ مخصوص تھا۔وہ ایریا منیجر (Area Manager) سے زونل منیجر (Zonal Manager) اور اب کنٹری منیجر (Country Manager) ہو گیا تھا۔

بچوں کی سکولنگ، ٹیوشنز، پارٹیاں۔اور وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہو رہی تھی۔بیٹی پر اعتماد ہی نہیں بے باک بھی تھی۔زبیر کا چچیرا بھائی اور اس کے بیٹے کینیڈا سے آئے۔ان کے پاس بھی پندرہ بیس دن ٹھہرے۔اسماء کی دو نیرا زبیر اور احسن زبیر کسی طور پر

بھی ان بچوں سے کم نہ تھے۔ دونوں میاں بیوی نے تعجب سے اسماء کو دیکھا اور بولی۔

''تمہارے بچے بہت جینئس لگتے ہیں۔ بہت خوش قسمت ماں ہو۔''

اور اسماء بے نیازی سے مسکرائی۔ اپنی گردن کو دائیں طرف بل دیتے ہوئے بولی۔

''بہت محنت کی ہے میں نے، بہت پاپڑ بیل رہی ہوں۔''

مسز اقبال نے اسماء سے کہا۔

''وہ نیرا سینئر کیمرج کر لے تو اسے ہمارے پاس کینیڈا بھیجنا۔''

''احسن کو بھی بھیج دوں گی زندگی بن جائے گی۔''

اب وہ گھسن گھیریوں میں پڑ گئی تھی کہ بچوں کو باہر بھیجنا ہے۔ زبیر خلاف تھا۔ وہ اکثر کہتا۔

''اسماء میری مانوں بچوں کے لئے وہاں کا ماحول ٹھیک نہیں۔ بے جا آزادی خراب کر دیتی ہے۔''

مگر اس پر بھوت سوار تھا۔ بڑے بھیا اور آپا دونوں ہائر سرجری میں سپیشلائیزیشن Specialization کر کے آ گئے تھے۔ دونوں کی شادیاں ڈاکٹر بہن بھائی سے ہوگئی تھیں۔ بڑی آپا کے شوہر ڈاکٹر شبیر اور ان کی بہن ڈاکٹر تمکین ان ہی کی طرح کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ باریش تھے۔ نماز روزے کے سختی سے پابند۔ یورپ میں بھی اپنے دینی عقائد کی سختی سے پابندی کرتے رہے تھے۔ وہ بڑا ہنستی تھی انہیں دیکھ کر۔ میاں سے بولی۔

''واہ بڑی آپا نے شادی بھی کی تو کس کنوئیں کے مینڈک سے۔''

دو نیرا کا باہر جانے کا چکر چلا تو بہن بھائیوں نے بہت سمجھایا۔ دلائل دیئے مگر اس

نے ایک نہ سنی۔

''میرے بچے بہت جینئس ہیں۔'' دو نیرا کے سال بعد اس نے احسن کو بھی باہر بھیج دیا۔

بہت خوش تھی۔ بڑا فخر اور غرور ہوتا لہجے میں میں جب باتی کرتی۔

''میرے بچے یورپ میں پڑھ رہے ہیں۔ دفع کرو یہاں کوئی سٹینڈرڈ ہے۔ ٹٹ پونجیے سکول اور ویسے ہی اُستاد۔''

شروع شروع میں بچے سال بعد پاکستان چھٹیوں میں آتے۔ دو ماہ رہتے اور چلے جاتے مگر آہستہ آہستہ ان کا آنا کم ہو رہا تھا۔ وہ وہاں کے ماحول میں پوری طرح رچ بس گئے تھے۔ بیٹا تو پیسوں کے چکر میں پھنس گیا تھا اور دو نیرا مسز اقبال کی آخری اطلاع کے مطابق امریکہ چلی گئی تھی وہ کہاں تھی؟ اُس کا اُسے کوئی علم نہیں تھا۔

اور وہ بڑے سے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ سارا فخر و غرور، احساسِ ندامت اور پچھتاوے میں بدل گیا تھا۔ بہن بھائیوں کے گھر جاتی تو ایسا سکون بھرا ماحول دیکھنے میں آتا کہ اس کے کلیجے پر چھریاں چلنے لگتیں۔ بڑی آپا اور بڑے بھیا کے بچے ایسے مؤدب سلجھے ہوئے، نماز روزے کے پابند انہیں دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آتیں۔

''میں نے تو اپنے اچھے بھلے نشیمن کو آگ میں جھونک کر رکھ دیا۔ اللہ! ہم اپنے راستوں کو بدل کر اپنے اوپر جدید تہذیب کے نئے چولے چڑھا کر سکھی نہیں رہ سکتے۔''

وہ گھر کی دیواروں اور پیل پایوں سے لپٹ لپٹ کر روتی اور بین کرتی۔

☆☆☆

قسمت کی خوبی دیکھیے

اب وہ کیا کسی کنوئیں میں چھلانگ مارے۔ سنکھیا پھانک لے یا گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر مر جائے۔ آخر وہ کیا کرے۔ اب اگر گھر میں تھوک کے حساب سے لڑکیاں تھیں تو اِس میں اُس کا کیا قصور؟ اُس نے بہتیرا واویلا کیا تھا کہ بس اللہ میاں نے جو بھول کر ایک بیٹا دے دیا ہے تو بس اسی پر قانع رہو۔ جوڑی ملانے کے شوق میں بیٹیوں کا ڈھیر نہ کرتے جاؤ۔ مگر میاں ایک ہٹ دھرم اور ضدی۔

''لو'' وہ تنتنا کر کہتا۔

''ہم نے کون سے اللہ میاں کے مانہہ مارے ہیں۔ جو ہمیں بیٹا نہیں دے گا۔''

ہر بار بیٹی ہوتی اور ہر بار وہ پرامید ہو کر کہتا۔

''ارے گھبراؤ نہیں بھاگوان۔ وہ بیٹا ضرور دے گا۔''

اور اُس نے بیٹا دیا ضرور مگر جوڑی ملنے میں سات لڑکیاں بھی گھر میں وارد ہو گئیں۔ جیسے تیسے کر کے پل پلا گئیں۔ پڑھ لکھ بھی گئیں۔ دونوں بڑی لڑکیوں نے بی اے بی ایڈ کر لیا تھا۔ ایک کو ملازمت مل گئی تھی ایک دوسری ابھی کوشش کر رہی تھی۔ باقی بچے مختلف

مدارج میں پڑھ رہے تھی۔ گھر میں ہمیشہ ہی لڑائی جھگڑا رہا۔ پہلے اخراجات کے پورا نہ پڑنے کا رونا رہتا تھا۔ اب اس رونے میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ دونوں لڑکے اور ساتوں لڑکیاں بڑی ذمہ دار اور حساس ثابت ہوئی تھیں۔ لڑکے ایک لائبریری میں پارٹ ٹائم کام کرتے تھے۔ لڑکیاں محلے اور اِردگرد کی لڑکیوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت سلائی کا کام بھی کر لیتیں۔ یوں گھر میں اضافی آمدنی سے صورت حال کافی بدل گئی تھی۔ مگر اب گھر کے سربراہ کو لڑکیوں کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی وہ بیوی پر اُلجھتا۔

''سارا دن گھر کے کاموں میں جتی رہتی ہو۔ باہر نکلا کرو۔ لوگوں سے ملاقات بھی رکھو۔ رشتے ناطے ایسے نہیں ہوتے۔''

''جب اللہ کو منظور ہو گا۔ آپی آپ سب کچھ ہو جائے گا۔ میرے تیرے گھبرانے سے کچھ نہیں ہو گا۔''

وہ کام میں جتی ہوتی۔ اک پل رک کر شوہر کو جواب دیتی اور پھر کام میں لگ جاتی۔ اُس کے اتنے بے نیازی سے جواب دینے پر وہ تلملا جاتا۔ غصے سے بولتا۔

''ہاں ہاں کوئی کام مت کرو۔ اللہ مالک ہے۔ چارپائی پر لیٹ جاؤ تمہارے منہ میں اپنے آپ لقمے ڈلتے جائیں گے۔''

وہ شوہر کی اِس بات کا کوئی جواب نہ دیتی۔ بحث اور لڑائی کے دروازے کو بند کر دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی۔ مگر اب ایسی باتیں معمول بنتی جا رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ نرمی اور پیار سے کہتا۔

''بھاگوان میری بات سمجھا کرو۔ دیکھو زمانہ خراب ہے۔ بیٹیاں عزت آبرو سے دروازے سے اُٹھ جائیں تو اسی میں نیک نامی ہے۔''

''وہ تو میں سمجھتی ہوں مگر تم ہی بتاؤ کہ کیا کروں؟ خاندان تمہارے سامنے ہے۔

کوئی ڈھنگ کا لڑکا نہیں۔اب کس کے سامنے جھولیاں پھیلاؤں کے میری لڑکیاں لے لو۔تم یہ لڑائی جھگڑا مت کیا کرو۔کوئی تمہارے اوپر بوجھ ہے۔اپنا کماتی ہیں، جو کمانے کے قابل نہیں وہ بھی ہمت سے ہاتھ پلہ مارتی ہیں اور تھوڑا بہت سہارا بنی ہوئی ہیں۔"

"نیک بخت میں بیٹیوں کی کمائی کھانا نہیں چاہتا۔مناسب وقت پر انہیں وداع کر دینا چاہتا ہوں۔تم عورت ہو۔لوگوں سے کہو سنو۔"

دونوں بڑی بیٹیاں سمجھدار تھیں۔چھوٹے سے گھر میں ہونے والی باتیں ان سے کب مخفی تھیں؟ یہ بحث مباحثہ سن کر ایک دوسرے سے کہتیں۔

"ابا بھی کیسے درویش آدمی ہیں۔وہ بے چاری سیدھی سادی کہاں بر ڈھونڈتی پھرے۔آج کل مایہ کا زمانہ ہے۔جس کے پاس یہ نہیں اُس کی بیٹیاں کسے نظر آتی ہیں۔"

اور ایک دن وہ بڑی بیٹی کے سامنے پھٹ پڑی۔

"نمو! دیکھنا بیٹے خدا پر توکل ہونا چاہیے۔رشتے ناطے انسانی کاریگری سے نہیں اُس کی رضا سے طے پاتے ہیں۔کوشش شرط ہے۔میں یہ نہیں کہتی ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے خود ہی سارا معاملہ طے پا جائے گا۔پر میں بھی کیا کروں؟"

اور نعیمہ خان نے ماں کے چہرے پر برستی لاچاری اور بے بسی محسوس کرتے ہوئی دکھ اور تاسف سے سوچا۔

"یہ بیٹیاں بھی نرا عذاب ہیں۔"

مگر اپنے کرب کو چھپاتے ہوئے اُس نے ماں کے کندھے تسلی دہ انداز میں تھپتھپائے اور بولی۔

"اماں آپ کس لئے غم زدہ ہیں؟ اللہ کی ذات مسبب الاسباب ہے۔"

انہی دنوں نعیمہ کو ایک بڑے اچھے گھر میں میٹرک کی طالبہ لڑکی کو پڑھانے کی آفر

ہوئی۔لڑکی مقامی سکول میں پڑھتی تھی اور حساب میں بہت کمزور تھی۔نعیمہ کے سکول کی پرنسپل کے اس خاندان سے ذاتی مراسم تھے۔صبح صبح لڑکی کی والدہ نے فون پر بات کی اور اسی وقت نعیمہ خان کو آفس میں بلایا گیا۔نعیمہ ریاضی اور شماریات میں گریجوایٹ تھی اور اس مقصد کے لئے پرنسپل کو وہی موزوں نظر آئی تھی۔ساری بات سننے کے بعد نعیمہ سوچ میں پڑ گئی۔گھر جا کر کوچ کرنا اُسے ذاتی طور پر پسند نہ تھا۔اپنی اس ہچکچاہٹ کا اظہار اُس نے کیا تو پرنسپل نے فوراً کہا۔

''قطعی فکر نہ کرو۔بہت سلجھے ہوئے اور مہذب لوگ ہیں۔تمہیں مکمل تحفظ ملے گا۔بہت اچھی ٹیوشن فیس ہے۔یہ اضافی آمدنی تمہارے گھر کی خوشحالی کی طرف ایک خوش آئند قدم ہوگا۔گھبراؤ نہیں حوصلے سے حالات کا مقابلہ کرو۔''

اُس نے بھی سوچا چلو گھنٹہ ڈیڑھ وہاں صَرف کر دینے سے اگر ایک معقول رقم ہاتھ آئے تو کیا بُرا ہے؟ طاہر سے کہوں گی کہ وہ ٹیوشن کرنی چھوڑ دے اور دل لگا کر ایف ایس سی میں اچھے نمبر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اور اِس سوچ کے ساتھ ہی اُس نے حامی بھر لی۔پرنسپل نے فون پر اطلاع دی کہ بندوبست ہو گیا ہے ٹیوٹر کل سے آجائے گی۔اور نعیمہ کو گھر کا پتہ سمجھا دیا۔

گھر میں نعیمہ نے صرف ماں اور خود سے چھوٹی بہن سے بات کی۔ماں نے کسی قدر تشویش سے کہا۔

''بیٹی! بس دیکھ بھال لینا زمانہ اچھا نہیں۔غریبوں کے پاس عزت ہی ہوتی ہے۔''

اور نعیمہ نے جواباً ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اماں میں سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانے کی عادی ہوں۔''

اگلے دن سکول سے فارغ ہونے کے بعد اُسے لینے گاڑی آ گئی۔شہر تو بہت بڑا نہیں تھا پر اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا۔یہ جگہ سول لائنز کے قریب تھی۔بہت عالیشان کوٹھی تھی۔وہ گاڑی سے اُتری۔ملازمہ نے اندر کا راستہ دکھایا۔بڑا کمرہ جس میں داخل ہوئی گھر کی مالکہ کا نظر آتا تھا۔معمر عورت نے اُٹھ کر اُس کا استقبال کیا۔خیریت پوچھی۔تب پندرہ سولہ سال کی لڑکی نے آ کر اُسے سلام کیا اور ماں کو کھانا میز پر لگنے کی اطلاع دی۔

''یہ تمہاری شاگرد ہے۔نام ہے ربیعہ سرفراز۔''

لڑکی نے ایک بار پھر سلام کیا۔

''اچھا آؤ اب کھانا کھالیں۔''

پر نعیمہ کو عجیب سا محسوس ہو رہا تھا وہ اِن تکلفات میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ پڑھانے آئی۔کام ختم کیا اور چلی گئی۔مگر خاتونِ خانہ نے کچھ اِس محبت کا اظہار کیا تھا کہ انکار مناسب نہیں تھا۔

اور یہ تکلف ایک معمول بن رہا تھا۔اُس نے اِس پر احتجاج کیا تو خاتونِ خانہ نے محبت سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹی یہ بستے رستے لوگوں کا گھر ہے۔سکول سے آتی ہو۔خالی پیٹ ہوتی ہو۔ تمہاری ایک دو چپاتی کھا لینے سے میری کتنی بچت ہو جائے گی؟ایسی باتیں نہیں سوچتے۔''

اُس کی شاگرد ربیعہ سرفراز کافی کمزور تھی۔وہ اُسے بہت توجہ اور لگن سے پڑھاتی تھی۔کبھی کبھی وہ پڑھائی چھوڑ کر اُس سے اپنی گھریلو باتیں کرنے لگ جاتی۔تین بھائیوں کی وہ اکلوتی بہن تھی۔بڑا بھائی ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک کلینیکل لیبارٹری چلا رہا تھا۔اُس سے چھوٹا لیبارٹری کے ساتھ ایک میڈیکل سٹور کا مالک تھا۔اور تیسرا بھائی لاہور میں پڑھ رہا تھا۔باپ اکثر زمینوں پر رہتا تھا۔

''حیرت کی بات ہے۔'' نعیمہ نے اپنے آپ سے کہا۔

''کبھی کوئی مرد نظر نہیں پڑا۔''

نعیمہ سے ایک نمبر چھوٹی بہت باتونی تھی۔ دونوں کی کافی بے تکلفی تھی۔ نعیمہ اکثر ہی اُن کی باتیں اُس سے کیا کرتی۔

''ارے آپا تم کسی ایک کو پھانس لو نا۔ ایسا اچھا گھر گھرانہ تو مقدروں سے ملتا ہے۔ تم کسی اچھے ٹھکانے لگ جاؤ تو شاید ہماری بھی سنی جائے۔''

نعیمہ نے ایک دن دوہتڑ اُس کے شانے پر مارا اور بولی۔

''ایسے ارمان دل میں مت پالو۔ اپنی ہستی اور بساط سے اونچا اُڑنے والے خسارے میں رہتے ہیں۔ میں ایک پریکٹیکل لڑکی ہوں۔ اپنی حیثیت سے زیادہ نہیں سوچتی۔''

نعیمہ سکول سے اُن کی گاڑی میں پڑھانے آتی۔ مگر واپسی پر وہ ہمیشہ بس سے کرتی۔ خاتونِ خانہ نے جب اُس سے کہا کہ گاڑی اُسے گھر بھی چھوڑ آیا کرے گی تو اُس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ گلی میں رہتی ہے۔ اردگرد کے لوگ پڑھے لکھے نہیں۔ گاڑی میں جانے سے بہت سے افسانے اور کہانیاں بننے کے لئے راہ کھل جائے گی اور وہ ایسا نہیں چاہتی۔

پر ایک دن موسم ٹھیک نہیں تھا۔ سکول سے چلتے ہوئے نعیمہ نے آسمان کو دیکھا۔ جھومتے بادل آسمان کے سینے پر دندناتے پھرتے جیسے اعلان کر رہے تھے کہ بس ہم کسی دم دھرتی پر آیا چاہتے ہیں۔ نعیمہ نے تذبذب کا شکار ہوتے ہوئے سوچا۔

''آج جانا ٹھیک رہے گا؟ یا بس سٹاپ پر اُتر کر گھر کے لئے بس لے لوں؟''

مگر فرض کی ادائیگی کا خیال ہر تکلیف پر حاوی آ گیا۔

''نہیں۔'' وہ خود سے بولی۔

''ربیعہ اب کافی بہتر ہو رہی ہے نا نٹھیک نہیں۔اللہ مالک ہے۔''

جب تک وہ پڑھاتی رہی۔خیریت رہی مگر جب چلنے کے لئے تیار ہوئی تو بادل بہت گھنیرے ہو گئے۔

ربیعہ نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''پلیز نعیمہ آپا! اس وقت آپ کا اکیلے جانا قطعی مناسب نہیں۔ڈرائیور چلا گیا ہے مگر بڑے بھیا آج گھر پر ہیں۔میں انہیں آپ کو چھوڑ آنے کا کہہ آئی ہوں۔وہ پورچ میں گاڑی لئے آپ کے منتظر ہیں۔''

نعیمہ وہیں کرسی پر ڈھیر ہو کر بیٹھ گئی۔پہلی بار اُس نے رکھائی سے ربیعہ سے کہا۔

''تمہیں ایسا کرنے کو کس نے کہا تھا؟ بیوقوف لڑکی گاڑی سے اُترتے کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔ساری رکھی رکھائی پر پانی پھر جائے گا۔میرے تو والد کو بھی معلوم نہیں کہ میں یہاں پڑھانے آتی ہوں۔ہمارا محلّہ تو سازشی اور حسد سے بھرے ہوئے لوگوں کا ہے۔جنہیں کسی کی بہو بیٹی کی عزت اُچھالتے ہوئے ذرا بھی خوفِ خدا محسوس نہیں ہوتا۔''

اور سیاہ برقع اپنے چاروں طرف اچھی طرح لپیٹتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔پورچ میں کھڑی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک دلکش نوجوان پر اُس کی ایک اچٹتی سی نظر ضرور پڑی۔ اور دوسری بار اسے آنکھیں اٹھانے کی جرات نہ ہوئی۔

عرفان نے اُس کے گیٹ سے نکل جانے کے بعد بہن سے پوچھا اور وہ کچھ کچھ شرمسار سی بولی۔

''اصل میں بھیا! اماں ہوتی تو شاید مان ہی جاتیں۔لوگوں سے بہت ڈرتی

ہیں۔"

اور عرفان نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔اسی طرح گاڑی میں بیٹھا رہا اور پھر تھوڑی دیر بعد باہر چلا گیا۔بہت تیز بارش شروع ہوگئی تھی۔

"بھیگ گئی ہوگی۔بری طرح بھیگ گئی ہوگی۔" اُس نے ونڈسکرین پر ایک ہاتھ کپڑا مارتے ہوئے کہا۔کیسا چاند سا چہرہ تھا۔

اب وہ لاکھ بھی بڑی پریکٹیکل ہونے کا دعویٰ کرتی تھی مگر تھی تو ایک عورت، گوشت پوست کی ایک عورت، جذبات واحساس رکھنے والے عورت، رات کو سونے کے لئے لیٹی تو کئی بار وہ چہرہ آنکھوں کے سامنے آیا جس پر ایک اچٹتی سی نظر ہی پڑی تھی۔

"میں نے اچھا نہیں کیا۔" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

کچھ دیر وہ اسی پر سوچتی رہی۔مگر پھر وہ خود ہی یہ سوچتے ہوئی مطمئن ہوگئی کہ میں نے غلط نہیں کیا۔تکلیف اٹھائی مگر جان کو سولی پر تو نہیں چڑھایا۔سارا وقت یہی سوچ جان کو کھا جاتی کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

اگلی صبح چھٹی تھی۔مطلع صاف تھا۔ابا باہر گلی میں کرسی بچھا کر بیٹھ گئے۔گلی کے آخری کونے والے گھر میں شادی تھی۔پتہ نہیں کون لوگ تھے؟ اُن لوگوں کا محلے کے عام گھروں میں آنا جانا بہت کم تھا۔بارات آرہی تھی۔ڈھول ڈھمکوں اور باجوں کا بہت شور تھا۔

نعیمہ کو ماں نے تین چار آوازیں دے ڈالیں کہ آؤ چائے تیار ہے۔پی لو۔

وہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔اسے ویسے ہی چھوڑ کر نیچے آئی۔ثمینہ کو بھی چائے پینے کے لئے آواز دی۔اور پھر جیسے ہی اُسے یاد آیا کہ وہ ابا کو بھی بلا لے۔وہ بھی ایک کپ لے لیں۔ڈیوڑھی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کر سامنے بیٹھے اپنے باپ کو دیکھا۔اُسے محسوس ہوا اُس

کا باپ بارات کے نظارے میں گم ہے۔اُس کے چہرے پر دکھ اور حزن کے سائے ہیں۔ نعیمہ کا دل کٹ گیا۔

اللہ! میرا باپ ہماری وجہ سے پریشان ہے۔خدایا اِس کی مشکل آسان کر۔پہلی بار نعیمہ کے دل سے دعا نکلی۔اُس کی آنکھوں میں احساس کی شدت نے جو نمی بھر دی تھی وہ اُس نے دائیں ہاتھ کے پوروں سے صاف کی اور اپنے آپ کو آواز دے ڈالی۔

چائے پینے کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ابا اور اماں کے درمیان وہی پرانا مسئلہ پھر چھڑ گیا۔ابا کا خیال تھا کہ وہ گیلے گوبر کی طرح بیٹھی ہوئی ہے۔ہلتی جلتی نہیں۔حرکت میں برکت ہے۔کسی سے کہے کسی سے سنے۔رشتے ناطے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اماں بڑی جز بز ہوئیں۔بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے اُٹھ گئیں۔اگلے دن نعیمہ اُن کے گھر جاتے ہوئے کچھ خجالت کا شکار تھی۔ربیعہ نے ملتے ہی پوچھا۔

''آپ بتایئے کتنا بھیگیں؟''

''کچھ زیادہ نہیں ربیعہ۔''

''میں ڈرتی تھی کہ سردیاں ہیں آپ بھیگ گئیں تو کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔''

اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''تم نے مجھے اتنا نازک سمجھ لیا ہے۔یہ جان بڑی سخت ہے۔''

اُس نے اپنے وجود پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''لگتی تو نہیں۔بس کانچ کے شیشے کا احساس ہوتا ہے۔''

''لو۔'' نعیمہ مسکرائی۔

''تمہیں تو شاعری سے بھی لگاؤ لگتا ہے۔''

ایک دن ربیعہ نے پڑھتے پڑھتے اچانک رُک کہا۔

''نعیمہ آپا بڑے بھیا اور منجھلے بھیا کی شادیاں ہونے والی ہیں۔آپ نے بھی بارات کے ساتھ چلنا ہے۔تیاری رکھیں۔''

اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا اور پوچھا۔

''کہاں شادی کر رہے ہو؟ منگنی وگنی نہیں کی؟ یا چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہے؟''

ربیعہ نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ ربیعہ کی والدہ اندر آگئیں۔وہ رات ہی گاؤں سے لوٹی تھیں۔نعیمہ نے اُنہیں بیٹوں کی شادیاں طے پانے کی مبارکباد دی۔خندہ پیشانی سے اُنہوں نے مبارک قبول کی اور اُسے بتایا کہ بات تو تقریباً دو تین سال سے طے تھی۔ربیعہ کے والد کے دوست کی بیٹیاں ہیں۔۔۔ہاں۔۔۔جیسے اُنہیں کچھ یاد آیا۔

''تمہارے گھر سے کچھ ہی دور جونئی کالونی بنی ہے وہیں اُن کی کوٹھی ہے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔پھر وہ ذرا دھیمی آواز میں بولیں۔

''میں کچھ اتنی رضامند نہیں تھی۔لڑکیوں کی ماں بہت ہوچھی سی لگتی ہے۔مگر اِن کے ابا کی بڑی دوستی ہے۔لہٰذا میں نے بہت مخالفت نہیں کی۔لڑکیوں کا بھائی باہر گیا ہوا تھا۔اب آیا ہے تو شادی کے لئے اُن لوگوں نے زور ڈال دیا ہے۔میں نے ابھی تک کوئی تیاری نہیں کی۔''

نعیمہ نے ذرا ہنستے ہوئے کہا۔

''بری بنانا کون سا مشکل کام ہے؟ آج کل تو ہر چیز تیار مل جاتی ہے۔''

اور اُنہوں نے نعیمہ سے کہا۔

''نعیمہ تم مجھے ربیعہ کی طرح ہی عزیز ہو۔میں چاہتی ہوں اس کام میں تم میرا ہاتھ بٹاؤ۔''

''ضرور۔۔۔مجھ سے جو کچھ ہوگا ضرور کروں گی۔ بلکہ میری چھوٹی بہن سلائی کڑھائی کے کاموں میں کافی ماہر ہے وہ بھی کافی مدد کرے گی۔''

گھر واپس آتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

''اللہ کا کتنا احسان ہے جو میں نے خواب نہیں بنے۔اب انا کا تار تار ٹوٹتا تو کتنا دکھ ہوتا۔ہمارے ماحول کی لڑکیوں کو جذبات سے نہیں عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ زندگی جو پہلے ہی ان کے لئے بوجھل ہوتی ہے مزید بوجھل نہ بنے۔''

اگلے روز وہ زرتار دو پٹے اور دو جوڑے گوٹا کناری لگانے کے لئے گھر لائی۔ ثمینہ کی گود میں ڈالتے ہوئے اُس نے کہا۔

''ربیعہ کے بھائیوں کی شادیاں ہیں۔ذرا خوبصورتی سے لگانا۔''

اور ثمینہ بھونچکی سی اُسے دیکھنے لگی۔شاید وہ کسی معجزے کی منتظر تھی۔

نعیمہ نے اُس کی آنکھوں کا مفہوم سمجھا اور اُس کے سر پر چپت مارتے ہوئے بولی۔

''ثمینہ تو پاگل ہے جو اَن ہونی باتوں کی توقع کرتی ہو۔''

بڑی ہی سہانی شام تھی۔دونوں بہنیں اوپر چھت پر بیٹھی تھیں۔ثمینہ سنہری کامدار اور دوپٹوں پر کرن لپہ لگا کر فارغ ہوئی تھی۔نعیمہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا سوچ رہی تھی۔جب ثمینہ نے اچانک دوپٹہ اُس کے سر اور شانوں پر پھیلا دیا۔وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔اِس اچانک حملے سے گھبرا گئی۔تلخی سے بولی۔

''بیوقوف کیا کرتی ہو؟ دوپٹہ خراب ہو جائے گا۔''

''تم سے زیادہ خوبصورت تو نہیں ہوگی وہ جس نے اِسے اوڑھنا ہے۔ارے پلیز نعو آپا! دو منٹ کے لئے ایسے ہی بیٹھو نا۔میں ذرا شیشہ لاؤں۔دیکھو تو کتنی خوبصورت لگ

رہی ہو؟''

اور پتہ نہیں اُس کے جی میں بھی کیا ہڑک اُٹھی کہ وہ بھی ویسے ہی بیٹھی رہی ۔ثمینہ بھاگ کر شیشہ لے آئی اور اُس نے جھینپتے ہوئے اپنے عکس کو دیکھا۔ وہ کیسی خوبصورت لگ رہی تھی کہ اُسے اپنے آپ پر خود ہی پیار آیا۔ پر ثمینہ سامنے تھی اور ثمینہ منہ پھٹ اور بد ملابات کہہ دینے والی لڑکی تھی ۔اِس لئے اُس نے مزید اپنا نظارہ کرنا پسند نہ کیا اور دوپٹہ آہستگی سے اُتارتے ہوئے کہا۔

''لو اِسے احتیاط سے تہہ لگا کر رکھ دو۔''

اُس وقت سورج ڈوب گیا تھا اور ثمینہ آسمان کی لامحدود وسعتوں کو دیکھنے لگی۔ پرندوں کے غول گھروں کو جا رہے تھے ۔مغربی اُفق پر شفق پھولی ہوئی تھی۔ آسمان مٹیالا سا ہو رہا تھا۔

''اللہ میاں جی ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ دونوں دوپٹے ہم دونوں بہنیں اوڑھ لیں۔''

نعیمہ نے اُس کے مسکراتے ہونٹوں سے یہ جملے سنے اور ہنس پڑی۔مگر اس نے بہن کو کچھ نہیں کہا۔

''چلو نماز کا وقت تنگ ہو جائے گا۔''

دونوں نے نماز پڑھی اور وہیں چھت پر ہی لیٹ گئیں ۔دس بجے کے قریب اماں اوپر آئیں ۔دونوں بہنوں کو برساتی میں سوئے دیکھا۔ رضائیاں اُن پر دیں اور نیچے آ گئی۔ صبح جلدی جلدی تیار ہو کر سکول چلی گئی۔ ڈیڑھ بجے فارغ ہوئی ۔باہر دیکھا تو گاڑی نہیں تھی ۔سٹاف روم میں آ بیٹھی کہ شاید لیٹ ہو۔ گھنٹہ بھر انتظار کے بعد بھی جب گاڑی نہیں آئی تو اس نے سوچا آج پڑھنے کا موڈ نہیں شاید ۔ماں بیٹی کہیں شاپنگ کے لئے گئی ہوئی ہوں۔ ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گاڑی خراب ہو۔ سوچا بس یا تانگے سے چلی جاؤں ہوسکتا

ہے گاڑی خراب ہو۔ پہلے بھی کبھی کبھی ایسا ہو جایا کرتا تھا۔اور اسی سوچ کے تحت وہ نکل کھڑی ہوئی۔۔۔کوٹھی پہنچی۔ربیعہ کے کمرے میں آئی تو وہاں وہ نہیں تھی۔اس نے برقع اتارا اور صوفے پر بیٹھ گئی کہ عین اسی وقت نوکر چائے کی ٹرالی گھسیٹتا ہوا اندر آ گیا۔اس نے پوچھا۔

''ربیعہ کدھر غائب ہے؟''

''چھوٹی بی بی بس آ رہی ہیں آپ ذرا چائے پی لیں۔''

اُس نے ٹرالی کو اپنے سامنے کیا۔چائے بنائی۔کباب اور چکن سینڈوچ پلیٹوں میں رکھے تھے۔ایک کباب اور ایک چکن سینڈوچ کھا کر اس نے ایک کپ چائے پی اور ٹرالی کو پرے دھکیل دیا۔دوپٹے لفافوں میں بڑی احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔یونہی اُس نے ایک دوپٹہ نکال کر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا اور اس پر کئے گئے کام پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگی۔جب اچانک ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔۔۔اُس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ربیعہ کا بڑا بھائی دروازے میں کھڑا اس سے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ اس نے حیرت سے دیکھا اور آہستگی سے بولی۔

''آ جایئے!''

وہ آیا اور قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔نعیمہ نگاہ جھکائے حیران پریشان بیٹھی سوچ رہی تھی۔یا الٰہی خیر ہو۔اسے مجھ سے کیا کام ہے؟

''آپ کو شاید معلوم نہیں کہ امی جان اور ربیعہ لڑکی والوں کی طرف گئی ہوئی ہیں۔ کل رات میرے والد اور والدہ کو ان لوگوں نے بلایا تھا۔حق مہر اور جیب خرچ وغیرہ طے کرنے کے لئے۔ان لوگوں نے ایک لاکھ روپیہ حق مہر اور ہزار روپیہ جیب خرچ کے لئے کہا جس پر میرے والد نے کہا کہ ہم شرعی حق مہر کے حامی ہیں۔رہی بات جیب خرچ کی تو سبھی کچھ اُن بچوں کا ہی ہے۔شرفا میں یہ باتیں بنیاد نہیں بنتیں۔مگر ان کی یہ صاف اور کھری

باتیں انہیں پسند نہیں آئیں۔لڑکیوں کی ماں نے کہا۔ایسے بھوکے ننگوں کے ہاں تو میں اپنی بیٹیاں دینے سے رہی۔"

"مس نعیمہ! میں نے بہت جسارت کی ہے۔ہوسکتا ہے آپ اسے پسند نہ کریں۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جذبوں سے مجبور ہو جاتا ہے کہ میرے خیال میں جب سے اس گھر میں آپ کی آمدورفت ہوئی ہے۔ میں آپ کو پسند کرتا چلا آرہا ہوں کہنا کچھ اتنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ میں جذبات کو اظہار دینا نہیں چاہتا تھا مگر حالات جس موڑ پر آ رہے ہیں اس میں یہ ضروری تھا کہ آپ سے بات کی جائے۔

شاید یہ بھی میرا جذبہ صادق تھا کہ ان رشتوں میں توڑ پھوڑ شروع ہوگئی ہے۔ رات میں نے واضح طور پر امی جی سے کہہ دیا ہے کہ اب مصالحت کی کوئی کوشش نہ کی جائے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری یہ پسند یک طرفہ ہے۔مگر حالات کے اس موڑ پر میں نے آپ سے بات کرنا ضرور خیال کیا کہ یہ جان سکوں کہ آپ کہیں اور وابستگی تو نہیں رکھتیں یا آپ لوگوں کے مطالبات اتنے اونچے تو نہیں؟"

نعیمہ کا چہرہ فرطِ حیا سے سرخ تھا۔آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ایسی صورت حال کا سامنا کرنے کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔اُس کے لبوں پر مہرِ سکوت تھی۔

"آپ کچھ بتائیے۔میں نے سادگی سے اپنا آپ کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔"

اور کتنی مشکل سے اُس نے نگاہیں اُٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے اس دلکش نوجوان کو دیکھا جو اسے اونچی شے نظر آیا تھا اور جس کے بارے میں وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی کہ اُسے زمین پر گرنا سخت ناپسند تھا۔اور اب کوئی اُسے بہت اونچا اڑانے کا خواہش مند تھا۔اُسکی

آواز بھرا گئی جب اُس نے کہا۔

''میں نے خواب نہیں دیکھے میری عمر نے ایسا کرنا چاہا بھی تو میں نے انہیں بکھیر دیا۔وابستگی تو خیر بہت بڑی بات ہے میں نے کبھی کسی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔رہے ہمارے مطالبات۔سات بیٹیوں کے باپ کو تو انہیں اپنے دروازے سے اٹھانے کی پڑی ہے۔اس بے چارے نے کیا مطالبات پیش کرنے ہیں۔''

اور جیسے سکھ کا بہت لمبا سانس عرفان نے بھرا۔اس کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں آپ نے میری اس حرکت کا برا تو نہیں منایا۔''

اور نعیمہ نے دھیرے سے نگاہیں اٹھائیں اُسے دیکھا اور نگاہوں کو جھکا لیا۔قوس وقزح جیسے حسین رنگ اس کے چہرے اور آنکھوں میں بکھرے ہوئے تھے۔وہ سرشار سا ہو گیا اٹھتے ہوئے بولا۔

''آپ کو ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔امی جان اور ربیعہ معلوم نہیں کب تک آئیں؟وہ کچھ چیزیں لڑکی والوں کو واپس کرنے گئی ہیں۔اور ہاں سنیے آپ آج گاڑی میں جائیں گی۔''

وہ باہر نکل گیا۔پردہ ہلنے لگا۔نعیمہ نگاہیں پردے پر جمائے سوچ رہی تھی پل بھر میں یہ کیسا انقلاب آ گیا ہے؟ثمینہ کی دعا اتنی جلد قبول ہو گئی۔دوپٹوں کو ایک بار پھر اُس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا۔واقعی یہ ہمارے لئے ہی بنے ہیں۔وہ کھلی آنکھوں سے زندگی میں پہلی بار خواب دیکھ رہی تھی۔خوبصورت مہکتے ہوئے خواب۔

تبھی ڈرائیور نے آواز دی اور وہ برقع پہن کر گھر کے لئے چل دی۔

اُس نے عرفان کی بات مانی مگر گھر سے کافی دور وہ گاڑی سے اُتر گئی۔آج اُسے

بھوک نہیں تھی وہ چپ چاپ کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔اماں کو اس کے آنے کا پتہ چلا تو بھاگی بھاگی آئیں۔

''کیوں کیا بات ہے نمو بیٹے؟ کھانا نہیں کھاؤ گی؟''

''ٹھہر کر اماں۔میں نے چائے پی لی تھی۔''

وہ ساری رات اُس نے کچھ سوتے اور کچھ جاگتے گزاری۔عجب سے وہم اس کے دماغ پر یورش کرتے رہے۔یہ نہ ہوا وہ ہو گیا۔وہ نہ ہوا یہ ہو گیا وغیرہ۔

''اللہ اب مجھے خوشیاں دینا تیرے اختیار میں ہے۔''

اُس نے بے اختیار دعا کی۔

صبح اُس نے ناشتہ بھی ہلکا سا کیا۔سکول میں گم سم سی رہی۔ساتھی ٹیچرز نے پوچھا بھی اُس نے ٹال دیا۔چھٹی ہوئی۔ربیعہ کے گھر وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔سیدھی اپنے گھر آئی۔

اندر داخل ہوئی تو اسے محسوس ہوا۔جیسے گھر گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا ہے۔سب کے چہروں پر مسکراہٹ ہے،سب کی آنکھوں میں چمک ہے۔

''کیا بات ہے آج؟'' اس نے برقع اتارتے ہوئے پوچھا۔

''بہت خوشی کی خبر ہے۔'' تیسرے نمبر کی بہن نے کہا۔

''ایسی کیا ہفت اقلیم مل گئی ہے۔'' وہ بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بنی۔تبھی بیٹھک میں سے ابا نکلے۔وہ بھی بہت خوش وخرم نظر آئے۔

''بیٹا تم منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھالو۔بھوک لگ رہی ہو گی۔''

وہ کچن میں آئی۔یہاں ثمینہ کھانا گرم کرنے میں مصروف تھی۔وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

''تم لوگ کچھ میرے پلے بھی ڈالو گے۔ یا اکیلے اکیلے ہی خوش ہوتے جاؤ گے۔''

''سب کچھ پڑ جائے گا پہلے کھانا۔''

''نہیں پہلے بات بتاؤ گی۔'' اُس کے لبوں پر بھی بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔اور ثمینہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''نمو آپا! بات پتہ چل گئی نا تو آپ سے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔''

''تمہیں اللہ کی قسم میرے شوق کو اتنی ہوا مت دو۔''

''آپ مجھے یہ بتائیں کہ دعائیں کبھی اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں؟''

''تم مجھے بتاتی کیوں نہیں؟ پہیلیاں بجھواتے جاتی ہو۔''

نعیمہ نے بیلنا ہاتھ میں مارنے کے لئے اُٹھالیا۔

''ارے بتاتی ہوں نمو آپا! آپ غصے میں آ گئیں۔بس سمجھ لیجئے کہ پرسوں رات جو میں نے دعا مانگی تھی وہ اللہ میاں نے بہت قریب ہو کر سن لی ہے۔''

''خدا کے لئے ثمینہ صاف بات کرو۔'' نعیمہ تلملائی۔

اور اب ثمینہ نے بھی اندازہ لگالیا کہ اسے مزید تنگ کرنا مناسب نہیں۔

''ربیعہ کے والد اور والدہ آج صبح کوئی دس بجے کے قریب آئے۔اماں سے انہوں نے ساری بات کی۔گھر میں اس وقت طاہر موجود تھا۔اسے بھیج کر ابا کو بلوایا گیا۔ سارے حالات سے ابا آگاہ ہوئے اب ذرا تفصیل بھی سن لیں اور ثمینہ نے وہ ساری تفصیل الف سے ے تک نعیمہ کو سنا دی جو عرفان نے نعیمہ کو بتائی تھی۔عرفان کے والد نے دوٹوک انداز میں کہا کہ یہ شادی ہی یا کاروبار۔جب بیٹیاں لے کر جا رہے ہیں تو سب کچھ انہی لوگوں کا ہے۔وہ تو بڑے رکھ رکھاؤ اور وضع دار لوگ ہیں۔ان کے خاندان میں آج تک ایسی

ایک مثال نہیں۔

مگر جب وہاں اپنی باتوں پر اصرار رہا تو ربیعہ کے والد نے کہا۔تو پھر ہم یہ رشتے توڑنے پر مجبور ہیں۔وہ لوگ صبح ہمارے ہاں آئے اور نمو آپا اندھے کو کیا چاہیے تھا دو آنکھیں جواُسے بیٹھے بٹھائے مل رہی تھیں۔سب کچھ طے پا گیا اور مقررہ تاریخ پر آپ کا اور میرا نکاح ہو جائے گا اور وہی دوپٹے آپ اور میں اوڑھیں گے۔"

کھانا نعیمہ کے آگے پڑا تھا اور اس کا ذہن بس یہی بات سوچے جا رہا تھا۔

"اللہ۔میں اتنی خوش قسمت ہوں؟"

☆☆☆

نئی بیٹی

اس کی زندگی تقدیر کے ہاتھوں کھلونا تھی۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا کانٹوں بھرے پودے کی مانند تھے جس ٹہنی کی سمت ہاتھ بڑھا تیز اور نوکیلے کانٹے لپک کر دوڑے اور پھول کی خواہش کو لہولہان کر گئے۔

بہت چھوٹی سی تھی کہ ماں کو ہیضے نے نگل لیا۔ اوپر تلے کے پانچ بہن بھائی تیرے میرے دروازوں پر ٹھوکریں کھانے کیلئے رہ گئے۔ باپ سدا کا نکھٹو تھا۔ کبھی ڈھنگ سے نہ کمایا اور نہ بچوں کو کھلایا۔ کسی چچی پھوپھی کے من میں مہر آئی تو ہاتھوں میں ٹکڑا تھما دیا۔ سارا دن گاؤں کے گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتی پھرتی۔ ذرا سیانی ہوئی تو نمبردار کے گھر کام کرنے لگ گئی۔ نمبردارنی اگر کچھ خدا خوفی کرتی تو اس کی اکلوتی بیٹی پنجے جھاڑ کر ماں کے پیچھے پڑ جاتی۔

پھر وہ بڑی ہوگئی۔ اس کا رنگ گورا تو نہیں تھا مگر جوانی کا اپنا رنگ تھا جو اس پر ٹوٹ کر آیا۔

چاروں لڑکے محنت مزدوری کے کاموں پر گئے ہوئے تھے۔ باپ گھر میں بیٹھا

رہتا۔اس نے گھر کی لپائی کی، جھاڑ جھنکار صاف کیا۔گاؤں کے چھپڑ سے چکنی مٹی نکال کر دیواروں کی لپائی کی اور چونے سے نہلایا۔اس کی توجہ سے گھر اچھا خاصا سج گیا۔

دُور کے ایک رشتے دار جو شہر میں جا بسے تھے۔اس کے باپ سے ملنے آئے تو اسے دیکھا۔گھر پر نظر ڈالی۔اس نظر میں ستائش تھی۔اس کے سلیقے کی داد تھی۔جہاندیدہ آنکھوں نے بھانپ لیا کہ گھر میں لعل چھپا ہوا ہے۔اسے حاصل کر لینا چاہیے۔دامنِ سوال بڑھایا تو مراد مل گئی۔لال جوڑے میں رُخصت کروا کر گھر لے آیا۔

بوڑھی ساس اور تین نندیں تھیں۔ایک دیور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور بارہ سال بڑا شوہر تھا۔

پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ جاتی۔بھینس دوہتی، دودھ بلوتی، آٹا گھوندھتی اور چارپائیوں پر دراز نیند میں دھت نندوں کو جگا کر کھانے کیلئے کہتی۔گھر صاف کرتی۔سب کے کپڑے دھوتی۔ہر ایک کے ناز اٹھاتی مگر اس ساری خدمت گزاری کا نندوں اور ساس پر کوئی اثر نہ تھا۔

''ارے بیٹے کیلئے یہ اٹھائی گیروں کی لڑکی رہ گئی تھی؟'' ساس چارپائی پر بیٹھی گوہر افشانی کرتی۔

شوہر اچھا تھا۔جب وہ کھانا کھانے بیٹھتا اور وہ اس کے پاس بیٹھ کر پنکھے سے ہوا کرتی تو وہ سامنے بیٹھی ماں کی نظروں سے بچ کر اسے دیکھتا اور دھیرے سے کہتا۔

''ماں کی باتوں سے گھبرایا مت کر۔ذرا ٹھیک نہیں رہتی ہے نا اسی لئے چڑچڑی ہو گی ہے۔''

اس ذرا سی بات پر اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں پر وہ امنڈتے پانی کو پیچھے لے جاتی کہ کہیں ان پر کسی کی نظر پڑ گئی تو اس کا فضیحتا ہو جائیگا۔اوپر تلے تین بیٹوں کے بعد ایک

لڑکی ہوئی ۔اس وقت تینوں نندوں کی شادی ہوچکی تھی ۔ساس مستقل بیمار رہنے لگی تھی ۔جوان دیور ایک حادثے میں جان گنوا بیٹھا تھا اور بوڑھا سسر جو اسے بہت چاؤ سے بیاہ کر لایا تھا۔اس کی خدمت اور توجہ کے باوجود بہت جلد اس دنیا سے چلا گیا۔

شوہر نے بے شمار بنجر اراضی پٹے پر حاصل کر لی تھی ۔جسے اپنی محنت و ہمت سے وہ آباد کر رہا تھا۔نیا گھر بن گیا تھا۔کمرے سامان اور اناج سے بھر گئے تھے ۔دولت کی ریل پیل شروع ہوگئی تھی ۔پھولدار چھینٹ کے سوٹوں کی بجائے وہ اب ریشمی کپڑے پہننے لگی تھی ۔ساس کا وہ اب اور خیال رکھنے لگی ۔وہ چاہے سارا دن بولتی رہے وہ ماتھے پر بل نہ لاتی ۔

بڑا بیٹا میڈیکل کے پہلے سال میں تھا۔شوہر نے گھر سے ملحقہ ایک کنال اور دس مرلے جگہ پر محل نما مکان کی تعمیر کروائی تھی کہ اوپر سے بلاوہ آ گیا۔سب کچھ یونہی چھوڑ چھاڑ کر چلا گیا۔اس کی تو دنیا ہی لٹ گئی ۔

مہینوں بعد اوسان ٹھیک ہوئے ،ساس کا رویہ پہلے سے بھی بدتر ہوگیا تھا۔مگر گھبرانے اور غصہ کرنے کی بجائے اُسے اس پر رحم آنے لگا تھا۔جب وہ اس دنیا سے چلی گئی اس کے پپوٹے کھردرے ہاتھوں سے بند کرتے ہوئے اس نے دُکھ اور یاس سے کہا۔

''بس اتنی ہی دیر تھی یوں جل کر جانا تھا تو بیٹے سے پہلے چلی جاتیں اتنا بڑا داغ کیوں سینے پر لگایا۔''

اور وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ دیکھنے والوں کے کلیجے دہل گئے ۔

.....

ڈور تھی بھی ایک نمبر کریک لڑکی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اوٹ پٹانگ تقدیریں اور بکواس کرنے اور سُننے ہائیڈ پارک بھاگی جاتی ۔زرینہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ۔اس نے

بہتیرا نہ نہ کی پراُس نے ایک نہ سُنی۔ساتھ لے کر ٹلی۔

ہائیڈ پارک میں شور غوغا تھا۔لکڑی کے ڈبے پر کھڑا نوجوان داڑھی،مونچھ سے صفا ایک مصری گلا پھاڑ رہا تھا۔دوسری طرف ایک حبشی اپنی داستان سنا رہا تھا۔وہ کچھ دیر مجمع میں کھڑی سنتی رہی۔مصری نے انگریزی پر طبع آزمائی کی تو وہ آگے بڑھ گئی۔

اور یہاں لکڑی کے ٹوٹے ہوئے ڈبے پر اس نے ایک نوجوان کو کھڑے دیکھا۔وہ چہرے مہرے سے برصغیر کا لگتا تھا۔بڑا خوبصورت اور دلربا سا نوجوان تھا۔ایسی دھواں دھار تقریر کر رہا تھا کہ وہ گُم سُم سی اُسے دیکھنے لگی۔پھر اس کے پاس پہنچ کر بولی۔

''ہندوستانی ہو یا پاکستانی؟''

''پاکستانی'' اُس کا جواب تھا۔

''یہاں کیا کر رہے تھے؟''زرینہ کو جیسے اس کے پاکستانی جاننے کا سن کر دُکھ سا ہوا۔

''ایک سکھ لڑکی نے مجھے ڈاج دیا۔بڑا ڈپریشن میں تھا۔کیتھارسس کیلئے یہاں چلا آیا۔

ڈورتھی بھی ہنستی مسکراتی وہاں آگئی تھی زرینہ نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا خیال ہے تم نے ان صاحب کو تو سنا نہیں۔یہ بے چارے عشق میں ناکام ہو کر اس ظالم کی محبت کا جُوا اتار پھینکنے کیلئے یہاں آئے تھے۔''

اور ان دونوں کے ساتھ وہ بھی ہنس پڑا۔

زرینہ اور ڈورتھی اس کی داستان محبت سُننے کیلئے اُسے اپنے ساتھ ہی کھینچ لائیں۔دریائے ٹیمز کے دہانے پر بیٹھ کر زرینہ نے پوچھا۔کیا کرتے ہو؟

''ڈاکٹر ہوں ہارٹ سرجری میں کنگز کالج لندن سے ابھی سپشلائزیشن کی

ہے۔وہیں آجکل کام کرتا ہوں۔''

''ارے!'' زرینہ نے تعجب سے دیکھا۔

وہ تو سمجھتی تھی کہ بے چارہ کسی فیکٹری ویکٹری میں ملازم ہوگا۔بھولا بھالا معصوم سا بے ضرر چہرہ جو فوراً ہی ہمدردی حاصل کرلیتا تھا۔

''میرے خیال میں تم غالباً نفسیات کی طالبہ ہو۔مجھ پر طبع آزمائی کیلئے اپنے ساتھ لے آئی ہو۔سبجیکٹ بنانا چاہتی ہو؟''

ڈور تھی اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

وہ احمد تیمور تھا۔ڈاکٹر احمد تیمور۔سیدھا سادھا مخلص سا نوجوان۔دریائے ٹیمز بہہ رہا تھا۔منچلے کشتیوں میں شوروغُل مچا رہے تھے اور رات گہری ہورہی تھی جب وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔زرینہ نے اپنے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اس نے کچھ جاننے کی کوشش کی۔

زرینہ کا باپ بیس سال سے گلاسگو کی ایک جہاز ران کمپنی میں ملازم تھا۔چھ فٹ سے بھی نکلتے قد والی اس کی جٹی ماں فیصل آباد کے ایک نواحی چک میں رہتی تھی۔چھ بہن بھائیوں میں زرینہ سب سے بڑی تھی۔باپ نے کوئی پانچ سال قبل سب بچوں اور بیوی کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔تب زرینہ پنجاب کے نشتر میڈیکل کالج میں سال سوم کی طالبہ تھی۔میڈیکل کرنے کے بعد وہ انگلینڈ چلی آئی اور برمٹ کلینک میں ڈاکٹر رابرٹ ایشلے کے ساتھ کام کرنے لگی۔

لندن کی گہما گہمی اور ایک ڈاکٹر کی مصروف زندگی۔زرینہ کو بھلا احمد تیمور یاد رہتا۔ وہ بھول گئی تھی مگر ایک دن جب وہ ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور سے خریداری کرکے باہر نکل رہی تھی اس کے دونوں ہاتھوں میں پیکٹ تھے۔اور وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہی تھی جب

کوئی اس کے بالکل سامنے آ کر رُکا۔اُس نے دیکھا احمد تیمور ہونٹوں اور آنکھوں میں اپنائیت سے بھرپور مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔وہ رک گئی ہلکے سے مسکرائی اور بولی۔

''ارے آپ کدھر؟''

''کچھ شاپنگ کرنا تھی۔آیئے نہ میرے ساتھ!''

وہ ابھی کچھ کومگو میں ہی تھی کہ وہ فوراً بول اٹھا۔

''اوہ یہ پیکٹ مجھے دیجئے۔میں اسے گاڑی میں رکھ آتا ہوں۔'' اُس نے پیکٹ اسے تھما دیئے۔وہ بھاگ کر گیا اور پل بھر میں واپس آ گیا۔

''مجھے اپنے لئے شرٹس خریدنا ہیں۔'' اُس نے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے کہا۔

خریداری مکمل کر کے جب وہ باہر نکلے تو برف باری شروع ہوگئی تھی۔زرینہ کی گاڑی سروس کیلئے ورکشاپ گئی ہوئی تھی۔اسے مسز ولیم یہاں ڈراپ کر گئی تھیں لیکن اب گھر جانا مسئلہ نہیں تھا۔تیمور نے دروازہ کھولا۔وہ بیٹھی اور گاڑی میں سڑک پر آ گئی۔

''اپنے گھر تو میں تمہیں لے جا نہیں سکتا۔کمرہ سخت گندہ ہو رہا ہے۔میں دو دن سے آپریشنوں میں بہت مصروف رہا ہوں۔یوں بھی کام کاج میں کاہل آدمی ہوں۔ہاں تمہارے گھر چلتے ہیں وہیں چائے چلے گی۔''

اس نے گاڑی دوسرے گیئر میں ڈالتے ہوئے خود ہی پروگرام فائنل کر دیا۔زرینہ کو قدرے ہنسی بھی آئی۔

زرینہ نے لاک کھولا۔چھوٹا سا فلیٹ خوبصورتی سے آراستہ تھا۔صوفے پر فراغت سے بیٹھتے ہوئے تعریفی انداز میں بولا۔

''گھڑلڑکی نظر آتی ہو۔''

اور جب وہ دونوں چائے پی رہے تھے۔زرینہ نے اُس سکھڑلڑکی کا قصہ چھیڑ دیا۔

''سریندر کا پوچھ رہی ہو؟'' چائے کا کپ اس نے سائیڈ میں رکھی تپائی پر پٹخا۔

دونوں بازوؤں کو پیچھے لے گیا۔ دونوں ہاتھوں کا ہالہ بنا کر سر کو صوفے کی بیک پر ٹکاتے ہوئے مدھم سی آواز میں بولا۔

''زرینہ! سریندر نے مجھے بہت بیوقوف بنایا۔ میں نے اُس سے بہت محبت کی۔ مگر وہ بہت فضول نکلی۔ میری شادی کی خواہش کا تو اُس نے حشر نشر کر دیا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی مگر اس کے پاس وفا کا کوئی تصور نہ تھا۔ بس اُسے اپنے زیادہ سے زیادہ عاشق پیدا کرنے کا شوق اور چسکا تھا۔

یہ وہ مختصر سا لمحہ تھا جب زرینہ کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ اُس کے چہرے پر پھیلا کرب صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ چائے پینے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا اب چلتا ہوں۔''

مگر زرینہ نے اُسے دوبارہ بٹھا دیا کہ اب کھانا کھا کر جانا۔

اور اس نے بھی تکلف سے کام نہیں لیا۔ دونوں نے مل کر کھانا تیار کیا اور میز پر لگا دیا۔

پھر اس نے اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے بارے پوچھا۔ سبھوں کا فرداً فرداً غائبانہ تعارف کروا دیا۔

اور جب وہ فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے جا رہا تھا۔ زرینہ گیلری میں کھڑی تھی وہ چند پوڈے اُترتے اُترتے رکا۔ اُس نے اوپر کھڑی زرینہ کو دیکھا اور نرم آواز میں بولا۔

''زرینہ کل میرا آف ڈے ہے اگر تم شام کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ تو مجھے خوشی ہوگی۔'' اُس کے انداز میں ایسی معصومیت تھی کہ زرینہ کو انکار بہت مشکل لگا۔

اس نے ایک پل خاموشی سے سوچا اور بولی۔

''کل میں ڈاکٹر رابرٹ کے ساتھ معذور بچوں کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ پرسوں کا پروگرام رکھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے''۔ وہ تیزی سے نیچے اتر گیا۔

کمرے میں واپس آ کر زرینہ بہت دیر اس کے بارے سوچتی رہی۔ وجاہت کے ساتھ ساتھ اس کے انداز میں سادگی اور خلوص تھا جسے زرینہ نے پسند کیا تھا۔ تاہم زرینہ پر ابھی پاکستانی رنگ خاصا چڑھا ہوا تھا۔

''ارے ایسا بھی کیا عشق کہ بندہ جانتے بوجھتے بھی مکھی نگل جائے۔ ایسی فلرٹ لڑکی کیلئے ابھی بھی دل میں تاسف اور دکھ کا احساس ہے۔''

تیسرے دن ملنے کی بجائے اُسے اگلی شام تیمور کو فون کرنا پڑ گیا۔ زرینہ کی امی کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسکے والد انہیں زرینہ کے کہنے پر لندن لے آئے تھے۔ تیمور نے انہیں فوری اٹینڈ کیا۔ بے حد توجہ اور اپنائیت سے اُس نے اُن کی دیکھ بھال کی کہ دونوں کا دل جیت لیا۔

اُس شام جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ تیمور اور وہ اسپتال کے عقبی حصّے سے گزر رہے تھے۔ تیمور نے اپنے ساتھ چلتی اس لڑکی کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر نثار ہوتی سورج کی نارنجی کرنیں اُسے کسقدر خوبصورت بنا رہی تھیں۔ اس کا رنگ کندن کی طرح دمکتا تھا۔ کمرے پر ہلکورے کھاتے اس کے لمبے بالوں پر جیسے شفق بکھری ہوئی تھی۔

وہ رُک گیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''میں کتنا بدھو تھا۔ پیتل کو سونا سمجھ بیٹھا تھا اور اسی فراق میں گھائل ہوا جا رہا تھا۔ مجھے اسے کہنا ہے کہ میں اِسے پسند کرنے لگا ہوں اور وہ مجھے رد نہیں کرے گی۔''

سورج ڈوب گیا تھا۔ کنگز کالج کی عمارت پر سناٹا طاری تھا۔ جب اُسنے اپنے اندر

کی بات کو عملی جامہ پہنایا۔وہ چپ چاپ اُسے سُنتی رہی پھر جب وہ خاموش ہوگیا۔اُسنے گہری نگاہوں سے اُسے دیکھا۔بچوں جیسی معصومیت اُس کے چہرے کے گرد ہالہ سا بنا رہی تھی۔

''احمد تیمور میں تمہاری زبان پر آئندہ کبھی سریندر کا نام نہ سنوں۔چلو آؤ چلیں۔''

زرینہ نے قدم اٹھائے مگر آگے بڑھنے اور چلنے کی بجائے وہ اس کے سامنے آ گیا۔اُس نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے اور ملتجی لہجے میں بولا۔

''زرینہ وعدہ کرو مجھے چھوڑ تو نہیں دو گی؟''

''محبت اور وفا کے بارے میں منفی انداز میں سوچنا چھوڑ دو۔''

پھر انہوں نے رات کا کھانا اکٹھے کھایا۔جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو تیمور نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔اِس بار زرینہ نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

زرینہ کوئی تین ماہ بعد اُسے اپنے ساتھ گلاسگو لے گئی۔لڑکا ہر لحاظ سے اچھا تھا۔مناسب سی پوچھ گچھ کے بعد ایک کو دلہن اور دوسرے کو دولہا بنا دیا گیا۔

اپنے والدین کے بارے میں اس نے زرینہ کو بس اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔بیوہ ماں دو چھوٹے بھائیوں اور ایک بہن کے ساتھ رہتی ہے۔بہن اور ایک بھائی کی شادی ہوگئی ہے۔دونوں بچوں والے ہیں۔باپ کی کافی اراضی اور مکان ہیں۔اُس کی ماں کو کوئی مالی دشواری نہیں۔

پر کبھی کبھی زرینہ کہتی۔

''تیمور تم گھر خط کیوں نہیں لکھتے اور نہ ہی کوئی تمہیں لکھتا ہے۔'' اور وہ سکون سے جواب دیتا۔

''میں خط لکھنے میں بہت نکما ہوں۔ماں پڑھی لکھی نہیں۔زاہد اور شاہد سال میں ایک آدھ خط لکھ ڈالتے ہیں۔''

دس ماہ بعد زرینہ کے ہاں جڑواں بچے ہوئے۔یہ IDENTICAL TWINS تھے۔قدرت کے اس کرشمے پر وہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود حیران تھی۔دونوں میں سرِ مُو فرق نہ تھا۔غضنفر اور مستنصر نام رکھے اور ان کی شناخت کیلئے بے حد خوبصورت سنہرے موتیوں کی لڑی اس نے ایک کی کلائی پر پہنا دی۔

دو سال بعد وہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن سے منسلک ہوگئی۔ایک سال کیلئے اسے جنوب مشرقی ایشیا کے کسی بھی ملک میں متعدی امراض کے اسباب وعلل اور شرح اموات کے تفصیلی جائزے کیلئے نامزد کیا گیا۔اس نے پاکستان کیلئے کوشش کی اور کامیاب ہوگئی۔

اور جب وہ تیاریوں میں مگن تھی اس نے تیمور سے کہا۔

''میں تمہاری ماں اور بہن بھائیوں سے ملنے کی متمنی ہوں۔تم تو شہریت کے چکروں میں جانے کب تک اُلجھے رہو گے؟''

دونوں بچوں کے ساتھ طیارے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اس نے رُک کر تیمور کو دیکھا اور پیار بھری مسکراہٹ سے بولی۔

''خط لکھنے میں سستی نہ کرنا ورنہ میں پاکستان سے نہیں آؤں گی۔''

ائیرپورٹ پر اس کے دیور و دیورانی اس کے استقبال کیلئے آئے تھے۔یہ زاہد اور شاہد تھے۔زاہد کی بیوی کا نام ثریا تھا۔اس کا رنگ سرخ وسفید اور رخسار پھولے پھولے سے تھے۔جب وہ گاڑی میں بیٹھی اس نے شاہد سے پوچھا۔

''اماں نہیں آئیں؟''

''گھر پر بھی تو کسی کو رہنا تھا۔'' ثریا نے جواب دیا۔

گاڑی رُکی ۔دروازے میں قدرے فربہ جسم کی ایک عورت کھڑی تھی ۔

''یہ اماں ہیں ۔'' شاہد نے اسے بتایا۔

وہ ان سے گلے ملی اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں انہوں نے اُس کا چہرہ تھاما۔محبت بھرا بوسہ پیشانی پر دیا۔اور اس نے دیکھا ۔ڈھیر سارے آنسو رخساروں پر بہہ گئے تھے ۔بچوں کو بھی انہوں نے بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔

چائے برآمدے میں پی گئی ۔ایک بات کا اس نے خاص نوٹس لیا ۔اس کی ساس زیادہ تر خاموش ہی رہیں بس کبھی کبھی تیمور کی کوئی بات پوچھتیں ۔چائے بھی نہیں پی ۔اس نے کہا تو بولیں۔

''بیٹی میں چائے نہیں پیتی ۔''

پر وہ کوئی بچی نہیں تھی ۔دو دن میں ہی سمجھ گئی کہ بہو کا ساس کے ساتھ سلوک اچھا نہیں ۔ایک آدھ دن جانے زاہد کی بیوی نے کیسے صبر کیا ۔وہ کہیں باہر گئیں اور ثریا شروع ہوگئی ۔وہ دم سادھے سنتی رہی ۔شاید ہی کوئی ایسا خطاب ہوگا جو اس نے ساس کو نہ دیا ہو۔

''ذلیل بھوکے ننگوں کی بیٹی ۔''

ثریا کوئی ان پڑھ عورت نہ تھی ۔گریجویٹ تھی مگر گفتار کی اتنی گھٹیا تھی کہ اس نے دانتوں سے انگلی داب لی ۔اُسے اپنے ماں باپ کی امارت کا بھی کمپلیکس تھا۔

''ارے انہوں نے گھر بھر دیا ۔مگر اس عورت نے قدر نہ کی ۔''

چند دن تو مہمانداری میں ہی گزر گئے ۔کھانا الگ الگ پکتا تھا ۔ثریا بڑا اہتمام کرتی ۔اسے اور بچوں کو کھینچ کر کھانے کیلئے لے جاتی ۔وہ ساس سے بھی کہتی ۔مگر وہ اسے انتہائی شفقت سے اکیلے ہی بھیج دیتی ۔مگر زرینہ کوئی بچی تو تھی نہیں سب سمجھنا شروع ہوگئی تھی ۔کھانے کی میز چیزوں سے بھری ہوتی اور بوڑھی ساس اور دیور چھوٹے سے کمرے میں

اپنا مختصر سا کھانا کھاتے۔ یہ اس جیسی حساس لڑکی کیلئے بہت مشکل تھا۔ یوں بھی ثریا میز پر بیٹھتے ہی شروع ہو جاتی۔

''یہ ڈنر سیٹ خاص زاہدان سے منگایا ہے۔ یہ واٹر سیٹ میرے بھائی فرانس سے لائے ہیں۔ ڈبل ڈور کی فریج ان ماں بیٹی نے خراب کر دی تھی۔ اب نئی خریدی ہے۔ میں اس کو لاک رکھتی ہوں۔''

نند سے وہ ابھی تک نہیں ملی تھی وہ اسلام آباد رہتی تھی۔

ایک صبح جب وہ ابھی باتھ روم میں ہی تھی۔ اماں ڈیوڑھی میں کھڑی کسی ہمسائے کے بچے کو برف لانے کا کہہ رہی تھیں۔ بچہ کہہ رہا تھا کہ میرے پاس وقت نہیں مجھے اسکول سے دیر ہو جائے گی۔ وہ بار بار ملتجی لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''چاکلیٹ دوں گی۔ برف کے بغیر میں دودھ نہیں بلو سکتی۔ بہو کو کام پر جانا ہے۔''

اس کا دل تڑپ اٹھا۔ لعنت ہے اس امارت پر۔ کیسی عظیم عورت ہے وہ اپنے دل میں کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

مجال تھا کہ اس کی زبان سے اس نے ثریا کے خلاف ایک لفظ بھی کبھی سنا ہو۔ ماضی کی باتیں کرتے کرتے آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے۔ خاص طور پر جب وہ تیمور کی باتیں کرتی۔

شام کو جب وہ واپس آئی اس کے ساتھ ساڑھے چھ کیو بک کا فریج تھا۔ سوزوکی والے نے اسے دو آدمیوں کے ساتھ اُتار کر برآمدے میں رکھ دیا۔ ثریا نے دیکھا تو چہرہ پھلائے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ساس نے کہا۔

''بیٹی اس کی کیا ضرورت تھی؟ پڑا ہوا تو تھا گھر میں۔''

اُس نے محسوس کیا تھا کہ ساس کی آواز رُندھی ہوئی اور آنکھوں میں نمی ہے۔مگر چہرے پر خوشی ومسرت کا عکس چھایا ہوا ہے۔

ثریا سارے گھر میں پھنکارے مارتی پھرتی۔اُسے شدید تکلیف تھی کہ وہ جس نے ساس کو ایک چھوٹے سے کمرے میں مقید کر دیا تھا بڑی بہو نے اسے اس خول سے نکال دیا تھا۔گھر میں موجود ہوتی تو ساس کو کوئی کام نہ کرنے دیتی۔کسی دوست کے گھر جانا ہوتا تو ساس کو تیار کر کے اپنے ساتھ لے جاتی۔

ایک دن چھوٹی سی ایک بات پر ثریا نے ساس کی بے عزتی کر دی۔وہ گھر میں ہی تھی۔برداشت نہ کر سکی۔بے اختیار بول اٹھی۔

اپنے آپے میں رہنا سیکھو۔کسی نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ بزرگ قابل عزت ہوتے ہیں۔ساس تمہاری ماں ہے۔''

اور یہ وہ دن تھا جب اماں نے بھیگی آنکھوں سے اُسے اپنے دکھوں کی داستان سنائی۔

''تیمور کی شادی کا تو ارمان تو میرے دل میں ہی رہا۔ثریا کو بیاہ کر لائی۔اچھا گھر دیکھا۔پڑھی لکھی لڑکی تھی۔یہی سوچا تھا کہ علم جہالت سے بہتر ہوتا ہے۔مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ میں اُسے کمینی نظر آتی ہوں۔کیوں؟فصل باڑی،مکانوں دوکانوں کے کرایے سبھی تو ان کے ہاتھوں میں ہیں۔میں تو پیسے پیسے کو محتاج ہوں۔''

''آپ نے تیمور کو کبھی کچھ نہیں لکھا،کیوں؟''

''کیا لکھتی بیٹی،ماں ہوں نا،سوچتی تھی،پردیس میں بیٹھا ہے۔میرے خطوں سے پریشان ہو جائے گا۔'' ڈھیر سارے آنسوان کے رخساروں پر بہہ گئے۔

''بیٹی میں ان پڑھ ہوں۔جاہل ہوں۔مگر میں نے ساس نندوں اور دیور کو کبھی

خود سے جدا نہ سمجھا مگر اس پڑھی لکھی کیلئے میرا اور میرے چھوٹے سے بیٹے کا وجود برداشت سے باہر ہے۔ سارے گھر میں وہ پھیلی ہوئی ہے مگر اس کی آنکھوں میں یہ چھوٹا سا کمرہ بہت کھٹکتا ہے وہ مجھے یہاں سے نکال دینا چاہتی ہے۔ اس گھر اس چوکھٹ سے جہاں وہ بیاہ کر آئی تھی۔''

ڈاکٹر تیمور احمد کو اس کا پہلا خط ملا ایروگرام کی پشت پر لکھا تھا۔ زرینہ تیمور وہ مسکرایا۔ بہت انتظار تھا اسے اس خط کا۔ کھولا اور پڑھا اس نے لکھا تھا۔

''میں نے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا ہے۔ تیمور میرا خیال ہے کہ وہ رشتے جو ہمارے وجود کی پور پور کے ساتھ ذہنی وابستگی اور توقعات رکھتے ہیں انہیں چھوڑ دینا کسی طور پر مستحسن نہیں۔ ہمارے ملک کو ہم دونوں کی، تمہاری ماں کے گھر کو تمہاری اور میری ضرورت ہے۔ محض اپنی آسائشوں اور اسٹیٹس سمبل کے چکروں میں الجھ کر ہم خود کو اور اپنے ساتھ بہت سے دوسروں کو سکون سے محروم نہیں کر سکتے۔ اماں، میں اور بچے تمہاری وطن واپسی کے منتظر ہیں۔''

☆☆☆

زندگی اے زندگی

بالی عمریا ہی تو تھی۔عقل اگر تھی تو جذبات اتنے غالب تھے کہ اُس کی ایک نہ سنتے تھے۔بہت بچپن سے اپنے خالہ زاد سے منسوب تھی۔پرانے لاہور کا جدی پشتی امیر گھرانہ جس کے لڑکے حسن و وجاہت کے نمونے پر ساتھ ہی اُتنے لفنگے اور بگڑے ہوئے بھی۔

اماں کو اپنی بہن سے بہت پیار تھا۔اپنی زبان دینے کا بہت خیال تھا۔انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ ابا اس رشتے پر قطعاً راضی نہیں۔بڑے بھائی بھی خلاف ہیں۔شاید اِسی لئے مرتے وقت انہوں نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر مجھے اِس رشتے کی تکمیل کے لئے کہا تھا اور میں نے جذبات سے بھرے لہجے میں کہا۔

''اماں! میں آپ کی خواہش کو ضرور پورا کروں گی۔''

اماں کو فوت ہوئے بمشکل چھ ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ خالہ ٹھیکرے کی اِس مانگ کو لینے آ گئیں۔بڑے بھیا میرے کمرے میں آئے اور انہوں نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔جواباً میں نے کہا۔

''بھیا! اماں کی بہت خواہش تھی۔ میں اُن کی خواہش کو کیسے پیچھا دوں؟''

''احمق لڑکی! اماں کی کیا بات کرتی ہو؟ ان کا مدرسہ فکر تو عورت مرد کے پاؤں کی جوتی ہے، سے تھا۔ تم اپنی اچھی بھلی زندگی کو کیا اِس نظریے کی بھینٹ چڑھا دو گی؟ کیا تم پسند کرو گی کہ تمہارے شوہر کی راتیں رنڈیوں کے ہاں بسر ہوں اور تمہارے سسرال میں طوائفوں کی آمد و رفت بالکل ایسے ہی ہو جیسے ہمارے ہاں شرفا کی؟ زندگی اب اتنی بھی سستی نہیں کہ اسے یوں جانتے بوجھتے ہوئے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا جائے۔''

پر میرے ذہن پر تو ''مرأۃ العروس'' کی اصغری خانم قبضہ جمائے بیٹھی تھی۔ وہ اصغری خانم جس نے اپنے تدبر، اپنی بصیرت اور اپنی وفا سے شوہر کیا، پورے گھر کو بدل ڈالا تھا۔ میں راشد الخیری کی وفا پرست ہیروئنوں سے متاثر تھی۔ ایسے میں مجھے یہ تھوڑی خیال آیا کہ میں اپنے پاؤں پر آپ ہی کلہاڑا مار رہی ہوں۔

چھٹپنے میں کہیں اُسے دیکھا تھا۔ شکل صورت کا ہلکا سا خاکہ بھی ذہن میں نہ تھا۔ اصل میں ابا کو اس پوتڑوں کے رئیس خاندان سے ازلی چڑ تھی۔ میل ملاپ زیادہ بڑھایا ہی نہیں۔ بس ایک خالہ ہی تھیں جو اکثر و بیشتر آتی رہتیں۔

دلہن بن کر اُس گھر میں آئی تو اُسے دیکھا۔ کیا بانکپن اور وجاہت تھی اُس میں کہ میں تو دیر تک حیرت سے گم سم سی ہو گئی۔ بھائیوں اور ابا کو ناراض کرنے کا سارا ملال جاتا رہا۔

تین ماہ تک دھنک کے سارے رنگ مجھے اپنی زندگی میں گھسے نظر آئے ایبٹ آباد، کاغان اور سوات کی وادیوں کو میں نے اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔ پر دھنک کے اُن رنگوں کا حُسن اُس دن ماند پڑ گیا جب ساری رات عباس غائب رہا۔ رات گویا میں نے کانٹوں پر گزاری۔ صبح جب وہ گھر آیا تو میں نے غائب رہنے کا سبب پوچھا۔ بے نیازی سے کندھے اُچکاتے ہوئے بولا۔

''ذرا شمشاد بیگم کا دیدار کرنے کے لئے گیا تھا۔آنکھیں اور کان دونوں ہی ترس گئے تھے۔''

وہ دھم سے بستر پر گر گیا۔اُس کی آنکھیں خمار سے سرخ ہو رہی تھیں۔بوجھل آواز میں اُس نے کہا۔

''گیتی!میرا سر نہیں دباؤ گی؟قسم سے درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''

اور گیتی آرا بیگم کا جی چاہا کہ اس کا پھٹا سر ہنٹروں سے اور پھاڑ ڈالے تا کہ قصہ ختم ہو۔میرے تیور دیکھ کر وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

''ارے تم بگڑ بیٹھی ہو۔منہ کا ذائقہ بدلنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ہر روز گوشت کھاتے کھاتے آدمی اُکتا جاتا ہے۔دال کھانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔''

اُس کے منہ کا ذائقہ آئے دن بگڑا ہی رہتا۔کسی سرکش گھوڑے کی طرح وہ تڑوا کر بگٹٹ بھاگتا۔اِدھر اُدھر منہ مارتا اور پھر اپنے تھان پر آموجود ہوتا۔مجھے نفرت ہو گئی تھی ''مرأۃ العروس'' کی اصغری خانم، راشد الخیری کی ہیروئنیں جانے کن کونوں کھدروں میں چھپ گئی تھیں۔

لعنت ہے اُن پر۔کیسے صبر کرتی ہوں گی۔پہاڑ جتنا گردہ ہی ہو گا اُن کا۔اب اپنا بھائی بے طرح یاد آیا۔بس اب یہی ہو سکتا ہے کہ بوریا بستر اٹھاؤں اور ابا کے گھر چلی جاؤں۔ساس نے روکا،نندوں نے منتیں کیں،جیٹھانی نے پرسا دیا۔

''دیکھو گھبراؤ نہیں۔محبت اور پیار پتھر کو بھی موم کر دیتا ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔رُندھی ہوئی آواز میں مجھ سے بس اتنا ہی کہا گیا۔

''آپ عادی ہو چکی ہیں مگر مجھ میں یہ سب کی ہمت نہیں۔''

حقیقی دنیا افسانوں کی دنیا سے بہت مختلف ہوتی ہے۔افسانے پڑھ پڑھ کر انسان

خود کو ایک افسانوی کردار فرض کر لیتا ہے، پر جب حقائق سے پالا پڑتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ زندگی کتنی تلخ ہے اور اس کے کڑے وار کیسے جسم کو چھلنی کرتے ہیں۔ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں نے اُسے بہتیرا سمجھایا، بہت روئی پیٹی، پر وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔

ابا نے سلے ہونٹوں اور خاموش آنکھوں سے میرا استقبال کیا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ مجھے لعن طعن کریں، پھٹکاریں، پر وہاں جامد سناٹا تھا۔ گھر کو ایک عورت کی ضرورت تھی۔ شمیم میری بہن ابھی بہت چھوٹی تھی۔ میں نے گھر اور بہن کو تو سنبھال لیا پر ابا کو نہ سنبھال سکی۔ ڈاکٹر نے اُن کی گرتی صحت کے پیش نظر انہیں مشورہ دیا۔

''میاں صاحب! اگر زندگی اور صحت چاہتے ہیں تو غم کھانا چھوڑ دیں۔''

میں نے سنا تھا، وہ دُکھی آواز میں بولے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب میری بے حد پیاری اور لاڈلی بیٹی اُجڑ گئی ہے۔ غم کیسے نہ کھاؤں؟''

پہلی بار میرا دل پھٹا۔ میرا اتنا جاہ و جلال والا باپ کس قدر بے بس ہو گیا تھا۔ اور غم کھاتے کھاتے وہ ایک دن چل بسے۔ بڑے بھائی ہم دونوں کو ان کے چہلم کے بعد اپنے پاس لے آئے۔ اپنے اُجڑنے اور گھر سے بے گھر ہونے کا احساس حقیقتاً مجھے یہاں آ کر ہوا۔ بھابھی کو بہت اچھی تھیں۔ پر وہ اپنے گھر والی حکومت تو نہ تھی۔ میں تو جیتے جی بڑی ادھوری سی ہو گئی تھی۔

ایک دن بڑے بھائی نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر سمجھایا۔

''بیٹے زندگی کو اگر بوجھ بنا لوگی تو یہ واقعی ایک بوجھ بن کر تمہارا جینا حرام کر دے گی۔ اس دنیا میں ہر انسان غموں اور دکھوں کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔ بظاہر چہرے پر مسکراہٹیں ہیں مگر اندر سے کھوکھلے ہیں۔ مصائب میں ہمت ہارنا بزدل لوگوں کا کام ہے۔

اپنا تعلیمی سلسلہ آگے بڑھاؤ۔لوگوں سے ملو۔کسی کی سنو اور کسی کو سناؤ۔''

یوں میں نے اُن کی ہمت دلانے پر ایف اے، بی اے اور پھر بی ایڈ کیا۔ان کے توسط سے ایک اچھے ادارے سے اپنے باپ کے آبائی شہر میں منسلک ہو گئی۔

علم نے میرے ذہن کے بند دروازوں کو کھولا تھا اور ملازمت نے مجھے اعتماد دیا۔ میں نے تب اپنے آپ سے کہا تھا کہ زندگی واقعی اتنی ارزاں تو نہیں کہ اسے لچوں لفنگوں کے ساتھ رو رو اور سسک سسک کر گزار دیا جائے۔

اسے میں کیا کہوں؟ اپنی خوش قسمتی یا بدبختی کہ جون کی ایک سڑی بسی دوپہر کو میرے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجی۔نوکر نے پسینے میں شرابور اُس نوجوان وکیل کو اندر بٹھا کر مجھے اطلاع دی۔میں گئی تو سانولے رنگ اور اکہرے بدن اور عام سی شکل والے رضا شیرازی نے ذرا سا ایستادہ ہو کر مجھے تعظیم دی۔

میں ایک طرف بڑھ گئی۔وہ میرے چھوٹے سردار بھائی کا دوست تھا اور طلاق کے سلسلے میں اُن کی ہدایت پر مجھ سے ملنے آیا تھا۔اس کا لب ولہجہ بڑا ہمدردانہ تھا۔میں کو ورکنگ وومن تھی پر اِس کے باوجود طلاق کا سن کر ایک بار ساری جان سے لرزی تھی۔ رضا شیرازی نے میری حالت بھانپتے ہوئے اعتماد اور ہمدردی سے کہا۔

''خاتون محترم!اس دنیا میں ہر انسان دکھی ہے۔صرف دکھوں کی نوعیت جداگانہ ہے۔''

اور پھر رضا کبھی کبھی میرے گھر آنے لگا۔میں نے محسوس کیا کہ اُس کا ادبی ذوق بہت اعلیٰ تھا۔اس میں جسمانی حسن نہیں تھا۔مگر اس کے اندر کا حسن ہر کسی کو متاثر کرتا۔ایک بار وہ اپنے بیوی بچوں کو میرے اصرار پر میرے گھر لایا۔میں دنگ رہ گئی۔اس کی بیوی واجبی سی شکل والی بڑی بے ڈھبی عورت تھی۔میرا دل رضا شیرازی کے لئے دکھا اور ہمدردی سے

لبریز ہو گیا۔ اتنے نفیس ذوق کا آدمی اس گنوار کے ساتھ کیسے رہ رہا تھا؟ اس کی بیوی جب کسی کام سے اٹھ کر باہر گئی تو وہ یاس بھرے لہجے میں بولا۔

''آپ سمجھتی ہیں کہ آپ بہت دکھی ہیں، مگر لوگ آپ سے زیادہ دکھی ہیں۔''

انسان اپنی ذات میں ازلی خودغرض ہے۔ اس کی آمد پر تنہائی اور سناٹے میں ڈوبے گھر میں جیسے چہل پہل سی ہو جاتی۔ ہمارے درمیان ادب، سیاست، فلسفے اور تصوف سبھی موضوعات پر گرما گرم بحث مباحثے ہوتے اور بوجھل زندگی کے یہ لمحے اس قدر خوشگوار ہوتے کہ ان سے محروم ہونے کو میرا جی نہ چاہتا۔ وہ دکھی تھا اور میں بھی دکھی تھی، اور یہی ہمارے درمیان مشترکہ احساس تھا۔ تاہم میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری زندگی میں داخل ہو۔ وہ بیوی بچوں والا تھا۔ مگر جذبات کے سامنے بڑی بے بس سی تھی۔ ایک دن جب اُس نے شادی کی درخواست کی۔ میں سُن سی ہو گئی۔ دیر تک مجھ سے بولا ہی نہ گیا اور جب بولی تو بس اتنا۔

''رضا! لوگ کیا کہیں گے؟''

''مجھے لوگوں کی پرواہ نہیں۔ ایک پڑھی لکھی بیوی کی شدید حسرت تھی اور گیتی آرا تمہیں پا کر میری دیرینہ خواہش پوری ہو گئی ہے۔ تم چاہتی ہو میں یہ حسرت اپنے ساتھ قبر میں لے کر اتروں؟ محض لوگوں کے ڈر سے؟ نہیں گیتی آرا میرا مذہب مجھے اس کی اجازت دیتا ہے۔ میں تم سے شادی کروں گا۔''

اور یوں ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ یہ ہمارے درمیان طے پایا تھا وہ رات اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ گزارے گا کیوں کہ بچیاں ابھی سن بلوغت میں ہیں اور انہیں تنہا چھوڑنا مناسب نہیں۔ میں نے اس کی بات کو سمجھا اور اُس سے اتفاق کیا۔

رضا کورٹ سے دو بجے آتے۔ ہم اکٹھے کھانا کھاتے، آرام کرتے، شام کی

چائے پیتے۔ گھومنے پھرنے چلے جاتے۔ رات دس بجے میں اُسے گیٹ پر خدا حافظ کہتی۔ زندگی اگر بہت خوشگوار نہیں تھی تو اتنی بری بھی نہ تھی۔ اور پھر میری سترہ سال کے طویل عرصے پر پھیلی ازدواجی زندگی میں شدید قسم کا بھونچال سا آ گیا۔ میں نے ریت کا گھروندا بنایا تھا جو خفیف سا جھٹکا بھی برداشت نہ کر سکا اور ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا؟ یہ میرا جذبہ ترحم تھا جو مجھے لے ڈوبا یا میری بدقسمتی نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔

اُس سرو قد نمکین چہرے والی لڑکی کو دوش دوں جو میری بہن شمیم کی گہری دوست تھی جس کے بارے میں ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی ورجن ہے۔ میرا دل اُس کے لئے تڑپا تھا۔ یہ کیسا اندھا سماج ہے جو انسانی خواہشات وجذبات کو رواجوں کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ اس کی محرومی میری کمزوری بن گئی۔ میرے دل کے دروازے وا ہوئے اور وہ اس میں یوں سمائی کہ گھر کا ہی ایک فرد بن گئی۔ اس کے قہقہوں سے میرے گھر کے در و دیوار گونج اُٹھے۔ وہ شعروں کی رسیا تھی۔ ادبی ذوق رکھتی تھی۔ زندہ دل اور شوخ تھی۔ میں تو سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ بجلی بن کر گرے گی تو میں ہی جل جاؤں گی۔

بس یونہی خطرے کا احساس ہوا جیسے چھٹی حس پھڑکی ہو۔ رضا جو اس کی آمد پر کِھل اٹھتا تھا، اُس کی موجودگی میں بہت شوخ باتیں کرنے لگا تھا۔ کسی دن جو وہ نہ آتی تو مجھے لگتا جیسے وہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں لے رہا ہے۔ یہ میرا وہم ہے یا فی الواقع ایسا ہی ہے؟ میں سوچ کر لرز اٹھی۔

ایک دن جب میں ''انجلیک'' کا میٹنی شو دیکھنے جا رہی تھی۔ رضا نے گاڑی کا رخ اسے پک کرنے کے لئے اس کے گھر کی طرف موڑا۔

''رضا! نجمہ، شمیم کی دوست تھی اور اور شمیم بیاہ کر کوئٹہ جا چکی ہے۔ اب یہ ضروری

نہیں کہ ہمارا کوئی پروگرام اس کے بغیر مکمل نہ ہو۔"

میں نے دیکھا رضا کا چہرہ جیسے اُتر سا گیا۔ اُس نے گاڑی کا رخ تو بدل دیا مگر سارا راستہ چپ رہا۔ اس کی خاموشی میرے وسوسے کو تقویت دیتی رہی۔ عجیب سے دن گزرے۔ نہ میں نے کوئی بات کی نہ رضا نے کوئی صفائی پیش کی۔

سیالکوٹ میں نجمہ کے آبائی مکان کا ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ رضا ہی اس کی پیروی کر رہا تھا۔ غالباً ہفتہ تھا۔ دو بجے تک میں رضا کا انتظار کرتی رہی۔ تنگ آ کر فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ سیالکوٹ گیا ہوا ہے۔ مجھے یقیناً کشف نہیں ہوا تھا پر میرا وجدان اتنا قوی تھا کہ اُس نے اُس نے چیخ چیخ کر مجھے کہا کہ وہ دونوں اکٹھے گئے ہیں۔ میں نے نجمہ کے گھر فون کیا۔ کسی بچے نے اُٹھایا، میرے دریافت کرنے پر بولا۔

"گھر میں موجود نہیں، باہر گئی ہوئی ہیں۔"

میں نے دریافت کیا۔

"شام تک آ جائیں گی؟"

"شاید نہیں، ایک دو دنوں کے لئے باہر گئی ہیں۔" بچے کا گومگو سے بھرا جواب تھا۔

دو دن بعد جب رضا آیا تو میں نے بظاہر ہنستے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب اس نے سگریٹ سلگایا تو میں نے پوچھا۔

"کہو ٹرپ کیسا رہا؟ نجمہ کی کمپنی سے خوب انجوائے کیا ہوگا؟"

میرا یہ جملہ بھرپور تھا۔ رضا کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ میں بغور اس کا جائزہ لیتی رہی۔ تھوڑی دیر وہ ہونقوں کی طرح میری طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟"

''یقیناً نہیں۔'' میرا جواب تھا۔

''گیتی آرا! تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟ تمہاری وہ شوخ وشنگ نجمہ جسے ماڈل گرل کہوں تو غلط نہ ہو گا۔ میں نے اُس کے ساتھ گھوم پھر کر کیا نکو بننا ہے۔ میں بیوں بچوں والا ہوں۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔''

میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اُس نے قسم کھائی اور اب یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چند ماہ یونہی گزر گئے۔ میں عجیب سی بے چینی سے دوچار ہو گئی تھی۔ بظاہر کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا پر لگتا تھا جیسے کچھ ہو رہا ہے۔

اور پھر ایک دن یہ سارے وسوسے اور وہم جنہیں اب تک حقیقت کا رنگ نہیں ملا تھا میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ میں نے دونوں کو گاڑی میں بیٹھے خود دیکھا۔

ایک بم میرے اوپر ان دونوں کو اکٹھے دیکھ کر گرا۔ دوسرا بم اُس وقت گرا جب میں نے رضا سے بات کی اور اس نے کمال ڈھٹائی سے خود کو بڑا بے بس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''میں بہت مجبور ہوں، میں اُس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گیتی آرا! وہ میری کمزوری بن چکی ہے۔''

''کیا یہ تمہاری ایسی ہی کمزوری ہے جیسی آج سے سترہ سال قبل تم نے میرے سلسلے میں محسوس کی تھی۔ تم جسے ایک پڑھی لکھی، ذہین اور ادبی ذوق رکھنے والی بیوی کی حسرت تھی۔ رضا! یہ حسرت نہیں، ہوس تھی جسے میرے پاگل پن نے سمجھا نہیں۔ کبھی میں تمہاری کمزوری تھی آج وہ شوخ وشنگ لڑکی جسے تم ماڈل گرل کہتے تھے، تمہاری کمزوری ہے۔ تم ایک سپولیے ہی نکلے نا جس نے مجھے آخر ڈس ہی لیا۔''

پتہ نہیں ہذیانی کیفیت میں میں نے کیا کیا کہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہ جا چکا تھا۔ میرے دل و دماغ میں جذبات کا ایک الاؤ دہک رہا تھا۔ اسی طرح میں اٹھ کر نجمہ کے گھر

گئی۔آنسو پھوٹ پھوٹ کر میری آنکھوں سے بہے۔میری آواز جانے کتنی بار لڑکھڑائی۔

''تمہیں کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔میں تو نے تو تمہیں شمیم کی طرح سمجھا تھا۔کوئی بہنوں کے سہاگ کو یوں اُجاڑتا ہے۔''

میں نے دیکھا وہ یکسر منکر تھی۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔مجھے کسی بات کا علم نہیں۔''

''میں نے تم لوگوں کو خود اکٹھے دیکھا ہے۔'' اُس کی ڈھٹائی پر میرا خون کھول اُٹھا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔میرا آپ کے شوہر کے ساتھ کیا واسطہ، کیا ناطہ؟''

اُس کے چہرے پر عجیب سی بے نیازی تھی۔میں پریشان ہو کر اُٹھ گئی اور شک وشبے میں گرفتار واپس آ گئی۔دل پریشان تھا، دماغ پریشان تھا۔شام کو رضا آیا۔برآمدے میں کھڑے ہو کر ایک ٹک وہ مجھے دیکھتا رہا۔تب بولا۔

''گیتی آرا تمہارا دماغ شکوک وشبہات سے اس درجہ خراب ہو چکا ہے کہ میں سمجھتا ہوں اب ہمارا نباہ ہونا بہت مشکل ہے۔میں تمہیں طلاق دینا چاہتا ہوں۔''

''طلاق!'' میں سر سے لے کر پیر تک لرز اٹھی۔طلاق کا داغ میرے ماتھے پر لگا اور اب دوسری بار پھر لگا چاہتا ہے۔

''رضا تم رحم کرو گے؟ میں گھر کی چار دیواری میں بیٹھنے والی کوئی گھریلو عورت نہیں۔علاقے میں اچھی با اثر شخصیت کی مالک ہوں۔میری ذات یوں باعثِ مذاق نہیں بننی چاہیے۔''

عورت کی بے بسی پر میرا دل اتنا بھرا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔یہ صنف کتنا بھی پڑھ لکھ جائے۔کسی مقام پر بھی کیوں نہ پہنچ جائے۔مرد کے سامنے کتنی بے بس ہے؟

میں نے رضا کی منتیں کیں۔اُس کے آگے ہاتھ جوڑے۔خدا اور رسول کا واسطہ دیا کہ وہ مجھے طلاق نہ دے پر اُس نے ذرا پرواہ نہ کی۔

''رضا! تم اس کے ساتھ شادی کر لو۔میں تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ اگر تم پسند کرو تو میں اس شہر سے بھی چلی جاؤں گی۔''

التجائیں بے کار گئیں اور جس طرح ایک تپتی ہوئی دوپہر میں وہ میرے گھر آیا تھا اسی طرح ایک دوپہر میرے گھر اس کا بھیجا ہوا طلاق نامہ پہنچ گیا۔

پیدا کرنے والے نے کیسی قسمت دے کر بھیجا؟ بچوں سے محرومی۔زندگی کی تلخیوں میں اس کی مسکراہٹیں ہی کچھ حوصلہ دیتیں۔میرا گھر پریشانیوں میں ڈوب گیا ہے۔ پریشانیاں ہر سو سے عود کر آتی ہیں۔اُس کی شامیں آج کل نجمہ کے ساتھ گزرتی ہیں۔نجمہ جو بقول اس کے ماڈل ہے۔جس کے ساتھ گھوم پھر کر اسے نکو نہیں بننا۔

اس ربِ جلیل کے سامنے اس سر کو جھکا دیا ہے۔گناہوں کی معافی چاہتی ہوں۔اسی سے انصاف کی مقتضی ہوں۔خدا کی لاٹھی بے آواز جب برستی ہے تو ہوش ٹھکانے لگا دیتی ہے۔

☆☆☆

مسئلہ آبروئے دِل کا

پیغام یہی کوئی دس بجے کے قریب ملا تھا۔فون پر مسز عباسی تھیں۔جنہوں نے خیریت دریافت کرنے کے بعد بتایا تھا کہ آج مسز شہلا کے ہاں ساڑھے گیارہ بجے کارڈز کھیلنے جانا ہے۔وہ ذرا تیار ہو کر آئے۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔اِس تیار ہو کر آنے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔

''گھبراؤ نہیں ابھی کل ہی کوٹھی کا کرایہ آیا ہے۔سارا لیتی آؤں گی۔دنوں بعد محفل جمے گی جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔''

اُن کا چھ کا گروپ تھا۔مسز توقیر اور مسز خالد صنعتکاروں کی بیویاں تھیں۔مسز عباسی اور مسز شہلا کے شوہر صوبائی حکومت کے اعلیٰ عہدیدار تھے۔تنخواہوں کے علاوہ پشت پر زمینیں مربعے بھی تھے۔مسز منیر اور وہ دونوں بڑے گھر کی بیٹیاں تھیں،مگر نسبتاً ہلکے شوہروں کی بیویاں تھیں۔مہینے میں ایک آدھ بار اکٹھی ہوتی تھیں۔ایسے ہی کارڈز کھیلتیں پیسے لگتے۔پانچ،دس ہزار جیتنا اور ہارنا کوئی بات نہ تھی۔

سجاد ابھی گھنٹہ بھر پہلے آئے تھے۔آٹھ بجے دفتر گئے تھے اور پونے نو بجے واپس

آ گئے تھے۔وہ سٹپٹا سی گئی۔پریشانی سے بولی۔

''کیسے؟خیریت تو ہے،طبیعت تو ٹھیک ہے نا''اور سجاد نے اُسے بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی ایمان تازہ کرنے آیا ہوں۔''

''ایمان کیا ڈگمگانے لگا تھا'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''کبھی کبھی ایسی بھی سٹیج آجاتی ہے۔''

اُس نے پلکیں اٹھائیں۔آنکھوں میں جانے کیا تھا؟سجاد فوراً ہنس پڑا۔۔۔۔

''ارے بھئی ایک غیر ملکی وفد آرہا ہے اُسے ریسیو کرنے ائیر پورٹ گیا تھا۔فلائٹ کچھ لیٹ ہے۔سوچا تمہارے درشن کرتا جاؤں۔چلو ایک کپ چائے تو پلاؤ،مگر خود بنانا۔''

اور چائے پی کر وہ چلا گیا۔خادمہ صفائی میں جُت گئی۔بکھری ہوئی اشیاء بھی سمیٹنے لگی تھی۔جب مسز عباسی کا فون آیا۔شہلا یورپ کے ٹور پر گئی ہوئی تھی۔ڈیڑھ ماہ بعد آئی تھی۔مسز خالد کے بڑے بیٹے کو برین ہیمرج ہوگیا تھا۔وہ اُس کی تیمارداری میں مصروف تھیں۔اس کے لیے محفل نہیں جمی تھی۔

پونے دس بجے اُس نے الماری کھولی،کپڑے نکالے،پہنے،تیار ہوئی۔ملازمہ کو ہدایات دیں،نوکر کو سمجھایا اور اب جب اُس نے سیف کھول کر نوٹوں کی گڈی نکال کر بیگ میں ڈالی تو اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔بچوں کے نئے سمیسٹر کی فیسیں جمع کروانی تھیں۔بجلی کا بل کوئی سات ہزار کا تھا۔پچھلے ماہ جمع نہیں کروایا گیا تین کمروں میں اے سی دن رات چلتے رہے تھے۔اور بھی کئی خرچے ہوئے تھے۔

مگر اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

''ایک آدھ بار کے سوا کبھی ہاری نہیں ۔مجھے یہ تشویش کیوں؟''

ڈرائیور پورچ کے قریب کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔اُسے اپنے مقابل پا کر وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

''کیا سویرے سویرے نحوست پھیلانی شروع کر دی ہے ۔مت اونگھا کرو، مجھے سست لوگ قطعی پسند نہیں ۔''

ڈرائیور اُس نے کبھی نہیں رکھا تھا۔سجاد کے پاس دفتر کی گاڑی تھی ۔مگر وہ ایک ذمہ دار اور فرض شناس افسر تھا۔سرکاری پٹرول اپنی ذات پر کبھی خرچ نہیں کرتا تھا۔میمونہ گاڑی خود چلانا جانتی تھی ۔بچوں کو سکول چھوڑنے لانے اور دیگر ذمہ داریوں کو وہ اکیلے ہی نبھاتی تھی ۔

گزشتہ تین ماہ سے یہ ڈرائیور اُن کے پاس تھا۔بے چارہ دُکھی تھا۔سجاد نے کہا اِسے رکھ لیتے ہیں جب تک اِس کی نوکری کا بندوبست نہیں ہوتا ہمارے پاس رہے گا۔

میمونہ کو بھلا کیا اعتراض تھا۔اُس کا تھوڑا سا بار ہلکا ہو گیا تھا۔بھاگم دوڑ سے ذرا سکون مل گیا تھا۔

اُس نے بیگ سیٹ پر پھینکا۔دروازہ کھولا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئی بولی ۔

''شہلا کے گھر چلو۔''

کوٹھی کے گیٹ پر ہی اُتر گئی ۔بچوں کو وقت پر لانے کی تاکید کی اور اندر داخل ہو گئی ۔

لیونگ روم میں وہ سب جمع تھیں ۔کمرے میں چھت اُن کے قہقہوں سے اڑی جا رہی تھی اور قہقہوں کے اِسی طوفان میں گھری وہ بھی اُن کے پاس پہنچ گئی ۔چند مزید قہقہے فضا میں اچھلے ۔دو ماہ کی غیر حاضری میں جنم لینے والے واقعات اور ضروری باتیں ایک

دوسرے کو سُنائی گئیں۔میمونہ نے دیکھا تھا مسز شہلا کے داہنے ہاتھ ایک نوعمر سی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی بڑی صباحت اور دلکشی تھی اس چہرے میں۔استفہامیہ انداز میں اس نے شہلا کو دیکھا۔اس کی نگاہوں کا مفہوم جان کر وہ بولی۔

''یہ افروز ہے میرے جیٹھ کی بیٹی ہے۔نیروبی کی جم پل ہے۔اب لندن میں مقیم ہے اور ان دنوں پاکستان کے دورے پر آئی ہوئی ہے۔''

چائے چلی،اُس کے بعد تاش کی بازی شروع ہوگئی۔اتفاق ہی تھا کہ وہ پہلی بار ہار گئی۔ہمیشہ ہی جیتی تھی۔اس لیے اُس کی ہار پر باقیوں نے کچھ زیادہ مسرت کا اظہار کیا۔دوسری بازی اُس نے ہار جیت میں بدلنے کے لیے کھیلی،مگر پانسہ اُلٹ پڑا۔

''آج کا دن میرے لیے منحوس ہے۔میں نہیں کھیلوں گی۔اُس نے ہاتھ اُٹھا دیے۔''

''تمہارا تو بڑا بھی کھیلے گا۔جب بیگ کو نوٹوں سے بھرتی تھیں تب ہاتھ کبھی نہیں اوپر اٹھے تھے۔'' مسز عباسی نے بتیسی نکال دی۔

''اللہ کی بندی اخراجات سر پر کھڑے ہیں۔یہ پیسے کوئی فالتو مال کے نہیں جو یوں اڑا دوں۔یوں بھی سجاد کو معلوم ہوگیا تو میرا تو سر توڑ دے گا۔''

''بڑی احمق عورت ہو۔سجاد کو سر پر چڑھا رکھا ہے تم نے۔بھگتو گی ایک دن۔''

''اس بھگتنے والے مسئلے کو تو فی الحال گولی مارو۔حال کے فیصلے سے نپٹو۔میں ہار رہی ہوں اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔''

اور پھر یوں ہوا کہ وہ ہارتی چلی گئی۔ہر بار اُس نے اس امید پر کھیلا کہ وہ جیت جائے گی پر ایسا نہ ہوا۔اس کی پارٹنر مسز عباسی تھی اُسے یوں ہراساں دیکھ کر وہ بولی۔

''ارے کوئی سجاد کی کمائی ہے جو اتنا ڈر رہی ہو۔تمہارا اپنا پیسہ ہے اجاڑو یا بناؤ۔

یوں بھی کبھی کبھی تو مال کی زکوٰۃ نکلنی ہی چاہیے۔''

مگر وہ پریشان تھی ،اخراجات کا ایک انبار اُس کے سر پر کھڑا تھا جسے اُس نے اِس رقم سے نپٹانا تھا اور اب وہ اسے اپنے شوق کی نذر جھونک بیٹھی تھی ۔اور وہ سب قہقہے لگا رہی تھیں اور شوہر سے اس کا اِس درجہ ڈرنے پر مذاق اڑا رہی تھیں ۔

گھر واپس آتے ہوئے وہ پژمردہ سی تھی ۔چاروں نے تو اس کی ہار کی خوشی میں افسوس کے دو بول بھی اُسے نہ کہے تھے ،مگر اس پُرکشش سی لڑکی نے اُس کا نرم و ملائم ہاتھ دیر تک اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا تھا۔اور وہ اسے چھوڑنے باہر گیٹ تک آئی تھی ۔

رات یہی کوئی پونے نو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی ۔نوکر نے سُنا اور کچن میں آ کر اُسے بتایا کوئی افروز نامی خاتون بول رہی ہیں ۔

''افروز کون؟'' اُس کی پیشانی پر شکنیں سی نمودار ہو گئیں ۔

اپنے آپ سے سوال کرتی ہوئی وہ کوریڈور میں آئی اور ریسیور اٹھایا ۔چند لمحوں بعد وہ مسکرا رہی تھی ۔

''آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں تو صبح آ جایئے ۔میں ڈرائیور کو بھیج دوں گی ۔''

''وہ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہے؟'' اُس نے خود سے کہا اور دوبارہ کچن میں آ گئی ۔اوون میں مرغی روسٹ پر لگی ہوئی تھی ۔

گیارہ بجے شہلا کے جیٹھ کی بیٹی افروز اُس کے ہاں موجود تھی ۔چھوٹتے ہی اس نے کہا---

''میں کل سارا وقت آپ کے بارے میں ہی سوچتی رہی ۔آپ اتنی کیوٹ سی ہیں ۔اتنے امیر ماں باپ کی بیٹی ہیں تو پھر اپنے میاں سے اتنا کیوں ڈرتی ہیں؟ آنٹی نے مجھے کوئی واضح بات نہیں بتائی ۔اصل میں ہم سوسائٹی کی جس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں ۔اُس

میں بیویاں شوہروں سے نہیں بلکہ شوہر بیویوں سے ڈرتے ہیں۔''

خادمہ چائے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے آموجود ہوئی۔اُس نے چائے بنائی اور کپ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئی بولی۔

''لو چائے پیو۔''

''وعدہ کیجئے کہ اپنے بارے میں سب کچھ بتائیں گی۔''

پھر وہ دونوں لان میں آگئیں، دھوپ نکھری ہوئی تھی، اکتوبر کے آخری ایام کی کیاریوں میں گُلِ اشرفی اور گُلِ داؤدی کے پھول مسکرا رہے تھے۔شہتوت کی چھدری چھدری چھاؤں تلے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔

''تو تمہارا کہنا ہے کہ میں اپنے میاں سے اتنی کیوں ڈرتی ہوں جبکہ میں امیر بھی ہوں اور خوبصورت بھی؟''

وہ رُک گئی، اپنے سامنے سرسبز و شاداب اُگی گھاس کو دیر تک گھورتی رہی اور پھر بولی۔

''بھئی افروز وہ میرے ساتھ شادی کرنے پر رضامند نہیں تھا۔میں نے اُن کی منتیں کیں، اُس کے ہاتھ جوڑے، اُس کے پاؤں پڑی، تب کہیں جا کر وہ رضامند ہوا۔''

''اور اب تم مجھ سے پوچھو گی کہ وہ کیا ایسا یوسف لاثانی تھا جس پر میں مر مٹی اور اپنی عزت اور انا سب کو داؤ پر لگا دیا۔''

وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے مسکرا رہی تھی۔اُس کے خود ہی سوال کرنے اور خود ہی جواب دینے پر ہنس پڑی۔

''بس ایسے ہی دن تھے، خوشگوار اور چمکتے ہوئے۔سٹیشن پر بڑی گہما گہمی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا سٹیشن پر ہی اُمنڈ آئی ہے۔میں منجھلی پھوپھو کے ساتھ دادی اماں سے

ملنے جا رہی تھی۔ اُن دنوں ابھی ائیر کنڈیشنڈ گاڑیاں نہیں چلی تھیں۔ میں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی ایک کھڑکی سے باہر بھاگتی دوڑتی دنیا کو دیکھ رہی تھی۔ اُس وقت میری عمر یہی چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ تھی۔

وِسل ہوئی اور گاڑی چل پڑی اور اُس چڑھتی گاڑی سے بند دروازے کو دھکا دے کر ایک لڑکا چڑھا۔ وہ کوئی میری عمر کے لگ بھگ ہوگا۔ سفید براق قمیص اور پتلون پہنے ہوئے، اُس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس تھا۔ جسے اُس نے آتے ہی اوپر کی برتھ پر پھینک دیا اور خود دروازے میں دونوں ہینڈلوں کو پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اُس کے کپڑے بے شکن اور بے داغ تھے۔ ناک خوبصورت اور پیشانی کشادہ تھی۔ اُس کا چہرہ صحت و تندرستی کی لالی سے دمک رہا تھا۔ پتہ نہیں مجھے وہ کیوں اچھا لگا۔ چند سٹیشن بعد وہ جیسے چڑھا تھا اُسی طرح چھلانگ مار کر سٹیشن کی بھیڑ میں گم ہوگیا اور میرے لاشعور کی پہنائیوں میں براق کپڑے اور دمکتا ہوا چہرہ چھوڑ گیا۔ کبھی کبھی وہ مجھے یاد آتا۔''

''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا۔'' وہ افروز کی طرف دیکھتے ہوئے استفہامیہ انداز میں بولی۔

''کوئی آپ کے شعور سے لاشعور میں بس جاتا ہے۔ زندگی کی گہما گہمی میں آپ اُسے بھول تو جاتے ہیں، مگر کہیں اُس حادثے، اُس واقعے اور اُس ذات سے تعلق کوئی مطابقت آپ کو اُسے یاد دلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔''

خادمہ نے آ کر اُس کی گفتگو کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ بتانے آئی تھی کہ کھانا تیار ہے اور میز پر لگ گیا ہے۔ اُس نے اٹھتے ہوئے افروز کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔

''آؤ باقی کہانی کھانے کی میز پر۔''

اور کہانی پھر چل پڑی۔

''میرے ذہن سے وہ لڑکا نکل گیا مگر کبھی کبھی اُس کا تمکنت سے کھڑے ہونا، اُس کا بے داغ سفید لباس اور دمکتا ہوا چہرہ مجھے یاد آتا۔

میں بہت امیر گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود پڑھائی میں اچھی اور طبیعت کی سادی تھی۔ ایم ایس سی میں داخل ہوئے ابھی تیسرا دن تھا۔ کلاس میں سب لڑکے لڑکیاں بیٹھ گئے تھے۔ ڈاکٹر خیرات حاضری لینے کے بعد اپنا پہلا لیکچر شروع کر چکا تھا جب دروازے میں ایک لڑکا نمودار ہوا۔ سفید بے داغ لباس میں ملبوس، کشادہ پیشانی اور خوبصورت ناک اور صحت کی لالی سے دمکتا چہرہ۔

آناً فاناً جیسے بیچ کا وقت سرک گیا اور میرے دماغ کی پنہائیوں میں بیٹھا وہ لڑکا جست لگا کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ اُسی تمکنت سے کھڑا اُستاد سے اندر آنے اجازت طلب کر رہا تھا۔ اندر آ کر اُس نے ایڈمیشن سلپ ڈاکٹر حیات کو دکھائی حاضری لگوائی اور خالی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ ساری کلاس کے لڑکوں سے زیادہ خوبصورت تھا۔ ساری کلاس سے زیادہ ذہین تھا۔ بہت جلد اُس نے اپنا ایک امتیازی مقام پیدا کر لیا تھا۔ مجھے وہ پسند ضرور تھا مگر میں نے اُس کی طرف بڑھنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے یہ پسند نہیں تھا۔ میں خود کسی سے کم نہیں تھی۔

مگر اُس دن جب سارے کالج میں انتخاب کا شور وغل پھیلا ہوا تھا۔ وہ جنرل سیکرٹری شپ کے لئے خوب بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ میرے پاس آیا۔ میں اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ کھڑی گپیں ہانک رہی تھی۔ وہ عین میری ناک کی سیدھ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ پل بھر کے لئے ہماری نگاہوں کا تصادم ہوا۔ پھر جیسے گراموفون کی سوئی بجنے لگی۔ وہ اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ میں نے قینچی کی طرح اُس کی چلتی زبان کو یہ کہتے ہوئے بند کرنے کی کوشش

کی۔

''ہمارے پاس کوئی ضمانت نہیں کہ آپ منتخب ہو کر واقعی وہ سب کچھ کریں گے جن کا آپ ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔''

اپنے حسابوں میں نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔مگر وہ اطمینان سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''محترمہ ضمانت کبھی کوئی نہیں دیتا، معاملہ اعتبار اور اعتماد پر ہوتا ہے۔ پرکھ کی کسوٹی بعد میں آتی ہے۔''

''اعتبار اور اعتماد'' میری آواز میں طنز نمایاں تھی۔اُس نے محسوس کیا اور اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔

''آؤ تو صیف! مجھے بھینس کے آگے بین بجانے سے نفرت رہی ہے۔''

میرا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

اور افروز تم میری اِس بات پر شاید اعتبار نہیں کرو گی کہ میں نے اُسے ووٹ نہیں ڈالا۔مگر اِس سے کیا فرق پڑا۔وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوا اور پھر اُس دن جب میں اور شہناز سیڑھیاں اُتر رہی تھیں اور وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔میرا اُس سے ٹکراؤ ہوا۔وہ رک گیا۔اُس کی ایک ٹانگ زینے کے اوپر دوسری نیچے تھی۔میں نے دیکھا وہ مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں آپ کی تلاش میں تھا۔دراصل کل مجھے پارٹی دینا ہے اور آپ کو اُس میں شامل ہونا ہے۔''

''مگر! میں نے آپ کو ووٹ نہیں دیا تھا۔''

میری صاف گوئی پر وہ قدرے متعجب سا ہوا پھر بولا۔

''یہ تو مجھے معلوم ہی تھا مگر خیر آجانے میں کوئی حرج نہیں۔ دشمنوں کے ہاں بھی خوشی کے مواقع بھگتا لینے آج کی ڈپلومیٹک زندگی کا ایک حصہ ہیں۔''

''دشمنی اور وہ بھی آپ سے۔'' میں نے قدرے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنے حواس میں ہیں۔''

''سدا حواسوں میں رہتا ہوں۔'' وہ طنز سے مسکرایا۔

''بھئی سیدھا سادا آدمی ہوں۔ بات کو گھما پھرا کر کرنے کی بجائے براہ راست کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ دشمنی ہی تو تھی وگرنہ کلاس فیلو تھا آپ کا۔ ووٹ کیوں نہ دیا۔ اب سوال یہ کہ ایسا کیوں ہے؟ تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ خود میں بھی حیران ہوں۔''

اور وہ قلانچیں بھرتا یہ جا وہ جا۔ شہناز میرے سر ہوگئی کہ آخر بات کیا ہے؟ اب میں اُسے کیا بتاتی؟ حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے شاید یہ غصہ تھا کہ آخر اُس نے مجھے کیوں نہیں پہچانا۔ آخر وہ مجھے ہی کیوں یاد رہا؟

اُس دن ہم لوگ کلاس میں بیٹھے تھے۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ہماری سیٹیں ایک دوسرے کے ساتھ تھیں۔ اصل میں مَیں لیٹ تھی اور وہ مجھ سے بھی دیر میں آیا۔ یکا یک سیاہ بادلوں کا ایک ریلا آسمان پر چھا گیا۔ اچھا بھلا دن رات میں بدل گیا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اب ایسے میں کیمسٹری جیسے خشک مضمون کی پڑھائی ممکن ہی نہ تھی۔ ایسے میں ہی اُس نے مجھ سے پوچھا کہ

''آپ پارٹی میں کیوں نہیں آئیں؟''

''نہ آنے کی وجہ آپ تو جانتے ہیں پھر پوچھتے کیوں ہیں؟''

اور اُس اندھیرے (کیونکہ بجلی بھی نہیں تھی) اور شور وغل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس نے سیٹ پر رکھے میرے داہنے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میری طرف جھک کر بولا۔

''آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔''

اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔ میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔'' بس کانوں میں یہی بجنے لگا تھا۔

اور پھر ہماری دوستی ہوگئی۔ اُس کے ساتھ رہنے سے مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ اپنے لباس کی طرح اندر سے بھی بے داغ ہے۔ اُس کے خیالات اور سوچیں اتنی سلجھی ہوئی تھیں کہ اُس کی دوستی پر مجھے فخر محسوس ہوتا۔ اپنے اپنے گھریلو حالات پر ہمارے درمیان کبھی باتیں نہیں ہوئیں۔ اِس لئے میں یہ نہ جان سکی کہ اُس کا گھر گھرانہ کیسا ہے اور نہ ہی وہ میرے بارے میں جان سکا کہ میں کیسے ماحول کی پیداوار ہوں؟

سچی بات ہے کہ وہ نہایت ذہین اور محنتی سٹوڈنٹ تھا۔ لائبریری میں گھنٹوں بیٹھ کر پڑھتے نہ تھکتا۔ ہم کبھی خوشگوار سے موسم میں بیٹھے گپ شپ لگا رہے ہوتے تو اچانک ہی اُس کی نظر اپنی کلائی پر جاتی اور وہ اُٹھتے ہوئے کہتا۔

''جلدی چلو کلاس ہونے والی ہے۔''

ایسے میں کبھی کبھی میں اُلجھ جاتی یہ کیسا بدذوق ہے؟ ایسا اچھا موضوع زیر بحث تھا اور اُس نے کیسے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ میں کسمساتے ہوئی کہتی۔

''چھوڑو آج کلاس مس کر دیتے ہیں۔''

''سٹوپڈ! وہ مجھے آنکھیں دکھاتا۔ مجھے محنت سے جی چرانے والی لڑکیاں قطعی پسند نہیں۔''

واقعی اُس کے پاس اصول تھے جن پر مصالحت یا سودا بازی وہ کبھی نہیں کرتا

تھا۔ایک دن بارش ہو رہی تھی۔موسم بڑا رومانی تھا۔ایسے موسم میں پریکٹیکل کر کے نکلے تو میں نے اُس سے کہا۔

''چلو آؤ میرے گھر چلیں۔امی اور پپا سے ملنا۔''

ڈرائیور گاڑی لئے باہر موجود تھا۔اُس نے پہلے میری طرف اور پھر گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار پھر کسی دن سہی۔مجھے آج ڈھیر سارے کپڑے دھونا ہیں۔''

ہاں میں تمہیں یہ بتانا شاید بھول گئی کہ وہ ہوسٹل میں رہتا تھا۔اُس کے والدین پنڈی میں تھے۔ایک بار اُس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ اُس کا والد سی ایم اے میں کنٹرولر ہے۔

''چلو تم پہلے کپڑے لے لو۔میں گھر پر دھلائی کروا دوں گی۔''

اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔سٹوپڈ کہا اور میرے ساتھ ہی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے وہ اکثر سٹوپڈ ہی کہتا تھا اور سچی بات ہے اُس کی زبان سے یہ لفظ اتنے پیار سے نکلتا تھا کہ میں نے اِس کا کبھی برا نہیں منایا۔بلکہ بعض اوقات جب چند دنوں تک یہ لفظ سننے کو نہ ملتا تو میں کہتی۔

''ارے تم نے مجھے سٹوپڈ نہیں کہا؟''

''اچھا!'' وہ ہنس دیتا۔

یقیناً اُسے اندازہ نہیں تھا کہ میں اتنے امیر گھر کی لڑکی ہو سکتی ہوں۔محل نما گھر کے پورچ میں گاڑی کھڑی ہوئی تو اُس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''یہ تمہارا گھر ہے یا کہیں اور آئی ہو۔''

''نہیں بھئی میرا اپنا گھر ہے۔''

وہ میرے ساتھ اُتر آیا۔ڈارئنگ روم میں بیٹھا۔ممی پاپا سے ملا۔باتیں کیں اور دو گھنٹے بعد سب سے مل ملا کر چلا گیا۔ہمارے درمیان پیار و محبت کا اظہار کبھی نہیں ہوا تھا۔کچھ جذبے میرے نزدیک اظہار سے جاذبیت کھو دیتے ہیں۔شاید یہی نظریہ اُس کا بھی تھا۔یہ ضرور تھا کہ آنکھیں کبھی کبھی اِن جذبات کو ضرور بے نقاب کر جاتیں جو ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے موجزن تھے۔

ہم اپنا زیادہ وقت ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارتے تھے۔صبح یونیورسٹی آتے تو بہت کم ایک دوسرے سے الگ ہوتے۔ہمارے بارے میں ڈپارٹمنٹ میں کافی باتیں گردش کرنے لگی تھیں۔مگر ہمیں اُن باتوں کی ذرہ بھر پرواہ نہیں تھی۔ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ وقتِ رخصت ہم ایک دوسرے سے یہ کہنا نہ بھولتے۔

''اچھا خدا حافظ کل ملیں گے۔''

مگر اُس شام جب وہ میرے گھر کے کوریڈور کی سات سیڑھیاں اُتر کر پورچ میں آیا اور کار کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اُس میں بیٹھا۔اس نے میری طرف دیکھا ضرور مگر یہ نہیں کہا کہ

''اچھا کل ملیں گے۔''

اگلا سارا دن وہ غائب رہا۔میں شدید حیران کہ اُس نے کبھی کلاس مس نہیں کی وہ کہاں چلا گیا ہے؟ دوسرے دن بھی اور تیسرے دن بھی غائب تھا۔اُس کے روم میٹ سے پتہ چلا کہ وہ اچانک گھر چلا گیا۔

''کیوں؟''

میرے اِس سوال کا جواب میرے پاس تھا، نہ میرے پاس۔چھ دن بعد مجھے اُس کی صورت نظر آئی۔بے تابانہ میں اُس کی طرف بھاگی۔وہ مجھ سے ملا ضرور مگر عجیب سے سرد

مہری لئے ہوئے۔

کلاس سے فارغ ہوئے تو میں اُسے کھینچ کر اُس گوشے میں لے آئی جہاں ہم اکثر بیٹھتے تھے۔گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اُس نے ایک دم کہا۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ تم اتنے امیر گھر کی لڑکی ہو۔''

''تو تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

اُس کی گمشدگی کا راز تھوڑا تھوڑا میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔

''سٹوپڈ! اُس نے سنجیدگی سے یہ لفظ کہا اور سر جھکا لیا تھا۔اُس کی انگلیاں گھاس کے تنکے توڑ رہی تھیں اور اُس کا چہرہ مضطرب تھا۔

''بھئی کن اُلجھنوں میں تم گھر گئے ہو۔''

''دیکھو!'' اُس نے اپنی خوبصورت آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔انگشتِ شہادت ہوا میں لہرائی اور بولا۔

''میمونہ میں اتنے امیر گھر کی لڑکی سے کبھی شادی نہیں کر سکتا۔''

''کیوں کوئی کمپلیکس ہے تمہیں؟'' میں نے جواب دیا۔

''اِس وقت تو نہیں مگر اتنے بڑے لوگوں سے ناطہ جوڑنے سے ہو جائے گا۔''

اب صورت حال یہ تھی کہ میں اپنے دلائل سے اُسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ اپنے دلائل سے میری ہر بات کو کاٹے جا رہا تھا۔تنگ آ کر میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے شدید غصہ تھا۔اُس نے میری آنکھوں میں آنسوؤں کی پرواہ نہ کی اور نہ میری ناراضگی کی۔

ایک ہفتہ ہم ایک دوسرے سے کچھے کچھے رہے۔یہ ہفتہ قیامت بن کر گزرا۔مجھے اندازہ ہی نہ تھا کہ وہ میرے رگ و پے میں اِس درجہ اُتر گیا ہے۔نویں دن جب ہم پریکٹیکل

کر رہے تھے میں اُس کے پاس سے گزری اور اُس کے پاس اِک ذرا سا رک کر میں نے کہا۔

''سجاد خدا کے لئے اپنے اوپر اور میرے اوپر ترس کھاؤ۔ اِن خود ساختہ مفروضوں کی آڑ میں نہ خود کو ہلاک کرو اور نہ مجھے۔''

اُس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر اپنے کام میں جت گیا۔ پریکٹیکل ختم ہونے کے بعد ہم باہر نکلے تو میں اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی اور آخر کار اُسے تنہائی میں کھینچ لانے میں کامیاب ہوگئی۔

''بھئی میں تو تمہیں متوسط گھر کی لڑکی سمجھتا تھا جس سے میرا نباہ ہونا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اب مجھے کیا علم تھا کہ میں ہاتھیوں سے دوستی پال رہا ہوں۔ میرے گھر کے دروازے بہت نیچے ہیں۔ گزرنے میں لہولہان ہو جانا پڑے گا۔''

''جاؤ۔ بزدل کہیں کے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''یہ بات بھی نہیں، تم سمجھتی کیوں نہیں؟ عملی زندگی میں حقائق کا سامنا جذبات کی دھجیاں اُڑا دیتا ہے۔ میں مرد ہوں۔ ایسا مرد جو اپنے گھر پر حکمرانی کرتا ہے۔ اپنے زور بازو پر اعتماد کرتا ہے۔ تمہیں وہ آزمائش مہیا نہیں کر پاؤں گا جن کی تم عادی ہو۔ ساری محبت اور پیار چٹخ جائے گا۔ تو تو میں میں شروع ہو جائے گی۔ تم چیخو گی اور میں بیوی کا چیخنا چلانا برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا انجام جانتی ہو کیا ہوگا؟''

اور میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ سارا فائنل ایئر ایسی بک بک جھک جھک میں گزرا۔ اور میں اگر یہ کہوں کہ میرے آنسوؤں نے اور میری محبت نے اُسے توڑ دیا تو غلط نہیں ہوگا۔

''شادی میں کوئی رکاوٹ؟'' افروز نے پوچھا۔

میں مسکرائی اور دیوار پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

''کوئی نہیں۔اصل میں ممی پاپا اس لحاظ سے بہت اچھے ہیں کہ وہ اولاد پر اپنی رائے نہیں ٹھونستے۔''

سجاد کے والدین ہمارے ہاں آئے۔سجاد بھی اُن کے ساتھ تھا۔پاپا نے سجاد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں میری بیٹی نے پسند کیا ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ پسند مستقبل میں کیسی ثابت ہوگی؟ میں اس نظریئے پر بھی یقین نہیں رکھتا کہ تجربہ کار آنکھیں جوان آنکھ کی نسبت بہتر اور محفوظ مستقبل کی ضامن ہوتی ہیں۔بس یہ مقدر کے چکر ہیں۔شادی ایک جوا ہے اور جوئے میں ہار جیت تو چلتی ہے۔''

وہ ہنس پڑے۔مگر سجاد نے یہ ضرور کہا۔

''آپ ہمارے لئے دعا تو ضرور کر سکتے ہیں۔''

''اوہو ہاں۔'' پاپا سجاد کی اس بات پر خوش دلی سے مسکرائے۔شادی ہوگئی۔پاپا نے مجھے دو کنال رقبے میں گھری ہوئی کوٹھی جہیز میں دی۔سجاد کو گاڑی دی۔

سجاد کھاتے پیتے گھر کا بیٹا ہونے کے باوجود بہت غریب نواز ہے۔فضول پیسے کے ضیاع کو وہ پسند نہیں کرتا۔امیر لڑکیوں کے جو مشاغل ہوتے ہیں وہ میرے پہلے ہی بہت کم تھے۔مگر یہ کارڈز کا سلسلہ اکثر و بیشتر چلتا رہتا تھا۔سجاد کو ایک بار اس کا علم ہوا تو اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔''

اور پھر بڑی دل نشین سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔وہ تھوڑی دیر تک مسکراتی رہی۔سنسنی خیز سی چمک اُس کی آنکھوں میں تیرتی رہی۔پر وہ بولی۔

''تو میری جان بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اُس سے نہیں ڈرتی۔اپنے دل

سے مجبور ہوں۔ میں مانتی ہوں کہ میں نے سرکشی دکھائی یا اپنے بڑے ہونے کا احساس دلایا تو معلوم ہے وہ مجھے پٹخ کر زمین پر دے مارے گا اور پلٹ کر یہ تھوڑی دیکھے گا کہ میں کتنی ٹوٹ گئی ہوں؟ اور میرے ٹوٹنے سے وہ خود کون سا ثابت رہے گا؟ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ پر کبھی ظاہر نہیں کرے گا۔ نئی زندگی میں پچھتاووں کا کوئی دخل ہی نہیں ہے۔''

☆☆☆

ایک حقیقت ایک کہانی

اُس نے خُود سے کہا۔۔۔۔"سر پر جانے مٹّی کیوں ہُوا جا رہا ہے اور من بھی کیسا اُجڑا، اُجڑا ہے؟ کسی کام کرنے پر طبیعت ہی مائل نہیں۔"

یُوں کام کرنے کی اُسے کوئی ضرورت نہ تھی۔اُس گھر میں تھوک کے حساب سے نوکر تھے۔پر رسوئی گھر کا بیشتر کام اسے ہی کرنا پڑتا تھا۔اُس کا سسر ڈاکٹر جو چند سال قبل بنگال کا وزیر صحت تھا کھانے پینے اور برتنوں کی صفائی کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی محتاط رہتا تھا۔یوں گھر میں کچھ زیادہ افراد بھی نہ تھے۔وہ تھی اُس کا سسر اور شوہر۔

ملازم چھوکرا سینی لیے اندر آیا۔اُس نے رومال میں لپٹی چپاتیوں کو کھول کر دیکھا یہ جاننے کے لیے کہ اُس کے بیمار سسر نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔وہ ملول ہوئی تین روٹیوں میں سے ڈھائی جوں کی توں تھیں اور وہ بھی لکڑی ہو رہی تھیں۔

"رام بنگال کی عورت کو کبھی اچھی روٹی بنانی نہ آئے گی۔اب اگر یہ نرم ہوتیں تو وہ کم از کم ایک تو ضرور کھاتا۔"

اُس نے سینی پرے کی پتیلی کا ڈھکن اٹھایا، ہلش ماچھ کی خوشبو اس کے نتھنوں

میں گھسی پر اس کی بھوک نہ چمکی۔اداسی سے اُس نے باہر دیکھا۔رسوئی گھر سے اُسے اپنی راجباڑی کا کشادہ آنگن نظر آرہا تھا۔کرشنو چوڑا کے درختوں میں آگ لگی تھی۔کیلے کے درخت پھل سے جھکے پڑے تھے۔مالوتی کے بوٹے نکھرے نکھرے تھے۔اوپر بادل گہرے تھے۔بارش کھل کر برسی تھی اور ابھی اور برسنا چاہتی تھی۔

وہ اٹھی۔ساڑھی کا آنچل اس نے پشت پر پھینکا۔کونے سے بندھا ہوا چابیوں کا گچھا کمر پر لگاتو اسے خفیف سی چوٹ کا احساس ہوا۔آلتا لگے گورے گورے ننگے پاؤں فرش پر بیزاری سے مارتی وہ کمرے میں آگئی۔دُرگا کی خوبصورت مورتی سامنے کھڑی تھی۔اُسے میمن سنگھ کے کمہاروں نے آنے والے دُرگا پوجا کے تہوار کے لیے تراش کر اُس کے سسر کو خصوصی طور پر بھیجا تھا۔

''کون جانے ہم یہ تہوار اِس سال منا بھی سکیں گے؟'' ایک آہ اس کے دل سے نکلی اور نم آنکھوں سے وہ مورتی کے سامنے دوزانو ہوگئی۔

یہاں بہت شور تھا،اس عظیم الشان ورثہ،جس کا نام ہندوستان تھا کو تقسیم کرنے کی خطرناک سازشیں ہورہی تھیں۔اُسے یہی سمجھ نہ آرہی تھی کہ یہ پراسرار سا ہندوستان جو فلسفہ، آرٹ،موسیقی،ادب اور تصوف کی گتھیوں میں الجھا ہوا ہے اُس کی یہ اقدار ایک سے دو کیسے ہو جائیں گی؟

اُس کا دل یوں بھی ڈوبتا تھا کہ اگر یہ ایک سے دو ہوگیا تب وہ کلکتہ اپنے ماں باپ کے گھر جلدی جلدی نہ جاسکے گی۔پاسپورٹ اور ویزا کے چکروں میں الجھ جائے گی۔کیونکہ اُس کا سسرا پنی راجباڑی اور زمین چھوڑ کر کلکتہ نقل مکانی پر تیار نہ تھا۔اُس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔

تو میرا خوبصورت کلکتہ،جسے مشرق کا لندن کہا جاتا ہے، مجھ سے چھن جائے

گا۔بارک پور کے عالی شان کنٹری ہاؤس اور دریا کے کنارے کنارے گارڈن ہاؤس دیکھنے میں نہ آئیں گے۔میرے کلکتہ کے عالی شان ہوٹل،اس کی فراخ سڑکیں،چورنگی کے بھانت بھانت کے لوگ،دھرم تلہ میں رہنے والی میری موسیاں،مانک تلہ کے عالی شان مکانوں میں رہنے والے میرے چچا جن کے برآمدوں میں فرن کے پتے خنک ہوا سے جھومتے ہیں تو جیون چند لمحوں کے لیے بے حد سُندر لگتا ہے یہ سب میرے لیے اجنبی ہو جائے گا۔

اُس کی آنکھیں چھلکیں اور موٹے موٹے آنسو گالوں پر بہتے رہے۔

باہر کوئی جلوس گزر رہا تھا۔۔۔۔پاکستان پاکستان ہو رہا تھا۔نا قابلِ برداشت درد اُسے اپنے سینے میں محسوس ہوا۔وہ اِس لفظ کو سننا نہیں چاہتی تھی۔اُس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے۔

''یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ہمیں صرف سوراج چاہیے۔''

تب پانچ فٹ پانچ انچ کا ایک نوجوان جس کے بال سیاہ اور گھنگریالے تھے اور جس نے باریک کرتا اور دھوتی پہن رکھی تھی وہاں آیا۔اُس نے گاجر رنگی ساڑھی میں اُسے کھڑکی کے پاس کھڑے دیکھا جسے وہ صرف تین ماہ پہلے بیاہ کر یہاں کومیلا لایا تھا۔وہ کچھ دیر اس کے پیچھے کھڑا رہا۔پھر اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھ رکھتے ہوئے بولا۔

''کیا دیکھتی ہو باہر سومیتا؟وہی پرانی چیزیں ہیں۔''

اور اس نے رخ پھیرا۔اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ بے چین ہو گیا۔انگلیوں کی پوروں سے اُس کی آنکھوں کو بند کیا۔آنسو اِدھر اُدھر ڈھلک گئے۔پر اس کے ساتھ ہی وہ سسک پڑی۔

''رنیش کیا ہونے والا ہے؟میرا پیل پایوں جھلمبیلوں کے برآمدوں والا گھر مجھ سے چھن جائے گا۔میں اپنے ماما کی بیٹیوں کے ساتھ مل کر اب کالی گھاٹ نہ جاسکوں گی

ٹیگور کی چتر نگدا کے گیت گاتے ہوئے میری بہنوں کی آنکھیں بھر بھر آئیں گی۔ بھارت ناٹیم کرتے ہوئے شنیلا کہے گی۔۔۔

''سومیتا دیدی کے بنا کچھا چھا نہیں لگتا۔''

رنیش کلکتہ مجھ سے جدا ہو رہا ہے۔ آبی راستے بند ہو رہے ہیں۔ ریلیں نہیں چلا کریں گی۔ حدیں کھنچ جائیں گی اور اِس پار اور اُس پار خلیجیں حائل ہو جائیں گی، جنہیں من چاہنے پر پاٹا نہیں جائے گا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ رنیش بھارت ماتا کو اکھنڈ کیوں کیا جا رہا ہے؟

اور اُس نے اُس جوڑے سے نکلی بالوں کی ایک پتلی لٹ کو انگلیوں سے مسلا اور رسان سے بولا۔۔۔''حوصلہ کرو سومیتا! انسانوں پر بہت کڑے وقت آتے ہیں۔''

''یہ تم کہتے ہو میرا تو من جیون سے اُوبھ گیا ہے۔''

اور اُس کے ہونٹوں پر بے بس سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔۔۔

''حالات جس نہج پر تیزی سے جا رہے ہیں۔ ان پر اس سمے ہمارا کوئی بس نہیں۔ میں مانتا ہوں سومیتا اسے برداشت کرنا بہت کٹھن ہے پر اسے برداشت کرنا ہوگا۔''

وہ رکا۔ گہری اداسی سے باہر دیکھا۔ کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے اور پتے ہوا کے زور سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ تب اس نے اس کی لانبی پلکوں کو چھوا اور بولا۔

''ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ اگر حالات سے فائدہ اٹھایا گیا اور کوشش صحیح سمت لگائی گئیں تو یقیناً ایک دن تم یہ ضرور سنو گی کہ ٹکڑے کرنے والے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ آؤ چلو کھانا کھائیں۔''

اُس نے گیلی آنکھوں کو اوپر اٹھایا۔ اُن میں بے یقینی نمایاں تھی۔ اس کے شوہر نے اُسے پڑھا اور کہا۔

''سومیتا! شکست نے کبھی سبق نہیں سکھایا۔اُس سے سبق سیکھنا پڑتا ہے اور ہم نے سیکھنے کا عزم کرلیا ہے۔''

اور جب اُسے نوکر نے یہ اطلاع دی کہ باہر منورنجن گپتا آئے ہیں تو ایک لمحے کے لیے وہ حیران ہوا۔اُس نے خادم کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں شناخت کا یقین پا کر اس نے ستار خود سے جدا کیا اور اپنی دھرم پتنی کی طرف جھکا جو قالین پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔

''سومیتا! تم نے سُنا گپتا آیا ہے۔''

اُس نے اپنی بیمار آنکھوں کو پوری طرح کھولا اور نحیف سی آواز سے کہا:

''میں حیران ہوں گپتا دادا (ہندوستان بنگال میں رشتے کے بڑے بھائیوں کو عام طور پر دادا کہتے ہیں) اتنے عرصے بعد کہاں سے ایکا ایکی آ گیا ہے۔''

''تھا تو یہیں شمالی ہند میں ہی۔بس ہڈحرام ہے۔پتر لکھنا تو عذاب سمجھتا ہے۔''

''میں خوب لڑوں گی۔ہمیشہ کہتا تھا تیرے کو نا پر تجھے بہت نفیس تحفہ دوں گا۔تحفہ دینا تو درکنار خود بھی نہ آیا۔رنیش یہیں بلا لو نا۔''

''یہاں اُس نے اُس کی ملگجی ساڑھی اور بکھرے بالوں کو بغور دیکھا اور بولا۔

''یہاں بلانا کچھ مناسب نہیں رہے گا۔چلو میں تمہیں ڈرائنگ روم میں لے چلوں وہ بھی وہیں ہوگا۔''

اور جب اُس نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ چکرا کر تکیوں پر گری۔اُس کے دھرم پتی نے بیتاب ہو کر اس کے نازک سے وجود کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔اس کا رنگ پیلا ہو رہا تھا اور سانس بہت تیز تھا۔اُس کی سندری پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے اُس نے غمگین آواز میں کہا:

''سومیتا! کمر تو میری بھی ٹوٹ گئی ہے۔ پر تم نے یہ کیسا روگ جان کو لگا لیا ہے؟ یہ غم تو مردوں کے کرنے کے ہیں۔ کوئی یوں بھی ہلکان ہوتا ہے؟''

اُس نے انناس کا رس گھونٹ گھونٹ اسے پلایا اور جب اسے کچھ توانائی محسوس ہوئی تو بولی۔

''رنیش! تم جاؤ۔ گپتا دادا انتظار میں ہوگا۔''

اسے کمرے ہی میں چھوڑ کر وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ طویل عرصے بعد ملنے والے دوست جب اچھی طرح مل چکے تو اُس نے کہا:

''تمہیں مبارک ہو، سومیتا کیسی ہے؟''

''اب کیا بتاؤں اِس تقسیم نے تو اس پر اس درجہ ذہنی و جذباتی اثر ڈالا ہے کہ وہ اس نئے وجود سے بھی محروم ہوگئی ہے جو اس کے اندر تین ماہ سے پرورش پا رہا تھا۔ تمہارے آنے سے قبل میں اسے موسیقی سے بہلا رہا تھا۔ چلو! وہ تمہیں ملنا چاہتی ہے۔''

وہ اپنے اس رشتے کے بھائی کو تقریباً دو سال بعد دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ دبلا ہو رہا تھا پر اس کا رنگ نکھرا ہوا تھا۔

''گپتا دادا تم نے تو بنگال سے اپنا ناطہ ہی توڑ لیا ہے۔ ادھر جی بہت لگ گیا ہے تمہارا کیا؟''

وہ دیر تک ذاتی باتیں کرتے رہے۔ جب رنیش نے اُس سے پوچھا:

''کچھ اُدھر کا حال سناؤ۔''

''حال سب جگہ ایک سا ہے۔ میں کہتا ہوں ہندو کو اب سیاست سے کنارہ کشی کر لینی چاہیے۔ اب یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔''

''پر گپتا یہ طوفان ہی کچھ ایسا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔''

''ارے لعنت بھیجو اِس طوفان پر۔۔۔کانگریس کی سیاست پھر کیا ہوئی''۔۔۔ یعنی کل آپ سے خالصتان کا مطالبہ ہوگا۔گاندھی جی تھال میں ڈال کر انہیں پیش کر دیں گے۔''

''بھئی گاندھی کو موردِ الزام تو مت ٹھہراؤ۔۔۔اُن جیسا زیرک اور نبض شناس لیڈر ہندوستان کبھی پیدا نہیں کر سکتا۔اب دیکھو تحریکِ خلافت کی افادیت صرف گاندھی نے سمجھی اور مسلمانوں کی اِس تحریک کی حمایت کر کے سالوں تک ان کے مسلمہ لیڈر بن کر بندے ماترم اور گاندھی کی جے کے ان سے بھی نعرے لگوائے۔

حماقتیں تو کانگریس کے لیڈروں نے کیں۔اب سوامی شردھانند کو شُدھی تحریک کا برسرِ عام پرچار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔مسلمان جذباتی اور احمق قوم جو کانگریس کی تحریکِ خلافت میں اسی شردھانند کو دلی کی جامع مسجد کے منبر سے خطاب کرواتی ہے۔''

''مگر میں کہتا ہوں''۔۔۔گپتا کی آواز جوشِ غضب سے کانپ رہی تھی۔

''یہ ہمارے پرکھوں کا ہند ہے۔باہر سے آئے ہوئے ان اٹھائی گیروں کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ اس کا بٹوارہ کرتے پھریں اور تمہارے اس بنگال نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔سارا عاشق ہے جناح پر۔تم لوگ بھی یار بونگے نکلے فضل الحق کو بھی استعمال نہ کر سکے۔''

''واہ گپتا۔۔۔فضل الحق کی حقیقت سن لو پھر کہنا۔''

''میمن سنگھ کا ایک سٹیشن جمال پور ہے جہاں ایک بڑا جلسہ تھا۔فضل الحق جونہی سٹیج پر آئے لوگوں نے شور مچا دیا۔۔۔''نہیں،واپس،واپس،واپس جاؤ فضلو بھائی! ہم تمہیں سننا نہیں چاہتے۔۔۔''

فضل الحق حیران پریشان چند لمحے سوچنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ

قبرستان کی طرف چلنے لگے۔اب لوگ حیران۔انہوں نے بھی تعاقب کیا۔قبرستان کے عین مرکز میں کھڑے ہوکر انہوں نے شیر جیسی آواز میں قبروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔۔۔''دیکھ لو میرے سنگی میرے ساتھیو! تمہارے بیٹوں اور عزیزوں نے مجھے سننے سے انکار کر دیا ہے۔۔۔''

اتنی جذباتی اپیل پر مجمع نے رونا شروع کر دیا اور ساتھ ہی شیر بنگال جندہ باد کے نعرے شروع ہو گئے۔

مگر الیکشن میں ووٹ جناح کو دیے اور فضل الحق کے امیدوار کی ضمانت ضبط کروا دی۔

''اب دوسرا واقعہ سن لو ذرا۔۔۔باقر گنج جو فضل الحق کا آبائی وطن ہے۔وہاں کے طلبہ نے قائداعظم کو لکھا:

''ہم آپ کو خوش آمدید کہنے کو بے قرار ہیں۔آپ کی آمد کی خبر نے ہمارے تنِ مردہ میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔آپ خود دیکھیں گے کہ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے شیر بنگال کو ہم نے اس کے اپنے ضلع میں کیسے زیر کیا ہے۔''

آخر میں طلبہ نے لکھا تھا:

''ہم ہیں آپ کے چاہنے والے۔''

''ابھی گپتا وقت نہیں آیا۔۔۔تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو والی پالیسی پر چلو۔''

''کیا کہتے ہو بنگال کے بارے میں؟''۔۔۔گپتا نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''کہنا کیا ہے۔پہلے کلکتہ کی منڈی تھا اب پنجاب کی ہو جائے گا۔''

رینش نے بے حد گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

''پر انہیں اپنی کثرت کا بہت خیال ہے۔'' گپتا بولا۔

رنیش کھلکھلا کر ہنسا۔

''کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔کثرت پر نازاں ہیں پنجاب اِس پر چھائے گا نہیں تو اور کیا ہوگا او ر دیکھو یہی اس کا مقام گرفت ہوگا۔''

گلابی جل پد و دُھوپ میں چمکتے تھے۔کنارے کنارے پھیلی جل بیل خوبصورت لگتی تھی سبزی مائل پانی میں ناچتی پھرتی مچھلیاں دل لبھاتی تھیں اور پوربی ہوائیں سرسراتی پھرتی تھیں۔

پر یہاں پوکھر میں تیرتے ہوئے اسے یہ سب قطعی اچھا نہ لگ رہا تھا۔کیونکہ ابھی ابھی اُسے یوں لگا تھا جیسے اس نے کہا ہو۔۔۔''سویتا! تم تیرتے میں جل پری لگتی ہو۔''

اُس نے گردن گھما کر اپنی پشت کو دیکھا تھا اس کے لانبے سیاہ بال پانی میں مچلتے تھے اور آسمانی ساڑھی پھولی پڑ رہی تھی۔

''کان ہی بجتے ہیں نا میرے۔'' اُس نے دکھ سے سوچا اور چاہا کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دے اور بہت نیچے گہرائیوں میں ڈوب جائے۔

تب پوکھر کا چکر پورا کیے بغیر وہ کنارے کی اَور آ گئی۔سیڑھیوں پر بیٹھ کر اُس نے خالی خالی ویران آنکھوں سے اپنے چاروں اور دیکھا۔اُس کا سڈول گداز جسم گیلی ساڑھی میں سے پھوٹا پڑتا تھا۔۔۔''ہنسی چھن گئی ہے کہ اب وہ نہیں جو کہے گا سویتا یہ تم ہنسی ہو یا کہیں گھنٹیاں بجی ہیں۔''

اور جب وہ تولیے کا گاؤن کندھوں پر ڈالے راجباڑی کے عقبی کمروں کی اور بڑھ رہی تھی اس نے چلتے چلتے خود سے کہا تھا:

''جدائی اذیت ناک ہے جسم اور روح فرقت کی آگ میں جلتے ہیں اور یوں ہی

جلتے جلتے ایک دن راکھ ہو جائیں گے۔تم نظریات بدلنے کی جدوجہد میں گم ہو اور کون جانے کب تک گم رہو گے۔یہاں ڈستی تنہائیاں اور خطرات کی سولیاں ہیں جن کے پھندے ہر آن گردن کی اور بڑھتے نظر آتے ہیں۔''

اُس نے کمرے میں آ کر ساڑھی بدلی۔ناریل کا تیل سر میں ڈالا، کنگھی کی، مانگ میں سیندور انڈیلا اور ماتھے پر ٹیکہ لگایا۔وہ یہ سب کام کرتی رہی پر من ویران ہی رہا۔

ابھی شام ہونے میں دیر تھی اروما اور سوشیل،اس کے دونوں بچے سو رہے تھے۔نوکر اُسے بتا گیا تھا کہ وہ بلیدان کے لیے بکرا خرید لایا ہے۔پر ابھی کالی مندر جانے میں دیر تھی۔وہ عبادت خانے کی اور چلی گئی جہاں سرسوتی اور دُرگا کی مورتیوں کے سامنے بیٹھی وہ اشلوک پڑھتی رہی۔اور گھنٹہ بھر بعد جب وہ وہاں سے اٹھی تو ویسی ہی بے سکون تھی۔

اِس سے کیا بہتر نہ تھا کہ ہم میں سے ایک موت کی بھینٹ چڑھ جاتا۔بھگوان صبر تو دے دیتا اب تو یوں لگتا ہے جیون یوں ہی غم کی صلیب پر چڑھے چڑھے گزر جائے گا۔

اور جب وہ کالی ماتا کے چرنوں میں چڑھاوے کی لیے تھال میں پھول، بتاشے، ناریل اور کیلے سجا رہی تھی اُسے رنیش کا خط ملا جسے اس کا سسر خصوصی رازداری سے اُسے خود دینے آیا تھا۔اس نے سارے کواڑ کھڑکیاں بند کیں اور پڑھنے بیٹھ گئی۔اُس کا جسم لرز رہا تھا اُس کی آنکھوں سے بھادوں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

''رنیش''۔۔۔اس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹا۔۔۔''مجھے ہندو دھرم اور سواستک کی عظمت کے لیے جدوجہد کرنے کا سبق نہ دو۔میں نے چاہا خود کو تمہارے فلسفے میں گم کر دوں۔دھرم میں ڈوب جاؤں ہر لمحے تمہاری ان کاوشوں کی بارآوری کے لیے دعائیں مانگتی رہوں جو تم پاکستان کو ختم کرنے کے لیے کر رہے ہو پر یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی میں بے سکون ہوں۔یہ آنکھیں تمہاری دید کو ترس گئی ہیں رنیش۔''

اُس نے برستی آنکھیں پونچھیں اور خط پڑھنے لگی۔القاب و دعا کے بعد اُس نے لکھا تھا۔۔۔"سومیتا! یہ تم ہو، کمال عبداللہ کے ہاتھ بھیجی گئی تصویریں اِس وقت میری میز پر پڑی ہیں۔تمہاری آنکھیں ویران ہیں اور چہرے پر یاس کے سائے۔سومیتا! انہیں دیکھ کر میرا دِل کٹا ہے۔میں جو راہ چن بیٹھا ہوں اس پر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں۔ہندو دھرم اور سواستک کی عظمت ہندو جاتی سے قربانیاں چاہتی ہیں۔میں نے قربانی دی ہے اور دے رہا ہوں۔میرا دل اور پاؤں دونوں لہولہان ہیں۔مجھے غم نہیں کیونکہ منزل کے نشان نظر آنے لگے ہیں۔۔۔تمہیں چند دن بعد معلوم ہو جائے گا کہ حکومتِ پاکستان نے میرا اور شنکھرام کا پورِبو بنگال میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا ہے۔میں تمہیں کہوں گا حوصلہ رکھو اور اچھے دنوں کا انتظار کرو۔یہ میرا وچن ہے تمہیں کہ تم کلکتہ پاسپورٹ اور ویزہ کے بغیر آؤ گی۔"

☆☆☆

انقلاب

حقیقت یہ ہے کہ صوبائی دارالخلافہ کے اِس بڑے شہر میں دو کمروں اور چھوٹی سی انگنائی والے گھر کا ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ کہنے کو اُس کا میکہ یہاں آباد تھا۔ باپ کا بڑا سا محل نما گھر تھا۔ اُسے رہنے کو دو ایک کمرے مل سکتے تھے مگر وہ بھاوجوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ میاں طبیعت کا تیز ہی نہیں غصیلا بھی تھا۔ ذرا سی بات پر منہ پھلا لیتا اور جو کہیں شامت اعمال سے وہ کچھ کہہ بیٹھتی تو بس اس کے بخیے اُدھڑ جاتے۔ ایسے لڑائی جھگڑوں والے تماشے گھر میں آئے دن ہوتے رہتے۔ مگر قصہ یوں تھا کہ ان سے کوئی دوسرا واقف نہ تھا۔ وہ فیصل آباد میں تھی۔ مگر اب شوہر کا تبادلہ ہوگیا تھا اور اُسے ایک چھوٹا سا گھر چاہیے تھا۔ جون کی کڑکتی دھوپ نے آٹے دال کا بھاؤ اسے بہت جلد سمجھا دیا۔ اپنے علاقے کا کوئی گلی محلّہ اس نے نہیں چھوڑا۔ ملنے ملانے والوں نے بھی جہاں جہاں گھر ملنے کی نشان دہی کی وہیں پہنچی۔ مگر بات نہ بنی۔

ناشتے کے فوراً بعد وہ گھر سے نکل پڑتی مکان در مکان دستک دیتی اُس فقیر کی طرح جس کے چہرے پر عاجزی اور مسکینی کا رنگ بکھرا ہو اور ہاتھ میں خیرات کا کشکول پکڑا ہو۔ سارا ساون بھادوں اس نے سڑکوں کی پیمائش میں گزار دیا۔ تنگ آ کر اُس نے ہاتھ اوپر

کر دیئے اور بھائی بہنوں سے کہہ دیا۔ بھاڑ میں جائے مکان۔ زندگی میں ایسی ذلت کبھی نہیں اٹھائی۔ وہ غریب بھی اپنے طور پر کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ایک بھائی نے ایک دن کہا بھی:

''بھئی عجیب ضد ہے تمہاری۔ یہیں رہ جاؤ نا اتنا بڑا گھر ہے۔''

''تم نہیں سمجھتے محسن بھرم کھل جائے تو کچھ باقی نہیں رہتا۔''

اور پھر جیسے اُس کی ساری مصیبتیں ختم ہوگئیں۔ سُکھ کا گہرا اور لمبا سانس اُس نے بھرا اور نئے گھر میں سامان سیٹ کرنے میں جُت گئی۔ یہ ہر لحاظ سے موزوں مکان تھا۔ اُس کے میکے سے زیادہ دُور بھی نہیں تھا۔ اِس آبادی میں بیشتر نئے مکان تھے۔ یہ مکان دو حصّوں پر مشتمل تھا۔ آدھے میں مالک مکان رہتی تھی۔ گھر کی مناسب سی آرائش و زیبائش سے فارغ ہو کر اُس نے سوچا کہ ہمسایوں سے واقفیت پیدا کی جائے۔

سویرے ہی کام کاج سے فارغ ہوگئی۔ کام تھا بھی کتنا؟ دو میاں بیوی اور تیسرا مہمان متوقع۔ میاں کو ناشتہ کروایا، دفتر بھیجا، موٹی موٹی صفائی کی اور فارغ۔

ساتھ والے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ کسی قدر جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ آنگن میں بچھے بڑے تخت پوش پر ایک معمر خاتون آنکھوں پر موٹے شیشے کا فریم چڑھائے رضائی کے ڈورے اُدھیڑنے میں مصروف تھی۔ اُس نے سلام کیا تو خاتون نے اٹھ کر اُس کے شانوں پر ہاتھ پھیرا۔ خیریت دریافت کی اور میاں کے بارے میں پُوچھا۔ پاس رکھے مُوڑھے پر بیٹھنے کو کہا۔

باتوں سے پتہ چلا کہ وہ بیوہ ہے۔ دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکی نیروبی بیاہ کر گئی جہاں سے نکالے جانے کے بعد وہ اب اپنے شوہر کے ہمراہ لندن میں ہے اور شہریت حاصل کرنے کے چکر میں پانچ سال سے پہلے وطن نہیں آئی۔

اُس کا بیٹا ڈاکٹر تھا اور امریکن عربیہ آئل کمپنی دہران کے آرامکو ہسپتال میں تعینات تھا۔ پچھلے ماہ اُس کی شادی ہوئی تھی اور ڈیڑھ ماہ کی چھٹی کاٹ کر ابھی ہفتہ بھر پہلے اپنی ڈیوٹی پر گیا تھا۔ صحن میں پھرتی چھوٹی سی لڑکی کو (جو لباس اور حُلیے سے نوکر لگتی تھی) کمرے میں سوتی دُلہن کو اٹھانے کے لیے کہا۔ اُس نے حیرت سے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور اپنے آپ سے دِل ہی دِل میں بولی۔

یہ کون سا وقت ہے سونے کا۔ کسی بہت ہی اونچے گھر کی لڑکی لگتی ہے۔ متوسط طبقے کی لڑکیاں اسی عیاشیوں کی کہاں عادی ہوتی ہیں۔

پھر اُس نے دلہن کو دیکھا بس واجبی سی صورت تھی۔ ناڑ سا قد عمر بھی اچھی لگتی تھی۔ سویٹ کریپ کی قمیص کا گلا اتنا کھلا تھا کہ دور بیٹھی ہونے کے باوجود سینے کے اُبھار اُسے صاف نظر آتے تھے۔

''بیٹی کچھ چائے پانی لاؤ مہمان کے لیے۔''

''کوئی بات نہیں۔ بستے رستے گھروں سے خالی نہیں جایا کرتے۔ ہر کوئی اپنے گھر سے کھا کر ہی آتا ہے۔''

روئی کا ڈھیر ایک کونے میں لگاتے ہوئے اُس نے کہا:

''یہ یتیم تھی۔ تیرے میرے دروازے پر پڑی رہتی تھی۔ میری بیٹی کی سسرالی رشتے دار ہے بیٹی۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں۔ بس میں نے تو سوچا کملی والا یتیموں کے سر پر دستِ شفقت رکھتا تھا۔ میں بھی ایسا ہی کروں شاید عاقبت سنور جائے۔ بیٹا رضامند نہیں تھا بمشکل اُسے رضامند کیا۔''

چائے پی کر وہ آ گئی۔ خاتون کی خوش اخلاقی، سلیقے اور رکھ رکھاؤ نے اسے متاثر کیا تھا مگر اُس کا دل خانوں میں بٹ گیا تھا۔ مذہبی خانہ اُس کی خدا خوفی اور اتنی بڑی قربانی پر

اُسے ایک عظیم عورت کہنے پر مُصر تھا بلکہ جدیدیت کا خانہ جنت خریدنے کے لالچ میں اتنے پڑھے لکھے بیٹے کی ایسی لڑکی سے شادی پر جو کسی طور بھی اُس کے شایانِ شان نہیں تھی اُسے خودغرض اور مطلبی ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ کشمکش زیادہ بڑھی تو اُس نے سر جھٹک کر اپنے آپ سے کہا:

''بھئی مجھے کیا؟ یہ سارے جہاں کا درد میرے جگر میں کیوں گھس آتا ہے؟ وہ ماں، وہ بیٹا اچھا ہو یا بُرا وہ جانیں اور اُن کا کام۔''

بہت دنوں تک وہ اُن کے ہاں نہ گئی، گویا دونوں گھروں کے درمیان ایک سات فٹی دیوار ہی حائل تھی۔ پھر ایک سہ پہر دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے کھولا ڈاکٹر کی بیوی کھڑی تھی۔ مسکراتے ہوئے اُس نے خوش آمدید کہا اور اندر آنے کا راستہ دکھایا۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر اُس نے چھوٹے سے پرس سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کر وہ کچھ شرمساری سے بولی:

''اسے پڑھ دیجیے زبیر کا خط آیا ہے مجھے پڑھنا نہیں آتا۔''

اُس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ بیچارے کی قسمت ہی پھوٹ گئی تھی۔ بڑا فرماں بردار لڑکا لگتا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

میں جانتا ہوں تمہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ اماں جی کو میں نے الگ سے لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے لیے کسی لیڈی ٹیوٹر کا بندوبست کرے۔ دل لگا کر پڑھو گی تو بہت جلد اِس قابل ہو جاؤ گی کہ لکھ پڑھ سکو۔ رہا سوال تمہیں سعودیہ بلانے کا میری بات غور سے سننا اور اُس پر عمل کرنا۔ فی الحال اِس کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میری ماں نے مجھے کیسے پالا پوسا؟ کیسی صعوبتیں اٹھا کر مجھے اِس منزل تک پہنچایا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میری شادی کا سوال اٹھا تو میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کی پسند کو ترجیح دی۔

اُن کا بڑھاپا ہے۔ یوں بھی مصائب نے انہیں ستر بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ انہیں اب اکیلے چھوڑنا کسی طور بھی مستحسن نہیں۔ تمہارا اولین فرض اُن کی خدمت ہے۔ وہ اگر تم سے خوش ہوں گی تو سمجھو تم نے میرا دل جیت لیا۔ ان کی غذا اور آرام کا خاص خیال رکھنا۔ یوں دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت آئے گا جب تم میرے پاس ہو گی۔ مگر فی الحال مجھ سے زیادہ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔''

خط ابھی اُدھورا ہی تھا کہ اُس نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔

اُس کا لیکچر نہ بند ہوا۔ کان پک گئے میرے یہ سُنتے سُنتے۔ اس نے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ میں یہ کہتی ہوں جب سہاگن بیوہ ہو جائے تو تکلیفیں اٹھانا اُس کا مقدر بن جاتا ہے۔ انہوں نے کون سی انوکھی بات کی ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ بیوہ کے دن نہیں پھرتے، یتیموں کی یتیمی کٹ جاتی ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ اگر بیوہ کا بخت نہیں بدلتا تو یتیم کے دن بھی نہیں پھرتے۔ وہ بھی سدا ٹھوکریں ہی کھاتے پھرتے ہیں۔

اُس نے لمبی سانس بھری۔ کرسی پر پہلو بدلا۔ اسکوئش کا گلاس نزدیک پڑی تپائی سے اٹھا کر لبوں سے لگایا چند گھونٹ بھرے اور بولی:

بہت چھوٹی سی تھی جب باپ روٹھ کر چلا گیا۔ ماں بھی سال بعد اُس کے پیچھے چلتی بنی۔ ہم دو بہنیں دنیا کی ٹھوکریں کھانے کو رہ گئیں۔ کبھی کسی رشتہ دار نے روٹی دے دی۔ کبھی کسی نے کپڑا دے دیا۔ اپنا خون بھی آگا پیچھا نہ ہو تو مطلبی ہو جاتا ہے۔ میری بہن منور کو چچاؤں تایاؤں نے وہاں جھونکا جہاں سوکن اور آدھی درجن بچے تھے۔ دن رات وہ ان کے جوتے کھاتی دل برداشتہ ہو کر اس نے کسی کے ساتھ آنکھ لڑائی اور بھاگ گئی اور آج تک یہ نہیں پتہ چلا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ رہی میں تو مجھے اِس خاتون نے شادی کے نام پر اپنی خدمت کے لیے خرید لیا۔ تم ہی بتاؤ میں ایک ڈاکٹر کے قابل تھی؟''

اُس نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔وہاں سچائی کی تلخیاں گھلی ہوئی تھیں جو اُس کی زبان کے راستے باہر آ رہی تھیں۔

''میں نے یہ نہیں چاہا کہ اتنے بڑے آدمی کے ساتھ بیاہی جاؤں۔ایک چھوٹا سا آدمی میری تمنا تھی جس کے چھوٹے سے گھر میں مجھے سکھ چین اور آزادی ملتی جو مجھے اتنا پیار دیتا کہ میری پیاسی روح اُس میں ڈوب جاتی۔میں محبت کی بھوکی ہوں۔چاہت کی دیوانی ہوں۔دو روٹیوں کا کوئی مسئلہ نہ تھا وہ تو مجھے مل ہی رہی تھیں۔

وہ چپ ہوگئی تھی۔اُس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔سر اُس نے کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔دیر تک کمرے میں عجیب سی خاموشی طاری رہی۔وہ بھی چپ اُداس سی بیٹھی تھی یوں جیسے بولنے کی ہمت نہ رہی ہو۔دیر بعد پھر بولی:

''دیکھ لینا وہ وہاں شادی کرے گا اپنی پسند اور معیار کے مطابق اور مجھے یہاں رکھے گا اپنی ماں کی خدمت کے لیے۔ماں کی پسند پر یونہی نہیں جُھکا۔آج کے زمانے میں کون سی پڑھی لکھی لڑکی ہوگی جو ساس کی خدمت کے لیے شوہر سے جدا رہے۔''

''مگر دیکھو نا!''اُس نے اُس کی بات کاٹی۔

''تمہیں صبر سے کام لینا چاہیے۔اللہ صابروں کے دن پھیر دیتا ہے۔رشتہ داروں کے گھروں میں بھی رہتی تھی نا۔یہی سمجھ لینا کہ دُکھ کے دن ابھی نہیں کٹے۔''

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اُس کے رونے میں ایسی شکستگی تھی کہ اُس کا دل بھی بھر آیا۔دیر بعد ذرا ہلکی ہوئی تو بولی۔

''اصل میں مجھے محبت کا روگ لگ گیا ہے۔یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔جی چاہتا ہے اُڑ کر سعودیہ پہنچ جاؤں۔مجھے کوئی اپنا نہیں لگتا۔وہ تو خیر حساس اور جذباتی لڑکی تھی کوئی سخت دل بھی ہوتا تو اُس پر ترس کھائے بغیر نہ رہتا۔''

چنانچہ جب چند دنوں بعد وہ ڈاکٹر کو خط لکھوانے کے لئے اُس کے پاس آئی تو اُس نے اپنا سارا علم کام میں لا کر ایک دلپذیر خط لکھا۔ اُسے سنا چکنے کے بعد مضمون کو تہہ کر کے وہ بولی۔

''مجھے امید ہے کہ وہ یہ خط پڑھتے ہی تمہیں اپنے پاس بلا لے گا۔''

''تمہارے منہ میں گھی شکر۔''

اُس کے لبوں پر بڑی افسردہ سی مسکراہٹ اُبھری۔

پورا ماہ گزر گیا۔ بلانے کا بلاوا تو ایک طرف رہا۔ اُس نے تو خط بھی نہ لکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی الجھن کا شکار تھی۔ پورے ڈیڑھ ماہ بعد وہ ایک دوپہر بھاگی بھاگی آئی۔ اُس کے ہاتھ میں نیلا ایروگرام تھا۔ بیتابی سے اُس نے چاک کیا۔ جوں جوں وہ پڑھتی گئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ اڑتا گیا اور جب وہ ختم کر چکی تو اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھی اُس کی پریشانی دیدنی تھی۔

''کیا لکھا ہے؟ مجھے بتاؤ خیریت تو ہے نا۔ مجھے کہیں طلاق تو نہیں بھیج دی۔''

وہ خشک ہونٹوں سے بار بار یہی الفاظ دہرا رہی تھی۔

خط اس نے بیوی کے نام نہیں بلکہ اُسے لکھا تھا۔

آرام کو ہسپتال دران

۲۲/مئی

خاتونِ مکرم

اماں جی کے خط سے پتہ چلا کہ گھر کے نصف حصہ میں ایک سلجھی ہوئی تعلیم یافتہ خاتون آ گئی ہے۔ صفیہ اس کی صحبت سے بہت کچھ سیکھ جائے گی۔ اس خبر سے مجھے بھی کافی اطمینان ہوا تھا۔ بدھ کی صبح کو معمول کے مطابق بیدار ہوا۔ نماز ابھی ادھوری تھی کہ ٹیلی فون پر

اطلاع ملی کہ الخبر میں ٹیکنیکل برانچ کے چیف انجینئر کھیم جنگ سوجو کو رین ہیں حادثے سے دوچار ہو گئے ہیں۔فوراً فیلڈ پر جانے کی تاکید تھی۔ایک لمحہ توقف کے بغیر میں گاڑی میں الخبر روانہ ہوا۔طالوی ڈاکٹر بونسی بھی میرے ساتھ تھا۔کھیم سو میرا اچھا دوست ہے۔میری طرح ہی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔اُسے یوں موت وزیست کی کشمکش میں دیکھ کر طبیعت بہت خراب ہوئی۔دوپہر کو گھر آیا تو ایک لمبا چوڑا خط میرا منتظر تھا پڑھ کر طبیعت اور مکدر ہوئی۔

خاتونِ مکرم! آپ نے صرف صفیہ کے جذبات کی ترجمانی کی۔میری نہیں۔میں ایک پڑھا لکھا سٹیٹس والا آدمی ہوں۔ہر شریف جوان کی طرح میرے بھی کچھ خواب تھے۔ایک پڑھی لکھی خوش رو اور نوعمر بیوی کے روپ میں مَیں نے بھی اپنے مستقبل کے کچھ منصوبے بنائے تھے۔یہ میں نے بھی چاہا تھا کہ میرا گھر ایک جنت ہو۔مگر اپنی ان آرزوؤں سے کہیں زیادہ مجھے اپنی ماں کی خواہش کا احترام تھا جس نے خدا ترسی کرتے ہوئے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا جو یقیناً میرے لیے موزوں نہیں تھی۔میں اپنی ماں کو تنہا نہیں دیکھنا چاہتا۔اپنے آرام سے زیادہ مجھے اُس کا آرام مطلوب ہے۔اسے سمجھایئے کہ اگر وہ میرے دل تک رسائی حاصل کرنا چاہتی ہے تو میری ماں کو خوش رکھے۔جب میں سمجھوں گا کہ اُسے میرے پاس ہونا چاہیے۔وہ ان شاءاللہ میرے پاس ہو گی۔''

میں نے پورا خط اُسے سُنا ڈالا۔اُس کے چہرے پر مایوسی کے گہرے سائے دیکھ کر میں نرمی سے بولی:

''سنو صفیہ! جن وسوسوں اور اندیشوں میں گھر گئی ہو وہ قطعی بے بنیاد ہیں۔بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ ماں کو پرستش کی حد تک چاہتا ہے۔''

''مگر اُس کی ماں اِس سے پہلے بھی تو تنہا رہتی تھی۔'' اُس نے اُس کی بات فوراً کاٹ دی۔

''بے کار ضد میں مت الجھو۔تمہاری یہ اُلٹی سوچیں تمہیں فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچائیں گی۔دیکھو صبر اور تحمل سے تھوڑا سا وقت گزارو۔دن بدلتے دیر نہیں لگتی۔''

''خدمت سے مجھے انکار نہیں مگر جیسے میرے وجدان کہتا ہے میرا بخت کبھی نہیں جاگے گا۔ہر انسان خود غرض ہے۔میری ساس بھی اپنی غرض کے بندھنوں میں الجھی ہوئی ہے۔میں سارا دن کام کرتی ہوں۔یہ ٹھیک ہے وہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔مگر اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ تمہیں اپنے شوہر کے پاس ہونا چاہیے۔شادی کے یہ ابتدائی دن انسانی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہوتے ہیں۔تمہی بتاؤ میں کیسے مان لوں کہ وہ مجھے اپنے لیے نہیں لائی۔''

وہ بھی ٹھیک کہتی تھی۔اسے جھٹلانے کی بھی اس میں ہمت نہ تھی۔تاہم اس نے اپنے طور پر اس کی دلجوئی کی پوری کوشش کی۔

بہت سے مہینے گزر گئے۔وہ اب بھی اپنے خط لکھوانے اور پڑھانے لاتی۔خط لکھنے میں وہ بہت محتاط تھی۔اُس کے جذبات کا بند خط لکھواتے ہوئے ہمیشہ ٹوٹتا۔مگر وہ وہی لکھتی جو مناسب سمجھتی۔یوں یہ اور بات ہے کہ سناتے ہوئے اپنے پاس سے جھوٹ موٹ کے جملے پڑھ دیتی تاکہ وہ مطمئن رہے۔

پڑھنے لکھنے سے اُسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔جب بھی آتی خود ساختہ اپنے بکھیڑوں سے نہ نکل پاتی۔

پھر ایک روز وہ آئی تو بڑی خوش تھی۔اُس نے رازداری سے مجھے بتایا کہ اس کی پھوپھی کا ایک بیٹا جو دہران میں ملازم ہے چھٹی پر آیا ہے۔اُس نے کہا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔

میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔زبیر سے اللہ کے نام پر بھیک مانگوں گی کہ وہ مجھے اپنے پاس رکھے۔

اُس کا لہجہ اتنا فیصلہ کن تھا کہ اُسے کاٹنے کی اُسے ہمت ہی نہ رہی۔چپ چاپ وہ اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی جہاں اِس فیصلے نے بڑی روشنی بکھیری ہوئی تھی۔اُس نے اپنی ساس کو مطلقاً خبر نہ ہونے دی۔وہ ڈرتی تھی کہ کہیں وہ روڑا نہ اٹکا دے۔اُس کا قوی خیال تھا کہ وہ اُسے کسی قیمت پر جانے نہیں دے گی۔

اُس نے اپنے طور سے اُسے سمجھانے کی سعی کی کہ اُس کا قدم اس کی ازداوجی زندگی کے خاتمے کا باعث بن سکتا ہے۔مگر وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھی۔

روز جیتی ہوں روز مرتی ہوں۔اچھا ہے معاملہ آر پار ہو جائے گا۔یہاں کون سی پھولوں کی سیج پر لیٹی ہوں۔یہاں بھی کانٹے ہیں۔وہاں بھی یہی تحفے ملیں گے۔اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

اور یہ خبر اُس نے ڈاکٹر کی ماں کی زبانی سنی کہ صفیہ دہران چلی گئی ہے۔اس نے چائے اس کے آگے لاکر رکھی تھی کپ اُس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے وہ سکون سے بولی:

''میں خوش ہوں کہ وہ چلی گئی ہے اگر دکھ ہے تو صرف اتنی سی بات کا کہ اگر اسے جانا ہی تھا تو مجھ سے کیوں نہ کہا؟ میں بھلا اُسے روکتی۔معلوم نہیں اس نے کرائے کا بندوبست کیسے کیا ہوگا؟''

اس نے بغور اُس کے معمر چہرے کو دیکھا جو دودھ کی طرح سفید تھا جس پر طمانیت کی جھلک تھی۔بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا۔

''آپ اُس پر خفا نہیں؟ کوئی ناراضگی نہیں اور کوئی غصہ نہیں آیا آپ کو؟''

''نہیں بیٹی!'' وہ سکون سے بولی۔''میں زبیر کو پہلے ہی لکھتی رہی تھی کہ اسے صفیہ

کو اپنے پاس رکھنا چاہیے۔یتیم بچی جس نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی اسے بھی مسرتوں کی ضرورت ہے۔''

پہلی بار اس کے دل نے بے اختیار ان کی عظمت کو سلام کیا تھا۔صفیہ کی جلد بازی پر اُسے گہرا افسوس ہوا۔حقیقتاً وہ ایک عظیم اور بے مثل عورت تھی۔چند دن مزید گزر گئے۔یہ اداس اور بھیگی سی دوپہر تھی۔وہ برآمدے میں مشین رکھے نئے آنے والے مہمان کی تیاریوں میں جتی ہوئی تھی۔جب دروازہ کھلا اور صفیہ اندر آئی۔

اس کا جی دھک سے ہوا۔

احمق کہیں کی۔اس نے اپنے دل میں کہا نکال دیا ہوگا اس نے۔پر جب وہ اس کے قریب آئی اور گلے ملی تو اس نے دیکھا اُس کا چہرہ مسرت وشادمانی سے چمک رہا تھا۔اس کے دانت ہونٹوں سے نکلے پڑتے تھے۔دونوں ہاتھوں سے تالی سی بجاتے ہوئے اس نے کہا:

''تم مجھے دیکھ کر حیران ہو رہی ہو تمہیں اس بات پر بھی تعجب ہو رہا ہوگا کہ میں واپس آجانے کے باوجود اتنی خوش کیوں ہوں؟ بھئی بات ہی ایسی ہے۔لو آؤ تمہیں تفصیل سناؤں۔''

اُس نے مشین ایک طرف کر دی۔ٹانگیں پسار لیں۔کمر کو دیوار کے ساتھ لگایا اور اُس کی طرف دیکھا۔مارے اشتیاق اور تجسس کے اُس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔وہ اس پاس ہی موڑھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

ہاں تو زبیر نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار نہیں کیا۔بلکہ اگر یہ کہوں کہ اُس کے چہرے پر غصے اور برہمی کے آثار پیدا ہوئے تھے تو غلط نہ ہوگا۔یہ جاننے پر کہ میں ماں جی کی اجازت کے بغیر آئی ہوں اُس کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔میں اس کے قدموں سے لپٹ

گئی۔یوں بلک بلک کر روئی کہ وہ کسی مردے کی طرح کرسی میں گر کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔اس نے مجھے رہنے کے لیے کہا اور نہ جانے کو۔مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اماں جی نے اسے خط لکھا ہوگا جو یقیناً میرے خلاف ہوگا۔

یوں ایک دن صفائی کرتے ہوئے ایک خط میرے ہاتھ لگا۔اُس کے چہرے مہرے سے لگا کہ پاکستان سے آیا ہے۔کس کا ہے اور کیا لکھا ہے۔یہ جاننا چاہتی تھی۔گراؤنڈ فلور پر ایک ہندوستانی ڈاکٹر رہتا تھا۔اُس کی بیوی کانتا سے میری بات چیت تھی۔خط اُسی کے پاس لے گئی۔تم سوچ بھی نہیں سکو گی کہ ماں جی کا خط سن کر میری کیا کیفیت ہوئی؟انہوں نے لکھا تھا کہ دیکھو زبیر! میں نے یہ نیکی کی ہے۔اِسے ضائع مت کرنا۔صفیہ عورت ہے۔اُس کے پہلو میں دل ہے اُس کی زندگی بے آب وگیاہ صحرا کی مانند تھی۔میں اُسے نخلستان بنانے کے لیے لائی تھی۔صفیہ پیار کی بھوکی ہے۔اُسے دُھتکارنا نہیں مجھے اس پر کوئی غصہ،گلہ یا ناراضگی نہیں۔میں اسے اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے لائی تھی۔یہ تمہاری فضول کی ضد تھی کہ وہ میرے پاس رہے۔انہوں نے میرے متعلق اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔کانتا شرما جی نے خط پڑھنے کے بعد کہا تھا کہ تمہاری ساس انسان نہیں دیوی لگتی ہے۔''

میں گھر آئی۔اماں جی کے لیے میری محبت کے سوتے اُبل پڑے۔میں تو ان پر اپنا تن من وار دیتی وہ بھی کم تھا۔زبیر کے ہسپتال سے واپس آنے تک میں سارا سامان باندھ چکی تھی۔زبیر نے مجھے حج کے لیے روکنا چاہا مگر میں نہ مانی۔

دیکھو نا اماں جی جیسی بے لوث محبت کرنے والی عورت کی خدمت حج ہی تو ہے۔''

☆☆☆

عنوان تو آپ نے دینا ہے

پانچ جولائی 1969ء کی ڈھلتی صبح لاہور کا آسمان مجھے بے حد چمکیلا، نیلا اور پُھولا پُھولا سا نظر آیا تھا۔ دھوپ کی تیزی، اُس کا پسارا اور اُس کا سنہری پن درختوں کے پتوں، عمارتوں کی بالکونیوں اور بیروں پر پھیلا ہوا تھا۔ ماحول اور فضا میں البتہ حبس کی سی کیفیت تھی۔ میں بس میں بیٹھی کھڑکی سے باہر کے منظروں کو دیکھتی ایک بے حد مسرور کن سرشاری کی سی کیفیت میں تھی۔

وجہ بس اتنی سی تھی کہ میں گیارہ بجے کی ٹرائی ڈنٹ فلائٹ سے پورب پاکستان کی ڈھاکہ یونیورسٹی کی سٹوڈنٹ بن کر وہاں جا رہی تھی جہاں خوبصورت جزیرے، گنگناتی ندیاں، حسین آبشاریں اور خوبصورت جھیلیں تھیں اور جس کے باسیوں کو مشرق کے اطالوی کہا جاتا تھا۔ جنہیں ہم پچھمی پاکستانیوں سے ڈھیروں ڈھیر شکایتیں تھیں۔

تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر جہاز سے باہر آئی تو صوبائی دارالخلافہ کا یہ ایرو ڈرم بڑا معمولی سا تھا۔ ہاں البتہ قدرت کا حسن میرے سامنے بکھرا ہوا تھا۔ بادلوں سے ڈھنپا آسمان اور رِم جھم سی فضا پیشوائی کے لیے آگے بڑھی تھی۔ اتنی رومان پرور فضا کہ میرے اندر نے

خوشی و مسرت سے ہمکتے ہوئے کلکاری سی بھری۔ایسا موسم ہمیشہ سے میری کمزوری تھا۔

تین بجے تک ہوسٹل میں داخلے کے مرحلوں سے گزر کر جب میں رقیہ ہال مرکزی بلڈنگ میں ایک تلے کے کمرہ نمبر 20 کی ایک بورڈر بن کر اپنا سامان کھول رہی تھی۔عین اُسی وقت قدرے فربہی جسم والی ایک لڑکی نے اندر آ کر لکھنوی انداز کی اردو میں اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ وہ روشن احمد ہے۔ایم اے فارسی کی طالبہ اور لال میز ہاٹ سے اُس کا تعلق ہے۔

''اچھا تو یہ اُردو سپیکنگ کیمونٹی سے ہے جسے مشرقی پاکستان میں بالعموم بہاری کہا جاتا ہے۔''میں نے خود سے کہا۔

میں تو تھی ہی گاڑی اور اوّل درجے کی پھوہڑ،کوئی سلیقے طریقے والی ہوتی تو اُس کی اِس پیشکش کہ چلو تمہیں چٹاگانگ کی ایک اور اُردو سپیکنگ سے ملاؤں پر ضرور کہتی کہ تھوڑی سی مہلت دیں۔ذرا چیزیں ٹھکانے لگالوں پھر چلتی ہوں۔

لکڑی کے بیڈ پر آدھا سامان کھلا اور آدھا بند یونہی چھوڑ چھاڑ کر اس کے ساتھ ہولی۔جب لفٹ میں داخل ہوئے۔روشن آرا نے،جس سے ملنے جا رہے تھے اُس پر مختصراً سی روشنی ڈالی۔جہاں آرا بڑی فعال،طلبہ سیاست میں بڑی نمایاں،پہلے این ایس ایف کی جنرل سیکرٹری تھی۔آج کل سٹوڈنس یونین کا بڑا اہم چہرہ ہے۔نظریاتی طور پر بھی بڑی پکی سوشلسٹ ہے۔

پانچ تلے کے 425 نمبر کمرے میں داخل ہوتے ہی جیسے مجھے کرنٹ سا لگا۔ٹھنک کر میں ساکت سی ہوگئی۔کوئی چھ سات فٹ کے فاصلے پر چنبیلی جیسے رنگ والی گداز بدن لڑکی جس کے سیاہ گھٹاؤں جیسے بال اس کے گھٹنوں سے ذرا اوپر ساری پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔اپنے سے دس ہاتھ پرے بیڈ پر نیم دراز لڑکی سے کسی موضوع پر گفتگو کر رہی تھی کہ ہاتھ

تمثیلی انداز میں پھیلے ہوئے تھے۔بالوں میں اگر حسن بنگال انگڑائیاں لیتا تھا تو آنکھوں میں اُس کا سحر ہلکورے کھاتا تھا۔جہاں آرا جس سے ملنے میں یہاں آئی تھی،میری محویت کو نوٹ کرتے ہوئے مسکرائی اور بولی:

''بھئی!یہ اروما دت ہے۔ہے ہی اتنی خوبصورت کہ کہ بندے کو فوراً جٹ چھپا ڈال لیتی ہے۔بھئی ہم روم میٹ ہی نہیں ڈپارٹمنٹ فیلوز بھی ہیں۔انگلش لٹریچر میں یہ پارٹ ون اور میں پارٹ ٹو میں۔یوں یہ بہت محبت والی لڑکی ہے۔''

جہاں آرا اصل بہارن تھی کہ بہار کے کوچ بہار سے اُس کے اماں ابا ہجرت کرکے آئے تھے۔میں جب تک کمرے میں بیٹھی رہی میری نظریں بار بار اروما دت کے گرد ہی منڈلاتی رہیں۔قامت بھی سرو کے بوٹے جیسی تھی۔چہرے کے باقی نقوش بھی حسن کے معیاری ترازو پر پورے اترتے تھے۔یہ سب تو تھا۔مگر اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔کیا؟چہرے میں گھلی ملاحت تھی شاید۔مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی،کچھ تو تھا کہ جو بار بار نگاہوں کو پلٹنے پر مجبور کرتا تھا۔

پہلے کچھ دن تو اپنی ہی پسوڑی میں گزرے۔میرے ساتھ تو وہ والا معاملہ تھا کہ جیسے کہیں کہ سر منڈواتے ہی اولے پڑیں۔ایک تو میری کلاس نے مجھے لعن طعن شروع کر دی تھی کہ تم کوئی خوتی یعنی بچی ہو کہ شلوار پاجامے پہنتی ہو۔ساڑھی پہنو۔دوسرے بنگلہ بولو۔یہ دونوں کام ضروری،اوپر سے پڑھائی کا زور،تیسرے اخبار خواتین کے لیے نامور پوربو پاکستانی مرد وزن کے انٹرویوز کا سلسلہ کہ میں آتے ہوئے فی مضمون کے حساب سے اُن سے مُک مُکا کر کے آئی تھی۔

سو اروما دت ذرا دل سے کھسکی سی رہی۔ایک شام جب میں ہال کے پوکھر کنارے پر بیٹھی لڑکیوں کو کشتی رانی کرتے دیکھتی اور بنگلہ گیت سنتی تھی،میں نے اروما کو

چھوٹی سی نوکا (کشتی) کھیتے دیکھا۔سرخ اور سیاہ بال بارڈر کی ساڑھی،اس پر اُس کے کھلے بال، چاند چمکتا چہرہ۔آواز بھی نغمگی سے بھری ہوئی۔خود سمجھ لیجیے کہ میری محویت کا کیا عالم ہوگا؟ کو بنگلہ گیت مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا۔مگر آواز تو اپنا آپ بتا رہی تھی۔مجھے دیکھ کر دوستانہ سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔میں نے جوابی مسکراہٹ بکھیری اور نئی نئی سیکھی بنگالی کے چند جملے اس کی طرف اچھالے۔

رات ڈائننگ ہال میں جہاں آرا کے ساتھ باتوں کے دوران وہ زیر بحث آ گئی۔پتہ چلا کہ وہ کومیلا کے بہت بڑے زمیندار کی پوتی ہے۔کبھی اس کا دادا متحدہ بنگال کا وزیر صحت تھا۔تقسیم کے بعد اس نے ہندوستان نقل مکانی نہیں کی کہ ہندوستان نے جاگیرداری نظام یکسر ختم کر دیا تھا۔اُس کا باپ شدید قسم کا اینٹی پاکستانی جو کلکتہ میں بیٹھا شنکھرام نامی اخبار نکالتا ہے۔پوربو پاکستان میں اُس کا داخلہ بند ہے۔اُس کی ماں بھی سُنا ہے۔بہت اینٹی ہے۔خود یہ دارجلنگ اور شیلانگ کے کانونٹوں سے پڑھی ہے اور لپسو کی پروانڈیا گروپ کی سرگرم رُکن ہے۔تاہم بہت محبت والی لڑکی ہے۔بات دلیل سے کرتی ہے۔عادات کی بھی اچھی ہے۔روم میٹ ہونے کی وجہ سے بھی زیادہ ساتھ ہے۔کمرے کی باقی دونوں لڑکیوں کی نسبت ہم دونوں ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔

مُسور کی پتلی دال کو پلیٹ سے پیتے ہوئے جہاں آرا نے رُک رُک کر مجھے یہ بتایا تھا اور ساتھ ہی دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''ارے بنگال تو سیاسی ایجی ٹیشن،اضطراب اور بے چینیوں کا مرقع بن گیا ہے۔گھر بار لُٹا کر اور رشتہ داروں کو کٹوا کر ہم پدما اور بوڑھی گنگا کی اِس سرزمین پر پناہ کے لئے آئے تھے۔مگر یہ اس خطہ زمین کو ایک خاص قوم اور لوگوں کے لیے ہی مخصوص کر دینا چاہتے ہیں۔بنگال کی دھرتی ماں تو Son of the soil کی ہی نمائندہ بن گئی ہے۔اگر

ملکوں میں یہی سب کچھ ہونے لگے گا تو بتاؤ دنیا میں رواداری اور برداشت کہاں رہے گی؟

ظاہر ہے یہ سب جاننے پر اروما دت کی وہ فسوں خیز خوبصورتی جو میرے دل میں گڑی بیٹھی تھی۔ تھوڑی سی گرہن زدہ ہوگئی۔ تاہم پھر بھی کہیں نہ کہیں نظر آنے پر میری نظروں کا پلٹ پلٹ کر اُسے دور تک جاتے دیکھنا جاری وساری رہا۔

ہمہ وقت بادلوں سے بھرا آسمان رم جھم اور تیز بارشوں کے دن ختم ہوگئے تھے۔ یہ روشن، چمکدار، میٹھے سے دن بہت خوبصورت تھے اور ایسے ہی دنوں میں سے ایک شام جب میں یونیورسٹی سے ہال میں آئی میں نے دیکھا تھا ہمارے ہوسٹل کے دروازے پر چھ فٹ سے نکلتی قامت والا ایک انتہائی خوبصورت اور وجیہہ جوان کھڑا تھا۔ اساطیری کہانیوں جیسا۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا اور بے اختیار خود سے کہا:

ارے یہ بنگالی تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یقیناً یا پٹھان ہے اور یا پنجابی۔ اب جب گمان کا رشتہ پچھمی پاکستان سے جڑتا محسوس ہوا تھا تو پوچھنے یا بات کرنے میں کیا حرج تھا؟ میں نے پوچھا میرے اردو بولنے پر اس کے چہرے پر شناسائی کا وہی رنگ بکھرا تھا جو بالعموم ہم زبانی اور ہم زمینی تعلق پر بکھرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپ جیسا سوال بھی اس نے اٹھا دیا تھا۔

میرے اوپر تو پنجابی ہونے کی تہمت تھی۔ سانولی سلونی، کوتاہ قامت، بدن جب یہاں وارد ہوئی تھی موٹا تازہ تھا پر گھر سے دوری اور گھر کی بھینس کے دودھ مکھن سے محرومی اور مچھلی مسور کی دال نے چربی کی ساری تہیں پگھلا پگھلا کر سینک سلائی کی سی صورت دے دی تھی۔

اپنے بارے میں اس نے جو کچھ مختصراً بتایا۔ وہ اس کا بزنس سے تعلق اور یہاں مخدوش حالات کی وجہ سے بزنس بند کرنے کے متعلق جائزے سے تھا۔

چلو وہ سب تو ٹھیک مگر میں نے بے اختیار سوچا کہ یہ اپالو دو یتا لڑکیوں کے ہوسٹل کے سامنے کھڑا کیا کر رہا ہے؟ اور اُسے یہاں کیا کام ہے؟ چلو یہ بھی فوراً معلوم ہو گیا کہ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بتایا تھا کہ وہ اروما دت سے ملنے آیا ہے اور اس ضمن میں اُس نے مجھ سے درخواست بھی کی کہ میں اسے ہوٹل میں دیکھ کر بتاؤں کہ باہر ظفر اقبال نامی اس کا ملاقاتی انتظار کر رہا ہے۔

بات کرنے کا انداز حتمی خاتمے کا سا تھا۔یعنی مزید کوئی سوال جواب نہیں۔میں نے بھی سوچا یہ میں اپنی حب الوطنی ذرا لگام دے کر رکھوں۔بھئی مجھے کیا؟ مگر میرا اندر مضطرب تھا کہ کیسے اُسے بتایا جائے کہ بڑی خطرناک لڑکی ہے۔شاید آگ سے کھیلنے لگے ہو۔جل بھی سکتے ہو۔پھر خود کو پھٹکارتی یہ کہتی مجھے کیا وہ کوئی کا کاپُوچا ہے جسے میری رہنمائی کی ضرورت ہے۔لعنت بھیجو۔

بہر حال میں پانچویں فلور پر جہاں آرا کے کمرے میں گئی جہاں اتفاق سے وہ موجود تھی۔اُس کے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا اس کے شانوں پر پڑا تھا۔آبی رنگی ساڑھی گھریلو انداز میں پہنے بیٹھی اچار کی شیشی میں سے اچار نکال کر پاس کھڑی ایک لڑکی کی پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔اور تنبیہی انداز میں اسے ڈانٹ ڈپٹ بھی کر رہی تھی۔''تمہیں ذرا عقل نہیں۔ہر وقت اُول جلول بکتی رہتی ہو۔اس دن ساجدہ کے سامنے کیا بکواس کر رہی تھی کہ مسلمان رائٹرز کی کتابیں لگواتے ہیں اور ہندوؤں کی بین کرتے ہیں۔پہلے ان کے اندر لکھنے کی اہلیت تو پیدا کریں۔''

میرے اندر آنے کا شاید دونوں نے نوٹس نہیں لیا تھا اور جب میں قریب چلی گئی تو اروما خاموش ہو گئی اور دوسری لڑکی چہرے پر برہمی کے آثار لیے فوراً کمرے سے نکل گئی۔میں نے اُسے پیغام دیا۔اُس نے پلکیں اٹھا کر مجھے نہیں دیکھا۔''ٹھیک ہے۔''سر

جھکائے جھکائے کہا۔

میں حیرت زدہ تھی۔اُس نے ساڑھی بدلنے، نہ کنگھی پٹی کرنے، نہ کسی سرخی شرخی سے تھوڑا سا لبوں کو رنگنے اور نہ ہی خوشبوؤں سے خود کو نہال کرنے کے لیے کسی سپرے کا انتظار کیا۔بس گولی کی طرح بھاگتی لفٹ پر جا چڑھی۔معاملہ تو کچھ بڑا گڑبڑ سا لگتا تھا۔جی تو چاہا تعاقب کروں۔دیکھوں تو سہی۔پھر سوچا یار یہ تو بڑی کمینی سی بات ہے۔

''لعنت بھیجو۔''پر میرے اندر شرلاک ہومز کا سا اسرار پھیل گیا تھا۔

رات کو جب جہاں آرا کو سارا قصہ سنایا۔اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا:

''وہ تو آرمی انٹیلی جینس کا میجر ہے۔اردما کی پارٹی جانتی ہے یہ سب۔دونوں پارٹیاں یقیناً داؤ پر ہیں۔''

اب میرے پاس یقیناً وطن کے لیے دعاؤں کے سوا اور کیا تھا۔

کوئی دو ماہ بعد رمضان آ گیا۔نوسو، ہزار لڑکیوں سے بھرا پُرا ہوسٹل بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ہال میں بس میرے علاوہ چند اور لڑکیاں تھیں۔جانے کو تو میں بھی گھر جا سکتی تھی۔زمانہ سستا تھا۔پر پیسہ بڑی قدر و قیمت والا تھا۔یوں آنے جانے کے پانچ سو ٹکٹ کے علاوہ ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بھی تھی کہ رشتہ دار کیا کہیں گے؟ابھی کل گئی تھی آج ہنکتی ہوئی آ بھی گئی ہے۔سال بعد جانے سے تھوڑی سی عزت اور توقیر تو ہو گی۔

عید کے بعد یونیورسٹی کھلی تو دو تین دن بعد جہاں آرا سے یہ خبر ملی کہ اردما دت تو اس پنجابی میجر سے نکاح کر کے ویسٹ پاکستان چلی گئی ہے۔

''ہیں!''میرے حیرت بھرے لہجے میں بے پایاں سی مسرت کا احساس تھا۔یوں جیسے اردما دت کو فتح کر لینے سے مشرقی پاکستان پر امنڈتے خطرات کے بادل چھٹ جائیں گے۔

اب میں تفصیلات جاننے کی خواہش مند کہ یہ آسمان زمین کا ملاپ کیونکر ہوا۔ جہاں آرا نے کہا۔

''صبر صبر میری جان۔ تفصیلات کا خود مجھے انتظار ہے۔''

چند دن بعد اُس نے بتایا کہ پران ٹیگور اُس کے باپ کا دستِ راست، اُس کی پارٹی کا سٹوڈنٹ لیڈر اور اُس کا عاشق صادق اِس صدمے سے نڈھال، بے حال کمرہ بند ہوا پڑا ہے۔ اس پارٹی کی نائب صدر جیوتی پران سے عشق کرنے، اس پر مرنے اور ارومادت سے اندر ہی اندر جلنے سڑنے والی ارومادت جیسے بھاری پتھر کے راہ سے ہٹ جانے پر پھولی نہیں سما رہی ہے۔ رات اُس کے کمرے میں دیر تک بتی جلتی دیکھ کر میں گئی تو پتہ چلا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی جگن ناتھ ہال سے آئی ہے۔ وہاں باقاعدہ میٹنگ ہو رہی تھی اور وہ پران ٹیگور سب پر دھاڑ رہا تھا کہ آخر تم لوگوں کو کیوں پتہ نہیں چلا۔ ''یہ ہوا کیسے؟''

نکاح تو کسی برگیڈیئر کے گھر انتہائی رازداری سے ہوا اور اُسی رازداری سے انہیں جہاز پر چڑھایا گیا۔ مستفیض الرحمٰن بولا تھا۔ پر کاش کا لہجہ بھی بڑا اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

''حد ہو گئی ہے۔ ہم پر تمہارا یہ بگڑنا کتنا غلط ہے؟ وہ رینیش دادا کی بیٹی تھی۔ اپنی کاز سے کھڈ۔ ہر شک و شبے سے بالاتر۔ ہم اُس کی نگرانی کیوں کرتے؟ ہم تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ یوں گُل کھانے پر اُتر آئے گی۔''

پران کے اندر سے لمبی آہ نکلی تھی۔

''بھگوان میرا جیون تھی وہ۔ میرے من کی شانتی تھی۔''

سچی بات ہے مجھے تو تپ چڑھی تھی پران پر۔ غصے سے میرا برا حال ہوا۔ لحاظ کو تو میں نے اٹھا کر چولہے میں جھونکا اور بول پڑی:

''ڈوب مرو کہیں پوکھر میں جا کر۔ کہتے ہو، من کی شانتی تھی وہ تمہاری۔ اور شانتی

تمہاری چھاتی پیٹتی اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

میں تو اٹھ کر اپنے ہال آ گئی۔ جیوتی کے لہجے میں غصے کی تلخی اور چہرے پر اشتعال کی سرخی بہت نمایاں تھی۔

اب ہر چھوٹی بڑی ماڑی موٹی تفصیل کے لیے بے چینی کہ آخر جو شکار کرنے چلی تھی وہ شکار کیسے ہوئی؟ کیو یڈ کا تیر چل گیا۔ جو ایسے حالات میں کبھی کبھی چل جاتا ہے۔ پھر بھی نمک مصالحے والے لازمے بھی تو ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ جو اس معاملے کو رنگینی دیتے ہیں اور وہ جاننے کے لیے مرنے والی بات ہو رہی تھی۔

کوئی ماہ بعد کی بات ہے۔ اکیس فروری، پورا پاکستان کی تاریخ، کا اہم دن جب بنگلہ کو قومی زبان بنانے کی تحریک چلی تھی۔ احتجاجیوں پر گولی چلنے کے نتیجے میں اموات ہوئیں۔ شہید مینار بنا اور یہ قومی دن ٹھہرا۔ اکثر و بیشتر اِس دِن کے مقدر میں اردو بنگالی پر جھگڑا ہونا بھی ضروری ٹھہرا۔

اس سال بھی تو ڑ پھوڑ، احتجاج، بنگلہ بولو، بنگلہ۔ اُردو چلبے نا (اُردو نہیں چلے گی) جیسے جذباتی نعرے ڈھاکہ کی فضاؤں میں رقصاں تھے۔ انہی دنوں میں جہاں آرا مجھ سے ملنے ایک شام میرے کمرے میں آئی۔ اُس کی خاموش آنکھوں نے مجھے سگنل دیا تھا کہ باہر آ جاؤ۔ ہم دونوں جب ایک تنہا گوشے میں بیٹھ گئیں اُس نے پرس میں سے ایک خط نکال کر مجھے دیا۔ ارومادت کا خط جو آرمی کا ہی کوئی افسر اُسے دے کر گیا تھا۔

''جہاں آرا دیدی! یقیناً آپ کو حیرت ہوگی میرے فیصلہ پر۔ مگر کچھ معاملات انسان کے اختیار سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مجھے حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں نے ظفر سے ملنے اور یہ جاننے پر کہ وہ انٹیلی جینس کا میجر ہے کس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ میں یقیناً اب اپنے دھرم اور دیش کے لیے وہ کردار ادا کرنے والی ہوں جو

یہودی عورتوں نے 1967ء کی جنگ میں مصری فوجی افسروں کے ساتھ کیا تھا۔

میں نے اپنے معتمد ساتھیوں کو بھی یہ خبر جوش وخروش سے سنائی تھی کہ ایک عقل کا کورا میجر میرے چنگل میں پھنس گیا ہے۔ سبھوں نے اسے سراہا تھا۔ ہلہ شیری دی تھی۔ پر چند ہی ملاقاتوں نے اُس عقل کے کورے فوجی افسر کی شخصیت کے دلفریب پہلو میرے سامنے لا کھڑے کیے تھے۔ یوں کہ میں تو ہکا بکا رہ گئی تھی۔

پہلی ملاقات یاد آتی ہے کہ مگ بازار میں جب میں ایک سائیکل رکشے والے سے پیسوں پر جھگڑ رہی تھی۔ اُس نے قریب آ کر رواں بنگالی بولتے ہوئے مسئلے کو نہ صرف سلجھایا بلکہ مجھے اپنی گاڑی میں لفٹ بھی دی اور شاہ باغ میں چائے کا کپ پیتے ہوئے اپنے بارے میں بھی بتایا۔ ظاہر ہے یہ بڑی مسرت افزا بات تھی میرے لیے۔

مگر ہوا کیا؟ وہ تو میرا سالوں پہلے کا پرستار نکلا۔ اُس وقت کا جب میں کہیں اپنے کانونٹ سے چھٹیوں میں کومیلا آئی ہوئی تھی۔ اور تب کا لیفٹیننٹ ظفر اقبال کومیلا کی سرحدی چیک پوسٹ لکشم پر متعین تھا۔ کہیں پڑولنگ کے دوران اپنی جیپ میں بیٹھے ہوئے اُس نے مجھے مندر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ میں تو اس پہلی نظر میں اُس کی آنکھوں سے اترتی ہوئی کہیں دل میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ میرے بارے، میرے خاندان کے بارے میں اُسے تو ایک ایک بات کا پتہ تھا۔ وہ میرے دادا سے ملا تھا۔ مگر اگلے چند دن بعد ہی اُس کی پوسٹنگ واپس مغربی پاکستان ہوگئی تھی۔ مگر وہ مجھے اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ میری چاہت میں اُس نے بنگالی افسروں سے بنگالی سیکھی۔ میں تو گنگ بیٹھی سنتی تھی۔ اُسے میرے چہرے کا ایک ایک نقش، میرے تن پر پہنی ساڑھی، میرے ہاتھوں میں جلتا دیئوں کا تھال سب کچھ یاد تھا۔ میجر ہو کر کوشش سے دوبارہ اس سرزمین پر آیا تھا۔ مجھے دیکھنے، مجھے ملنے، مجھے پانے۔

جہاں آرا دیدی! اُس کی مردانہ وجاہت تو اپنی جگہ، وہ تو کردار کا بھی غازی تھا۔ میں نے اُسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اور مزے کی بات وہ سب جانتا بھی تھا اور اُس کے پاس کہنے کے لیے صرف ایک بات تھی۔ میں اُس کی محبت ہوں۔ میں ماضی میں کیا کرتی رہی ہوں یا کر رہی ہوں اُسے اس سے کیا؟

جہاں آرا دیدی! اب میں لاکھا اینٹی ویسٹ پاکستان تھی۔ کہہ لیجیے منفی تھی۔ پر میرے اندر مشرقی خُو بُو بھی تو تھی۔ انسانیت کی اعلیٰ اقدار سے متاثر ہونے کا جذبہ بھی تو موجود تھا۔ چھ سال میں لڑکوں اور مردوں کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ نگاہوں اور ہاتھوں کی زبان پڑھنے اور سمجھنے کا شعور رکھتی تھی۔ میں بھی اُس کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ میں نے اپنا دھرم، منفی سیاست، کلچر اور تہذیب سب کو ایک پوٹلی میں باندھا اور بوڑھی گنگا بُرد کر دیا تھا۔ اور آپ جیسے ایک خیر خواہ کی بات سے انکاری ہوگئی کہ کلچر، دھرم اور بھاشا کا فرق بہت سے دکھوں اور دردوں کو جنم دیا ہے اور ایک آدمی کی محبت کا بند اُن کے سامنے باندھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ میرے لیے دُعا ضرور کیجیے گا۔ آپ میرے ساتھ بہت محبت کرنے والی رہی ہیں۔''

اور اُس سلونی سی شام میرے اندر نے کہا تھا:

''واہ! میں کیا کہوں۔ محبت فاتح عالم یا عشق نہ پچھے ذات!

☆☆☆

تشنگی

اس وقت مہمانوں کی آمد کا سن کر مجھے شدید کوفت کا احساس ہوا تھا۔ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر دو گھڑی کا آرام چاہتی تھی۔صبح سے کام کرتے کرتے یہ وقت آ گیا تھا۔پل بھر کے لیے بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا۔منیلا سے لاہور تک کے لمبے اور تھکا دینے والے سفر سے ہڈیوں کو ابھی آرام نہ ملا تھا کہ پورے گھر کی صفائی ستھرائی کرنی پڑ گئی۔نوکر نے گھر کباڑ خانہ بنا رکھا تھا۔

''کون ہیں؟''

میری آنکھوں میں استفسار کی واضح علامات محسوس کرتے ہوئے میرے سب سے چھوٹے دیور نے آہستگی سے کہا۔

''رشتہ دار ہیں۔پھوپھی جینی کی بہو اور ان کی بہن وغیرہ ہیں۔''

''چلو انہیں ڈرنک وغیرہ دو۔میں آتی ہوں۔''

دعا کے لیے ہاتھ اٹھے تو آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔جی چاہنے لگا کہ جائے نماز پر ہی ڈھیر ہو جاؤں۔

کسی شے کی عارضی سی محرومی بھی کتنی اذیت کا باعث بن جاتی ہے۔ جہاز سے اترتے ہی میں نے اپنے دل میں طے کیا تھا کہ جاتے ہی دھم سے بستر پر گر جاؤں گی اور جی بھر سوؤں گی۔

ائر پورٹ پر میرے استقبال کے لیے کوئی نہیں تھا۔ خیر صبح چار بجے بچوں کے آنے کا تو کوئی سوال نہیں تھا مگر احسن کو تو اطلاع دی گئی تھی وہ کیوں نہیں آئے۔ ویٹنگ لاؤنج کی تیز روشنیوں میں میں نے اپنے آپ کہا۔

''لگتا ہے صاحب بہادر کا غصہ ابھی تک قائم ہے۔''

دراصل فلپائن کے دارالحکومت منیلا میں تعلیمی کانفرنس ہو رہی تھی۔ فیکلٹی روم میں ہی مجھے کسی نے بتایا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے تمہیں بھیجنے کی تجویز ہے۔ تیاری رکھنا۔

بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ فطرتاً میں ایڈونچرس ہوں۔ نئی جگہیں نئے لوگ، نت نئے تجربات، مجھے یہ سب زندگی کا انتہائی خوبصورت حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ فلپائن تو یوں بھی مشرقی سمندر میں ہریالے جزیروں کا ایک جھنڈ ہے جہاں خطرناک طوفان آتے ہیں۔ خلیج کے پانیوں میں لانچیں اور راکٹ چلتے ہیں۔ اور جیپوں میں بیٹھ کر شہر کے گلی کوچوں میں سیر کرنا بہت لطف دیتا ہے۔ احسن دفتر سے آئے تو میں نے انہیں بتایا۔ جمائیاں اتارتے ہوئے انہوں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

''پنجاب یونیورسٹی کو باہر بھیجنے کے لیے تمہارے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔''

''نظر تو بہت آتے ہیں مگر پانچ سے دس سال کے بچے زیر بحث ہیں اور یہ میرا فیلڈ ہے۔''

بستر پر چت لیٹتے ہوئے وہ تھوڑی دیر چھت کو گھورتے رہے اور پھر کسی قدر

ملائمت سے بولے۔

''چھوڑو یار! انکار کردو۔ گھر چوپٹ ہو جاتا ہے۔''

''چوپٹ ہونے والی کونسی بات ہے؟ اماں آجائیں گی۔ نوراں موجود ہے۔ احسن میں اس چانس کو مس نہیں کرنا چاہتی۔'' کہتے ہوئے میں وہاں سے اٹھ آئی۔

ساتھ رہنے والوں کے کوئی دانت تھوڑے گنے جاتے ہیں۔ وہ جانے پہچانے ہوتے ہیں۔ احسن امن پسند طبیعت کے مالک ہیں۔ زندگی میں نیاپن اور ہنگامہ آرائی انہیں سخت ناپسند ہے نوکری کی نوعیت ایسی ہے کہ اکثر اندرون ملک اور بیرون ملک جانا پڑتا ہے مگر کہیں بھی جانے سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ جانے سے قبل جانے کا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے اور واپس آکر وہاں کی تکالیف کے تذکرے۔ ایک بار کوئٹہ جا رہے تھے۔ سامان بریف کیس میں رکھتے ہوئے میں نے یونہی کہہ دیا۔

''مجھے بھی ساتھ لے چلیں کوئٹہ نہیں دیکھا ہے۔''

''لعنت بھیجو! میں دفتر میں یکسوئی سے کام نہیں کرسکوں گا۔ دھیان تم میں ہی اٹکا رہے گا کہ کہیں راستہ واستہ نہ بھول جاؤ۔ کوئی رکشے ٹیکسی والا ہی چکر نہ دے جائے۔''

میں نے بریف کیس کو لاک کیا اور ہنسی ہونٹوں میں دباتی باہر آگئی۔ تو گویا میں ننھی منی سی بچی ہوں جس کے بھٹک جانے کا ڈر ہے۔

فلپائن جانے سے مجھے کوئی نہ روک سکا۔ احسن کا موڈ خراب تھا بچے بھی منہ بسور رہے تھے مگر مقررہ دن میں مختصر سامان کے ساتھ جہاز میں جا بیٹھی اور مشرق بعید کی طرف پرواز کر گئی۔

اب یہاں کھڑی میں وسوسوں کا شکار ہو رہی تھی کہ گھر پر سب خیریت سے ہوں۔ وگرنہ احسن تو زندگی بھر طعنے ہی مارتے رہیں گے اور کرلو نوکریاں۔ سیر سپاٹے فرصت

دیں تو گھر داری کا دھیان آئے۔

وہ مخصوص جگہ جہاں احسن اکثر اپنی گاڑی کھڑی کرتے تھے خالی تھی۔ میری آنکھوں میں شاید والی آخری جوت بجھ گئی تھی۔ ٹیکسی سٹینڈ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے میں نے فضا کو دیکھا۔ تاریکی کی مدھم سی چادر تنی ہوئی تھی۔ درخت خاموشی سے کھڑے تھے اور سڑک ویران تھی۔ بس اکا دکا گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ ایک خالی رکشے کو ہاتھ دیا جو سڑک پر غالباً سواری کی تلاش میں ہی تھا۔ گھر پہنچ کر کال بیل بجائی۔ بیل خراب تھی۔ ہاتھوں سے خوب خوب دروازہ پیٹا۔ دس منٹ بعد اماں نے کھولا۔ گلے سے لگایا، منہ ماتھا چوما۔

''سب لوگ ٹھیک ہیں نا؟'' میں نے تیزی سے تھوک نگلا۔ اور پوچھا۔

''نوراں بیمار پڑ گئی تھی۔ ابھی بھی ٹھیک نہیں۔ بچے اور احسن وغیرہ سب ٹھیک ہیں۔''

بچے اپنے بستروں پر لیٹے گہری نیند سو رہے تھے مگر بستروں کی چادریں اور تکیوں کے غلاف گندے ہو رہے تھے۔ سارے گھر میں گھومی۔ میرا جی اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔ کسی کونے میں گندے کپڑوں کا ڈھیر تھا تو کہیں کوڑا جمع تھا۔ کمروں کی ہر شے الٹ پلٹ تھی۔ اب ایسے میں دھم سے بستر میں کود جانے اور گہری نیند سو جانے کا خیال ہی مضحکہ خیز تھا۔ سات بجے احسن اٹھے۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ یوں صفائی میں جُتے دیکھا تو ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولے۔

''زہرہ۔ ارے رہنے دینا تھا۔ آرام کرتیں۔ لمبے سفر نے تھکا ڈالا ہوگا۔''

''لمبے سفر نے تو نہیں البتہ آپ کی بے حسی نے ضرور تھکا ڈالا ہے۔''

بس نہ چلتا تھا ورنہ احسن کا گلا دبا دیتی۔

دو بجے تک کام نپٹ گیا تھا۔نماز سے فارغ ہو کر چائے پینے اور سو جانے کا سوچا تھا۔اب ایسے میں مہمانوں کی آمد پر ناگواری کا ردعمل فطری عمل تھا۔

ڈرائنگ روم میں بڑے صوفے پر دو عورتیں بیٹھی تھیں۔سر اور گردن صوفے کی بیک پر پھیلائے پاؤں جوتیوں سے باہر نکالے۔ادھیڑ عمر کی عورت کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا۔گوری رنگت والی نوجوان عورت تپائی پر رکھے ٹائم کے اوراق پلٹ رہی تھی۔ دوسرے صوفے پر سولہ سترہ سال کی کمسن لڑکی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ان کے بالکل سامنے کوئی پینتیس کے ہیر پھیر میں ایک سانولا پرکشش مرد بیٹھا تھا۔میں خاموشی سے خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

مرد نے تعارف کروایا معلوم ہوا کہ وہ رشتے میں احسن کے قریبی عزیز ہیں۔

''اصل میں ملنا ملانا اور ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تعلقات کو مضبوط رکھتا ہے۔کچھ ہم لوگ سوشل نہیں اور کچھ یہ لوگ بھی روکھے ہیں۔''

اشارہ احسن کے ماں باپ کی طرف تھا۔

ادھیڑ عمر کی عورت اس کی ساس،نوجوان عورت اس کی بیوی اور کم سن لڑکی اس کی بہن تھی۔

معمر عورت نے دو منٹ تک میرا چہرہ بغور دیکھا اور بولی۔

''مہربانی ہوگی اگر آپ ہمیں ڈاکٹر فاروق کے سسرال لے چلیں۔''

''ڈاکٹر فاروق کے سسرال۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

میری دونوں بھنوؤں کے درمیان کا چھوٹا سا حصہ سکڑ گیا تھا۔وہاں ایک لمبی سی لکیر یقیناً پڑ گئی ہوگی۔معمر خاتون کی تکونی آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔

''آپ ڈاکٹر فاروق کے سسرال میں بیٹھی ہیں۔غزالہ کی شادی میں نے ہی

ڈاکٹر فاروق سے کی ہے۔''

''تو آپ یہ جانتی تھیں کہ فاروق شادی شدہ اور ایک بیٹی کا باپ ہے۔''

اس بار سوال نوجوان عورت نے کیا تھا۔

''میں صرف یہ جانتی ہوں کہ فاروق اور اس کی بیوی کے تعلقات گزشتہ کئی سالوں سے سخت کشیدہ تھے۔ایک سال قبل دونوں کے درمیان طلاق سے مکمل علیحدگی ہوگئی ہے۔''

''بالکل غلط۔'' معمر عورت اور اس کی بیٹی بیک وقت چلائیں۔

''وہ گزشتہ سال آیا تھا اور اس نے کسی امر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہم سے۔''

''ہوسکتا ہے نہ کیا ہو مگر میں نے طلاق کے کاغذات خود دیکھے ہیں۔''

میں نے نہایت اطمینان اور سکون سے کہا۔

''آپ کو اپنی ہی ایک ہم جنس پر ظلم کرتے شرم نہ آئی۔''

نوجوان عورت کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔اور وہ ہائم کو اپنے ہاتھوں سے رول کر رہی تھی۔اس کی اضطراری کیفیات صاف پڑھی جاسکتی تھیں۔

سخت غصہ آیا۔گفتگو کا یہ گھٹیا پن اس کی ذہنی پستی کو ظاہر کر رہا تھا۔تاہم میں نے خود پر ضبط کیا۔

اگر وہ اس وقت میرے گھر میں نہ بیٹھی ہوتی تو میں نے اُسے ایک شٹ اپ کال دینی تھی۔مگر جب میں نے بات کی میرے لب و لہجے میں نرمی کے ساتھ شائستگی بھی تھی۔

''شرم والی کوئی بات نہیں۔آپ یقیناً اس امر سے آگاہ ہوں گی کہ طلاق کے بعد میاں بیوی کے درمیان شرعاً اور قانوناً کوئی ناطہ نہیں رہتا۔ہر دو آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے لیے جو فیصلہ بھی مناسب سمجھیں کریں۔یوں یہ اور بات ہے کہ آپ جانتے

ہوئے بھی غلط پوز کر رہی ہیں اور بلاوجہ ہنگامہ آرائی کے موڈ میں ہیں۔''

چائے آ گئی تھی میں نے بنا کر انہیں دینا چاہی ۔احسن کے پھوپھی زاد بھائی اور اُس کی سالی نے کپ تھام لیے مگر ماں بیٹی انکار کے فضول چکر میں پھنس گئی تھیں اور کوئی بات سننے کا نام نہ لے رہی تھیں ۔میں نے خاموشی سے کپ ٹرے میں رکھ دیئے ۔اور ٹرالی کو اپنے آگے سے سرکا دیا۔

اُس بے غیرت نے میری بہن کی زندگی تباہ کر دی ۔یہ نہ کرو ،وہ نہ کرو ۔بدکردار انسان تو خدائی عذاب سے کم نہیں ہوتا ۔بھولی بھالی زینب ! کیسا دھوکا ہوا ؟ کتنا بڑا فراڈ ہوا اس کے ساتھ؟ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا سارا کچا چٹھا کھول دوں ۔مگر یہ سوچ کر کہ بلاوجہ بات بڑھ جائے گی میں چپکی بیٹھی رہی ۔جب سب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے اُس نے جلے دل کے پھپھولے ایک بار پھر پھوڑ دیئے ۔

''کسی کی بیٹی کو پرائی آگ میں دھکیل کر تم نے اچھا نہیں کیا۔سال بعد جب وہ بھی طلاق لے کر آ جائے گی تب تمہیں معلوم ہو گا۔''

میں نے گہری نظروں سے بات کرنے والی کو دیکھا اور طنز سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خاطر جمع رکھیئے ایسا تو انشاء اللہ کبھی ہو گا ہی نہیں ۔غزالہ سمجھدار اور ذہین لڑکی ہے ۔شوہر کو سیدھا سادہ دیکھے گی تو اس کی ناک میں نکیل ڈال لے گی ۔اگر وہ چالاک اور ہوشیار ہوا تو وہی ناک اپنی نکیل اپنی ناک میں ڈال لے گی ۔ بسنے اور اُجڑنے کے عمل کا دارومدار بہت حد تک عورت پر ہوتا ہے۔''

غزالہ سے میرا خونی ناطہ نہیں ۔بس دلی تعلق ہے جو اتنا گہرا ہے کہ جس نے پور پور میں رچ بس کر اُسے اتنا اہم اور محبوب کر دیا ہے کہ وضاحت کے لئے الفاظ اور اظہار فضول

سے لگتے ہیں۔ذکیہ غزالہ کی بڑی بہن میری دوست ہے۔ہمارے گھر پاس پاس تھے۔ذکیہ کی ماں چھٹپنے میں ہی مرگئی تھی۔کوئی بھائی نہیں تھا۔نچلے طبقے کے جومسائل انہیں زندہ درگور رکھتے ہیں وہ یہاں بھی تھے۔بوڑھاباپ محنت مشقت کرتا۔ذکیہ خود پڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹیوشنز کرتی۔

ہمارے معاشی حالات میں اُنیس بیس کا ہی فرق ہوگا۔میرے والد محکمہ انہار میں کلرک تھے مگر گھر میں بچوں کی فوج تھی۔سب سے چھوٹے ماموں لندن میں تھے اور اکثر پیسے بھیجتے رہتے تھے۔یوں لشتم پشتم ہماری گاڑی چلتی تھی۔ذکیہ دلیر اور رہمت والی لڑکی تھی کبھی کبھی جب میں اپنے گھریلو حالات پر کڑھتی تو وہ بڑے عزم سے کہتی۔

''دیکھو زہرہ جدوجہد سے آگے بڑھو اور اپنے لیے معاشرے میں اچھا مقام پیدا کرنا ہے۔میں کوٹھیوں والوں کے بچوں کو پڑھانے جاتی ہوں کچھ بھی نہیں ہے وہاں۔ظاہری لبادے خوبصورت نظر آتے ہیں مگر اندر سے کھوکھلے ہیں۔''

میں اور وہ بڑی پامردی سے حالات کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔مصائب کی کٹھنائیوں نے اسے تپا کر کندن بنا ڈالا تھا۔ایم۔اے میں پہنچ کر ایکا ایکی اُس نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔وہ ایک اونچے گھر میں بچوں کی ٹیوٹر تھی۔بچوں کا چچا نیروبی کا مانا ہوا لکھ پتی آدمی تھا۔شادی کو پندرہ سال ہو گئے تھے مگر بیوی کی کوکھ ویران تھی۔اسے بارآور کرنے کے لیے اس نے بارہ آپریشن کروائے اور تیرھویں میں زندگی ختم ہوگئی۔پریشان حال وہ پاکستان آ گیا تا کہ بہن بھائیوں میں کچھ غم کا مداوا ہو۔یہیں اسے ذکیہ ملی۔عالی حوصلہ اور باوقار۔وہ اس سے بہت متاثر ہوا۔اپنا آپ کھول کر اس نے سامنے رکھ دیا۔اس کھلی کتاب کو ذکیہ نے ایک ہاتھ سے بند کرتے ہوئے کہا۔

''میں سوچوں گی۔''

سوچ کے عمل میں میرا وجود ناگزیر تھا۔ میں نے سنا تو بھڑک اٹھی۔

''بڈھے سے شادی کرو گی؟ دولت پر مرمٹیں؟''

''دیکھے بغیر تبصرہ ٹھیک نہیں پہلے ملاقات پھر بحث۔'' وہ نرمی سے بولی۔

''اصل میں زہری میں حالات سے لڑتے لڑتے تھک گئی ہوں۔ میرے پاؤں لہو لہان ہو گئے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو زیادہ عرصہ تک نہیں جھٹلا سکتے کہ پیسہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ زبیر میڈیکل کے پہلے سال میں ہے اور اس کے لیے ڈھیروں پیسہ چاہیے۔ یوں بھی آج کے اس مادی دور میں گُنوں کی بجائے نظریں گہنوں پر جاتی ہیں۔ ہمارے جیسے گھروں کی لڑکیاں پڑھ کر نہ گھر کی رہتی ہیں نہ گھاٹ کی۔ اچھے اور اونچے لوگ ہی اوپر جاتے ہیں۔ نیچے جھونپڑوں میں کیسے کیسے لعل ہیں یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ نتیجہ میرے جیسی ناکام آرزوؤں اور حسرتوں کے غبار میں لپٹی ساری زندگی گزار دیتی ہیں۔ زندگی کے اس چلن سے مجھے شدید نفرت ہے۔ آنکھوں پر چشمہ چڑھائے بالوں میں چاندی کے تاروں والی کنواری مس سے میں جتنی الرجک ہوں تمہیں تو اس کا اندازہ ہے ہی۔''

وہ اپنے فیصلے آپ کرنے کی عادی تھی اعتراض کا کسی بھی جانب سے کوئی سوال نہ تھا۔ غزالہ اس وقت میٹرک میں تھی۔ شادی کے چند ماہ بعد وہ نیروبی چلی گئی اور غزالہ اور زبیر مکمل طور پر ہماری سرپرستی میں آ گئے۔

باہر کی چیزوں سے اس کا گھر تو بھرنا ہی تھا۔ میرا گھر بھی سج گیا تھا۔ غزالہ کی شادی اس کے لیے موزوں لڑکے کی تلاش اب میری ذمہ داری تھی۔ میں ایم۔اے کے بعد یونیورسٹی میں ہی سلیکٹ ہو گئی تھی۔ شادی بھی ہو گئی اور بچوں کی ماں بھی بن گئی تھی۔

دیو پیکر، جمبو جیٹ جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر اتر چکا تھا۔ ٹیوب ٹینل طیارے سے لگا دی گئی تھی۔ میرا بدن چھتیس گھنٹے کے طویل سفر سے چور چور تھا مگر میری آنکھوں میں

شوق وتجسس کی دنیا امنڈی ہوئی تھی۔ میں نے امریکہ کی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہوئے اک ذرا رک کر اپنے اردگرد روشنیوں سے جگمگاتے ماحول کو دیکھا۔ اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ غزالہ کے لیے میں جس ہیرے کی متلاشی ہوں وہ مجھے یہاں ملے گا۔

میں شکاگو میں ہونے والی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ کوئی چار پانچ دن قبل میں اپنے آنگن میں بیٹھی ساتھ لے جانے والی ساڑھیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب میرے عزیز ونگ کمانڈر ایس حمید کی گونجدار آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اپنے آپ دوڑ گئی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے ہانک لگائی۔

''یہیں آجایئے حمید بھائی۔''

وہ میرے سامنے موڑھے پر آکر بیٹھ گئے۔ ساڑھیوں کا بازار سامنے بکھرا دیکھا تو بولے۔

''تم عورتوں کو کپڑوں کا کتنا جنون رہتا ہے۔ طبیعت سیر ہی نہیں ہوتی۔''

''اصل میں میں امریکہ جارہی ہوں۔ ساتھ لے جانے والے کپڑوں کی چھانٹی کررہی تھی۔'' میں نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ رعب جھاڑا۔

''اوہو۔'' انہوں نے آنکھیں گھمائیں۔

''زہرہ احسن تو بھئی اب بڑی شے بن گئی ہیں۔''

یہیں انہوں نے مجھے ڈاکٹر فاروق کے متعلق بتایا۔ فون نمبر اور پتہ لکھ کر دیا اور ملنے کی تاکید کی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ ڈاکٹر فاروق شکاگو کے سول ہسپتال میں تعینات تھے۔

چار پانچ دن تک ڈاکٹر فاروق میرے ذہن سے اترا رہا۔ میں کانفرنس میں مندوبین کے مقالوں اور مذاکرات کے چکروں میں اُلجھی رہی۔ چھٹے دن مجھے اچانک ہی خیال آیا۔ ڈائری نکال کر میں نے نمبر گھمایا۔

ڈاکٹر فاروق جلد ہی لائن پر آ گیا۔ میں نے اپنا تعارف اس کے دوست ونگ کمانڈر حمید بھائی کے حوالے سے کروایا۔

''ارے تو اتنے دن بعد کیوں خیال آیا؟ پاکستان سے چلتے ہوئے مجھے اطلاع دینی تھی۔ میں آپ کو نیویارک رسیو کرنے آتا۔''

جب میں نے شکریہ کہا تو اس نے کہا۔

''آپ کو لینے آ رہا ہوں۔ ذرا شہر دکھاتے ہیں آپ کو۔''

ڈاکٹر فاروق دس منٹ بعد میرے سامنے تھا۔ متین سا بردباری کی پھوار میں بھیگے ہوئے چہرے والا پرکشش، اونچا لمبا، خوب گورا چٹا عمر میں کوئی درمیانہ معاملہ تھا۔

کانفرنس سے فارغ ہو کر میرا بقیہ وقت ڈاکٹر فاروق کے ساتھ ہی گزرتا۔ بڑا ہی دکھی انسان تھا۔ ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ چھوٹے چچا نے پالا۔ لمبی چوڑی جائیداد کا تنہا وارث تھا۔ پیسے کا کائی مسئلہ نہ تھا پڑھنے کا شوق رکھتا تھا۔ میڈیکل کرنے کے بعد امریکہ آ گیا۔ دو سال بعد پاکستان آیا۔ رشتہ داروں میں شادی کی۔ انڈر میٹرک زینب کو بھی اپنے ساتھ لے آیا۔

جب ہم ایک دن ایک ڈرگ اسٹور میں بیٹھے ہم آئس کریم کھا رہے تھے اور وہ مجھے کتاب زندگی کے تلخ باب سنا رہا تھا۔

''میری بدقسمتی کہہ لیجیے کہ زینب اچھی ساتھی ثابت نہیں ہوئی۔ اس نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ بیٹی بھی پیدا ہو گئی تھی۔''

میں نے محسوس کیا تھا اپنے بارے میں باتیں کرتے ہوئے فاروق کا چمکتا دمکتا چہرہ بجھ گیا تھا۔

''آخر کیوں جھگڑتی ہے؟ تنازعے کی کوئی وجہ تو ہو گی۔''

''بہت شکی عورت ہے۔میرے پیشہ وارانہ فرائض کی نوعیت کو سمجھتی ہی نہیں۔ الزام تراشی کرتی تھی کہ میرے دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات ہیں۔قدم ساتھ ملا کر چلنے کی بجائے وہ متوازی راستوں پر چلنے کو ترجیح دیتی تھی۔ ہر وہ کام جو مجھے ناپسند ہوتا وہ اس کے لیے پسندیدہ ہوتا۔ان حالات میں وقت کیسے گزرتا۔علیحدہ ہونا پڑا۔''

میں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی میرا خیال اُسے سمجھانے کا تھا۔کہ شاید وہ راہ راست پر آجائے۔فاروق نے میری خواہش کی مخالفت تو کی مگر میرے اصرار پر مان گیا۔اور ہم ایک شام ایشے اسٹریٹ کی گیارہ منزلہ عمارت کے سامنے رکے۔نمبر سات کی اطلاعی گھنٹی بجی اور چند لمحوں بعد ایک خوبصورت عورت نے دروازہ کھولا۔نہ سلام نہ دعا۔ فاروق اور مجھ پر نظر پڑتے ہی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

''کیوں آئے ہو یہاں؟اس نئی چڑیا کو پھانسا ہے۔اب مجھے دکھانے اور جلانے آئے ہو۔نکل جاؤ میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔''

اور دروازہ زور سے بند ہو گیا۔میں تو سرتا پا سلگ اُٹھی تھی۔

''ایسی فضول اور بیہودہ عورت یہ تو نرا سائیکو کیس ہے۔''

گاڑی میں بیٹھ کر میں نے پوچھا تھا۔

''کتنا عرصہ رہے آپ لوگ اکٹھے؟''

''یہی کوئی پانچ چھ سال۔'' فاروق گاڑی کو چوتھے گیئر میں ڈالتے ہوئے بولا۔ تمہارے حوصلے کی داد دوں گی۔ایسی پاگل عورت کے ساتھ تو ایک گھنٹہ گزارنا مشکل ہے اور تم نے پانچ چھ سال گزار دیئے۔''

بیس دن بعد جب میں پاکستان واپس آ رہی تھی فاروق نیویارک تک مجھے چھوڑنے آیا۔اس نے مجھے میرے بے حد انکار کرنے کے باوجود اسی طرح رخصت کیا جیسے

اپنے ماں جائے سگی بہنوں کو کرتے ہیں۔ میں عظیم الشان جان ۔ایف کینیڈی ائیر پورٹ پر کھڑی تھی۔ جہاں ہر منٹ بعد ایک طیارہ اتر اور چڑھ رہا تھا۔ میں نے فاروق کو دیکھا اور کہا۔

''فاروق! میں کوشش کروں گی کہ تمہارے لیے ایک خوبصورت اور نیک سیرت ساتھی کا انتخاب کروں۔''

اب بھلا غزالہ کے لیے فاروق سے بہتر کون ہوسکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے ذکیہ کو خط لکھا اس کا جواب میری توقع کے عین مطابق کہ غزالہ کے لیے تمہیں مجھے پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟غزالہ سے پوچھا۔اس نے کہا۔

''آپا مجھے دکھایئے ۔دیکھے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گی ۔''

چند ماہ بعد فاروق پاکستان آیا۔وہ بیچ میں لٹکتے اور ہر دم جان کھاتے اس مسئلے کو پار لگا آیا تھا۔رات کے کھانے پر سب اکھٹے تھے۔غزالہ بھی موجود تھی ۔اسمیں شک نہیں تھا کہ غزالہ حسن و رعنائی کا بھرپور شاہکار تھی ۔گہرے نیلے رنگ کے سادہ سے سوٹ میں جگمگا رہی تھی ۔فاروق کی نظروں سے چھلکتی ستائش اور پسندیدگی مجھ سے چھپی نہ رہی۔اور میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ جب غزالہ سے بات ہوئی اور اس نے کسی قدر بے نیازی سے کہا۔

''آپا!اس نے مجھے کچھ زیادہ اپیل نہیں کیا۔''

میرے لہجے میں تشویش تھی۔''کیا کہیں اور کوئی پسندیدگی تو نہیں؟''

''ہرگز نہیں بڑی آپا۔آپ سے میرا کوئی راز نہیں!'' کوئی بات ہوتی تو آپ کو بتاتی۔

زیادہ اصرار مناسب نہیں سمجھا۔سوچا تھا کہ چند دنوں بعد پھر اس سے بات کروں

گی ۔اِس کی نوبت ہی نہیں آئی ۔صرف دو دن بعد کی ہی بات ہے ۔دو بجے میرے چھوٹے بھائی برہان نے دستک دی اور بتایا کہ غزالہ کو شدید تکلیف ہے ۔اماں آپ کو بلا رہی ہیں ۔''

فاروق اُن دنوں میرے ہاں ہی تھا ۔میں نے اُسے اٹھایا اور غزالہ کے متعلق بتایا ۔میں احسن اور فاروق غزالہ کے ہاں پہنچے ۔فاروق نے اُسے چیک کیا اور کہا ۔

''اپنڈیکس ہے فوراً آپریشن ہونا چاہیے ۔''

اسی وقت اسے آصف کلینک لے گئے ۔ڈاکٹر آصف فاروق کا دوست تھا ۔سرجری میں سپشلائیزیشن اس نے امریکہ سے کی تھی ۔دونوں نے مل کر اس کا فوراً آپریشن کیا ۔

جب اس کی آنکھیں بند ہوئیں فاروق اُس پر جھکا ہوا تھا ۔مجھے اور احسن دونوں کو باہر بھیج دیا ۔

اس کی کھلی آنکھوں کو دیکھ کر وہ ذرا سا جھکا اور مدھم آواز میں بولا ۔

''کیسی طبیعت ہے آپ کی اب؟ آپریشن بالکل ٹھیک ہوا ہے ۔انشاءاللہ دو تین دنوں میں چلنے پھرنے لگیں گی ۔''

اس کی خوبصورت صندلی پیشانی پر ڈاکٹر فاروق کا مضبوط بھاری ہاتھ تھا ۔چوبیس گھنٹے فاروق اس کے پاس رہتا ۔اپنے ہاتھ سے دوا کھلاتا ۔ذرا سا ٹیک لگا کر بٹھا دیتا ۔سچی بات تو یہ ہے کہ میری اور احسن کی ساری دردسری فاروق نے اپنے سر لے لی تھی اور ہمیں فارغ کر دیا تھا ۔غزالہ کی چند سہیلیاں اسے دیکھنے آئیں ۔فاروق کے بارے میں استفسار ہوا ۔اس نے کہا ۔

''بھئی میرے کزن ہیں، ڈاکٹر ہیں ۔میرا آپریشن انہوں نے ہی کیا ہے ۔''

ایک دو نے شوخی سے کہا ۔

''کہیں ہتھیانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے!''

غزالہ نے ٹالتے ہوئے کہہ دیا۔

''ارے! ابھی واضح نہیں ہوئے۔''

میں بھی اتفاق سے ہی پہنچ گئی تھی میرے ساتھ بھی از راہِ مذاق بات چھڑ گئی۔ میں نے واشگاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''اس کا منگیتر ہے۔''

میں نے پختہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ہر قیمت پر یہ شادی کروں گی۔ زبیر اس معاملے میں میرے ساتھ متفق تھا۔ فاروق ہیرا تھا اور میں اس ہیرے کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

گھر آنے سے قبل ایک شام وہ اسے باغ جناح لے گیا۔ روشوں پر غزالہ آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ وہ پھولوں کی کیاری کے پاس بیٹھا اُسے چہل قدمی کرتے دیکھتا رہا۔ اور جب وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

''آپ کو میں نے بہت پریشان کیا۔ دن رات کی تیمارداری نے آپ کو تھکا دیا ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اچھا ڈاکٹر سخت جان ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں آرام کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔''

غزالہ نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے۔ غزالہ نے خاموشی توڑ دی۔

''کتنا عرصہ قیام کرنے کا ارادہ ہے یہاں؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''غزالہ۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''شاید تمہیں معلوم ہی ہو کہ زہرہ آپی نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ اپنے بارے میں میں کسی بھی حسنِ ظن سے کام نہیں لوں گا۔ میں پیار کا ترسا ہوا انسان ہوں۔ ماں نہیں دیکھی باپ نہیں دیکھا۔ ان کا پیار نہیں پایا۔ محبت اور شفقت کے معنی نہیں سمجھے۔ جوان ہوا تو سوچا شادی کروں گا تو بیوی مجھے پیار کرے گی اور میری تشنگی دور ہو جائے گی۔ مگر میری بدقسمتی کہ یہاں بھی میرے حصے میں کانٹے ہی آئے۔ یہاں آیا تمہیں دیکھا اچھی لگیں۔ مگر تم مجھے وہ خلوص اور اپنائیت دے سکوں گی یا نہیں یہ میں نہیں جانتا ہاں۔''

وہ اک ذرا سا مسکرایا۔ چند لمحے خاموش رہا اور پھر بولا۔

''مجھے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے بارے میں تمہاری سوچ کیا ہے؟''

وہ باغ کے ایک ایسے حصے میں بیٹھے تھے جہاں آمد و رفت کم تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ نیلے شفاف آسمان پر پرندوں کے غول اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔ سامنے کی طرف تین خوبصورت بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ غزالہ نے یہ سب دیکھا۔ ایک نظر فاروق پر ڈالی اور جیسے خوابناک سی آواز میں بولتی چلی گئی۔

زندگی میں دھن، دولت آرام آسائش سبھی کچھ مل جاتا ہے۔ کوئی شے اگر نایاب ہے تو وہ انسانی خلوص ہے۔ تم پیار و محبت کے ترسے ہوئے ہو تو سیراب میں بھی نہیں۔ اپنے مستقبل کے بارے میں جب بھی سوچا دل کو رینک اور سٹیٹس کی بجائے خلوص و پیار کے پلڑے کی طرف جھکا پایا۔ بہت زیادہ کی بجائے کم پر قناعت چاہی۔''

وہ چپ ہو گئی شاید اپنی محرومیاں یاد آ گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی اور پھر اس نے فاروق کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور صاف اور عزم سے بھرپور آواز میں بولی۔

''میں تمہیں اتنا پیار دوں گی کہ تم اس میں نہا جاؤ گے مگر تم سے اتنا پیار چاہوں گی کہ خود اس میں ڈوب جاؤں۔''

''ہاں!'' آداب گھر چلیں۔''

اس کی گردن اعتماد سے تنی ہوئی تھی۔آنکھوں میں ہیروں کی سی چمک تھی۔

آج ان دونوں کو امریکہ گئے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔غزالہ بہت باقاعدگی سے مجھے خط لکھتی ہے کبھی کبھار فون بھی کر لیتی ہے۔مجھے دوپہر سے اُس معمر عورت پر غصہ آ رہا تھا جس نے تصویر کا ایک رُخ دیکھا تھا۔جو اُن کی بیٹی وہاں سے انہیں دکھاتی رہی تھی۔

☆☆☆

میں مٹی کا مادھو

کہنے کو بیوہ ماں کا اِکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔ماں پرانے وقتوں کی بڑی دبنگ اور راٹھ زنانی تھی جو ''کھلائے سونے کا نوالہ اور دیکھے شیر کی آنکھ'' جیسے فارمولے والی کہاوت پر ایمان رکھتی تھی۔کھاتے پیتے اور عزت دار گھر کی بیٹی تھی۔بیاہ کر جہاں آئی وہ بھی ہم پلہ لوگ تھے۔مگر مقدر کس نے دیکھا تھا۔دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی جنہوں نے ابھی ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ باپ کی محبت سے محروم ہو گئے۔چھ فٹا نوجوان جو چند دن کی بیماری میں ہی چٹ پٹ ہو گیا۔کچھ وقت بعد میکے والوں نے عقد ثانی کے لئے کہا تو بڑی جی داری سے انکار کرتے ہوئے بولی۔

''کچھ خوفِ خدا کریں۔باپ کی شفقت سے تو خدا نے میرے بچوں کو محروم کر دیا۔اب جیتے جی ماں کی ممتا اور پیار بھی اُن سے چھیننا چاہتے ہیں۔بس راضی بر رضا رہیں اور جان لیں کہ یہی میرا مقدر تھا۔بس میرے بچے ہی میری متاع ہیں۔''

روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔خاندان میں پڑھائی کا چلن تھا۔بیٹا آصف بھی ذہین اور فرمانبردار نکلا۔امتیازی نمبروں سے میڈیکل کیا۔ماں کی گردن پوری برادری میں سوا

بالشت اونچی ہوگئی تھی۔مگر ہوا یہ کہ ساتھ ہی انگلینڈ کے لئے وظیفہ مل گیا۔تقسیم کے بعد کا ابتدائی زمانہ تھا۔گوریاں کالوں کو اپنے چھوں میں کس لیتی تھیں۔کالے ابھی آج کی طرح سیانے نہیں ہوئے تھے۔ماں نے ذرا تشویش بھری زبان میں کہا۔

''میں تمہارے پاؤں میں ممتا کی زنجیر تو نہیں پر بیاہ کی ضرور پہناؤں گی۔چلو اتنی سی تسلی تو رہے گی مجھے۔''

رشتوں کی کمی نہ تھی۔گھر گھرانہ ٹھیک ٹھاک اور لڑکا لائق فائق۔سلفے کی لاٹ جیسی لڑکی پازیبیں بجاتی آ گئی۔انگلینڈ جانے تک تین ماہ کی بیٹی اُس کی کود میں ایک ماہ کا حمل دے کر وہ دل پر بڑا سا پتھر دھر کر لندن سدھارا۔ہاں البتہ کس دل سے گیا؟ اِس کا حال صرف وہی جانتا تھا۔جا کر بھی خطوں پر یہ خط لکھتا جاتا۔بیٹی کی نئی نئی تصویروں کی فرمائشیں کرتا رہتا۔ماں نے چند ماہ تو برداشت کیا۔پھر لمبا چوڑا خط لکھا اور خاصی لتاڑ دی۔

''بیوی کے عشق میں ہی ڈوبے رہو گے یا پڑھائی میں بھی دیدہ لگاؤ گے؟ لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں،خوبصورت بیویاں گھر آتی ہیں،پر تمہاری طرح دیوانہ بنتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔اچھی طرح پڑھو اور امتحان پاس کر کے آؤ۔اِس میں تمہاری اور ہماری دونوں کی نیک نامی ہے۔شریکوں کے طعنے نہ دلوانا کہ گیا تھا لندن پڑھنے!''

چار سال بعد آیا۔دو ماہ کی بچی چھوڑ کر گیا تھا۔اب گل کوتھنا سا ایک بیٹا بھی میٹھی میٹھی باتیں کرتا پھدکتا پھرتا تھا۔

رشتہ داروں، دوستوں اور میل ملاپ والوں سے فراغت ملی تو اُس کی کوٹھی میں منتقل ہونے کا سوچا جو ہسپتال کی طرف سے دی گئی تھی۔یوں تو ذاتی مکان اچھا تھا اور تھا بھی اپنا پر گلی کوچوں میں واقع تھا۔ماں نے ساتھ چلنے کو کہا تو اُس نے ناراضی کا اظہار کئے بغیر کہا۔

''بچہ یہ مکان تمہارے باپ نے بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ جیتے جی اِسے چھوڑنا میرے لئے ممکن نہیں۔ تم لوگ جاؤ، خوش رہو۔ جب میرا جی ملنے کو چاہا میں چلی آؤں گی۔ جب تم اُداس ہوئے تم آ گئے۔''

نیا ماحول، نئی جگہ چار برسوں پر پھیلی ہوئی جدائی کی غم انگیز داستانیں۔ کچھ وقت تو پلک جھپکنے میں گزر گیا۔ کسی بات کا احساس ہی نہ ہوا۔ مگر اب وہ عجیب سی احساسِ محرومی سے دوچار ہونے لگا تھا۔ صبح اُٹھتا تو وہ سو رہی ہوتی۔ وہ نہاتا، شیو بناتا، کپڑے بدلتا اور ناشتے کی میز پر آ جاتا۔ تب بھی وہ سو رہی ہوتی۔ نوکر جو ناشتہ تیار کر کے میز پر رکھ دیتا۔ وہ چپ چپاتے کھا لیتا۔ کھانوں کا بھی یہی حال تھا۔

وہ خود بھی نک سِک سے آراستہ رہی۔ اعلیٰ کپڑے، میک اپ، بالوں کے نت نئے ڈیزائن، مگر اُس کے کپڑے گندے ہیں، بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں۔ جوتے پالش شدہ نہیں۔ کسی بات کی پرواہ نہیں۔ وہ ان باتوں کا عادی نہ تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک ماں اُس کے منہ میں اچھے سے اچھا نوالہ ڈالتی رہی تھی۔ جب چھوٹا سا تھا۔ باورچی خانے میں ماں کے پاس پیڑھی پر جا بیٹھتا۔ آگے چوکی پر ماں گرم گرم پراٹھا، دہی، انڈہ اور مربہ رکھ دیتی۔ ٹھونس ٹھانس کر اُسے کھلاتی۔

جوان ہوا تو میز پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ نوکرانی ساری چیزیں میز پر رکھ دیتی۔ ماں پاس آ کر بیٹھ جاتی۔ چھوٹی بہن کپڑے دھوتی، اِستری کرتی اور تہہ در تہہ اُنہیں الماری میں سینت دیتی۔ صبح کام پر جانے اور واپس آ کر پہننے والے کپڑے ہمیشہ کھونٹیوں پر لٹکتے تیار ملتے۔ جوتے پالش ہوتے۔ جرابیں صاف ستھری ملتیں۔ رومال عینک میز پر رکھی ہوتیں۔ شادی ہوگئی تو بھی یہی طریقہ رہا۔ ناشتہ کر کے اوپر اپنے کمرے میں جانے لگتا تو ماں آواز دیتی۔

''اے بیٹا! دلہن سے کہتے جانا ناشتہ کر لے آن کر۔''

وہ اُس سوتی ہوئی کو اُٹھاتا اور نیچے بھیجتا۔ وہ جب سات سمندر پار چلا گیا۔ تب بھی ماں آئے گئے کے ہاتھ اُسے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی جسے اُس کے ہندوستانی اور پاکستانی دوست کنگ کالج لندن کے کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر کھاتے اور اُس کی ماں کو دعائیں دیتے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ اُسے ہسپتال پہنچنے کے لئے فوری طور پر کہا گیا اور پہننے کے لئے کوئی کپڑا نہ ملا یا کپڑے پہن کر تیار کھڑا ہے اور دیکھتا ہے تو بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں۔ چند بار جب ایسی باتوں کا اعادہ ہوا تو اُس نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ تھوڑا سا اثر ہوا، مگر پھر وہی لاپرواہی۔ اُس کی خوش مزاجی ختم ہونے لگی۔ میز پر بیٹھتا تو کھانا دیکھ کر پریشان ہو اُٹھتا۔ ماں چند دن رہنے آئی۔ جہاندیدہ تھی۔ سب کچھ سمجھ گئی۔ تنہائی میں بولی۔

''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ ٹھکانے رکھو۔ سر پر چڑھ گئی تو اُترنی مشکل ہو جائے گی۔''

''اماں سر چڑھانے والی بات نہ تھی۔ چاہنے والا شوہر تو ہر عورت کی خوش نصیبی کی علامت ہے۔ جاہل تو نہیں تھی کہ میرے چاؤ چونچلوں پر مست ہتھنی کی طرح پھیل گئی۔ پڑھی لکھی روشن خیال، زمانے کی نبض پہنچاننے والی ہے۔ کیا نہیں جانتی کہ شوہر کے حقوق وفرائض کیا ہیں؟''

ماں نے علیحدگی میں بہو کو سرزنش کی۔

''دیکھو دلہن! میں نے کبھی ساسوں والا طریقہ تمہارے ساتھ نہیں برتا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہارے یہ چالے دیکھ کر تمہیں نتھ ڈال دیتی۔ اللہ رکھے بھرے پُرے گھر سے آئی ہو۔ گھر گھر ہستھوں والے لچھن نہیں ہیں تمہارے۔ اگر سنبھلو گی نہیں تو بتائے دیتی ہوں کہ گھر اور میاں دونوں چوپٹ ہو جائیں گے۔''

یہ ساس کی تنبیہ کا اثر تھا۔حالات کی نزاکت کا اُسے کچھ احساس ہوگیا تھا۔تھوڑی سی محتاط ہوگئی۔وہ طبعاً شریف تھا۔اُس کے تھوڑا سا بدلنے پر خوش ہوگیا۔بیوی کی چھوٹی بہن میکسیکو سے وطن آئی تو بہن سے ملنے اُس کے ہاں آئی۔پندرہ بیس دن رہی۔وقت بے وقت گھر سے غائب رہنے کا معقول جواز ہاتھ آ گیا تھا۔اب پھر وہی روٹین شروع۔نہ اُس کے کھانے کی فکر، نہ کپڑوں کی۔وہ ہسپتال سے آتا، معلوم ہوتا بیگم غائب ہیں۔کسی سے ملنا تھا یا شاپنگ کے لئے بازار تشریف لے گئی ہیں۔

غالباً بہن کو یہ سب عجیب سا لگا تھا۔تبھی ایک دن وہ دو لے بنا نہ رہ سکی۔

''اے آپا! مجھے تو دولہا بھائی کھنچے کھنچے سے دِکھے ہیں۔''

''بی اِن کی بات چھوڑو۔یہ تو چاہتے ہیں کہ میں ہر وقت سر جھاڑ منہ پھاڑ کچن میں گھسی ان کے لئے رنگا رنگ پکوان پکاتی رہوں۔جب یہ ٹھنس ٹھنسا جائیں تب اِن کی دلداریاں کروں۔ہسپتال چلے جائیں تو ان کے کپڑے دیکھوں، دھلاؤں، بٹن ٹانکوں اور استری کروں۔ان کے گھر آنے سے پہلے ہر شے فٹ فاٹ ہو۔مجھ سے نہیں اُٹھتے یہ نخرے۔''

''مگر یہ سب کام تو عورت کے کرنے کے ہیں۔آپا! اتنی لاپرواہی اچھی نہیں۔مرد ذات کا کوئی اعتبار نہیں۔ایسا نہ ہو کہ وہ سکون کے لئے کوئی اور ذریعہ ڈھونڈ لیں۔''

''بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔میں اِن کی رگ رگ سے واقف ہوں۔اِتنے جوگے نہیں۔''

وہ بغلی کمرے میں بیٹھا صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ابھی تھوڑی دیر پہلے ہسپتال سے آیا تھا۔چھوٹی بہن نے یہ کہہ کر ''مجھے تو آپ کے یہ طور طریقے پسند نہیں'' گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔مگر اُس کے ذہن کے سارے بند دروازے کھل گئے تھے۔

زندگی مال گاڑی کے بند ڈبے کی طرح پٹڑی پر چڑھی رینگتی رہی۔ کبھی کبھی لائن سے اُتر جاتی۔ مل ملا کر دوبارہ چڑھالی جاتی۔ دو بچوں میں مزید تین کا اضافہ ہو چکا تھا۔ بڑی لڑکی اور لڑکا کالج میں زیر تعلیم تھے اور وہ کسی ناکارہ شے کی طرح گھر کے ایک کھنڈے میں پھینکا جا چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ تنہا بیٹھ کر سوچتا۔

''یہ عورتوں کی بدقسمتی سے کہیں وہ قسم تو نہیں جو ڈنڈے سوٹے کھا کر درست رہتی ہے۔ پر میری شرافت، دست درازی اور گالی گلوچ دونوں کو پسند نہیں کرتی۔ انسان فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔''

اُنہی دنوں حیدرآباد ہسپتال میں اُس کا تبادلہ ہو گیا۔ بیوی بچوں کا ساتھ جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ بیوی کو جانے کی تمنا نہ تھی اور وہ لے جانے کا خواہش مند نہ تھا۔ رہے بچے تو وہ سکولوں، کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔

یہاں اُس کی ملاقات عائشہ فضل سے ہوئی۔ وہ اپنے آفس میں تنہا بیٹھا ایک سنگین کیس کی ہسٹری شیٹ دیکھ رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز نے اُس سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ نرسنگ یونیفارم میں ایک مناسب سے قد کی خاتون کھڑی تھی۔ اُس نے سر کے اشارے سے اجازت دی۔ آنے والی نے بیٹھ کر اُسے بتایا کہ اپنی ماں کی علالت کے سلسلے میں اُس نے پندرہ دن کی چھٹی لی تھی۔ دو ماہ ہو گئے ہیں اُسے ڈیوٹی جوائن کئے ہوئے بھی مگر ابھی تک تنخواہ کی کلیئرنس نہیں ہو رہی ہے۔ وہ جہاں جاتی ہے اُسے ٹرخا دیا جاتا ہے۔ اُس کی فالج زدہ ماں اور بہن بھائیوں کا تو گزارہ ہی اُس کی تنخواہ پر ہے۔

کاغذات کو ایک طرف رکھ کر پہلی بار اُس نے قدرے غور سے اُسے دیکھا۔ نچلے متوسط طبقے کی لڑکی تھی جس کے کندھوں پر گھر بھر کی ذمہ داریاں تھیں شاید۔ اُس نے دلاسا

دیا اور کام جلد کرنے کا وعدہ کر کے اُسے رخصت کیا۔ اپنے پی اے سے بات کی جس نے اُس کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرتے ہوئے اُس کے کانوں میں یہ ڈالا کہ وہ انتہائی ذمہ دار اور فرض شناس نرس ہے۔ نہایت غریب گھر کی لڑکی ہے۔ باپ بچپن میں ہی مر گیا۔ نرس بن کر سارے گھر کا بوجھ اُٹھالیا۔ دو بہنوں کی شادی کر دی ہے۔ بہن بھائی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں جن کی کفالت اُس کے ذمے ہے۔ نیک اور شریف لڑکی ہے۔

اُس نے متعلقہ افسر کو بلایا اور کام جلد سے جلد کرنے کو کہا۔ چند دنوں بعد جب ایک روز وہ ہسپتال کے کوریڈور میں سے گزر رہا تھا۔ عائشہ نے سامنے آ کر سلام کیا اور ساتھ ہی شکریہ بھی ادا کیا۔

''اِس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

اُسے معدے کا السر تھا۔ تکلیف پرانی تھی، مگر اب زور پکڑ گئی تھی۔ لاچار بستر پر لیٹنا پڑا۔ تیمارداری کے لئے عملے نے عائشہ کی ڈیوٹی لگائی۔ جس نے اِس جانفشانی سے یہ فرض انجام دیا کہ صحت یاب ہو کر اُس نے بہت کچھ سوچا۔ فیصلہ کیا اور پھر اُس فیصلے کو عملی جامہ پہنا دیا۔

اُس نے تو اِس خبر کو شہرت دی نہ اسے چھپانے کی کوشش کی۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر پہلی بیوی کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ سن کر پہلے تو آنکھیں پھاڑیں اور چلا کر بولی۔

''عرفان منزل والوں نے یہ بے پر کی اُڑائی ہوگی۔'' وہ چچا سسر کے خاندان کو طعنوں کی سان پر چڑھاتے ہوئے پھنکاری۔

''ارے سدا کے میرے بیری، حسد میں بھنے ہوئے۔ اسی میں جل جل کر مر جائیں گے۔ ابھی کل رات رعنا کو باپ کا فون آیا تھا، تفصیلی باتیں کی تھی اُس نے۔''

پر جب ایک اور معتبر ذریعے نے جسے وہ اپنا ہمدرد اور غمگسار سمجھتی تھی اِس خبر

تصدیق کی تو وہ سٹپٹا گئی۔ اٹیچی کیس میں دو چار جوڑے کپڑوں میں ڈالے اور حیدر آباد پہنچ گئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو سوتی کپڑوں میں عام سی شکل کی تیس بتیس سال کی دبلی پتلی عورت پر نظر پڑی جو نوکر سے صفائی کروانے میں مصروف تھی۔ اپنی لانبی گردن کو اُس نے اور لمبا کیا۔ غرور کی بلندی سے اُسے یوں دیکھا جیسے وہ بہت حقیر سی ہو اور ترخ سے بولی۔

''کون ہو تم؟'' ایک حسین، تیز طرار اور فیشن ایبل عورت کو اپنے سامنے دیکھ کر اُس کا چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اُسے بیوی کی جو تفصیل سنائی ہوئی تھی وہ من وعن ویسی ہی تھی۔

''یہ تو میری ہڈی بوٹی کر دے گی۔''

اُس نے سہم کر سوچا اور لکنت زدہ آواز میں بولی۔

''میں ڈاکٹر صاحب کی کیئر ٹیکر ہوں۔''

اُس نے ایک لمبا ہنکارہ بھرا۔ جسم کو ڈھیلا چھوڑا۔ برآمدے میں بچھی ہوئی آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

''لوگ بھی کم بخت کیسے ظالم ہیں۔ دہلا ہی تو دیا۔ پاؤں کی مٹی ہی چھٹا دی۔''

''کب سے تم یہاں ہو؟''

ایسا تذلیل آمیز انداز تھا اُس کا جی چاہا یا تو چھری اُس کے سینے میں گھونپ دے یا خود کو ذبح کر ڈالے۔

''اے ہمیں خبر ہی کر دیتے۔''

کسی کام کے بہانے کھسک کر اُس نے سب سے پہلے خواب گاہ کو مقفل کیا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا کاسمیٹکس کا سامان، وارڈروب میں ٹنگے زنانہ کپڑے اُس کے جھوٹ کا پول کھول دیتے۔ وہ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے گھر میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی تھی۔ جب وہ

کچن میں کھانا پکا رہی تھی ۔اُس کا ذہن وسوسوں اور اندیشوں کی زد میں تھا۔

دو بجے ڈاکٹر گھر آیا۔عائشہ کو سامنے پا کر کمروں میں گھومتا پھرا۔ڈارئنگ روم میں صوفے پر پہلی بیوی کو سوتے دیکھا۔نوکر سے عائشہ کے متعلق پوچھا۔کچن میں آیا تو وہ پریشان افسردہ حال بیٹھی تھی۔

''بیوقوف، یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟ کپڑے تبدیل کرو اور کھانا لگاؤ۔''

اُس نے کچھ کہنے کو زبان کھولنا چاہی۔پر وہ عائشہ کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''گھبراؤ نہیں یہ میرا دردِ سر ہے۔''

وہ کھانے کے لئے بیٹھے تو ڈاکٹر ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔سفید بے داغ اِستری شدہ کپڑوں نے چہرے کی تازگی اور بشاشت کو بڑھا دیا تھا۔گلابی کپڑوں میں عائشہ البتہ پریشان سی نظر آ رہی تھی۔میز سلیقے سے سجی ہوئی تھی اور خوش ذائقہ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو کمرے میں رچی ہوئی تھی۔جب پردہ ہٹا کر بڑی بیگم کمرے میں داخل ہوئی۔ڈاکٹر عائشہ کی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم کچھ کھا نہیں رہی ہو۔''

''تم نے نوکروں کو اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں؟''

''نوکر کون نوکر؟''

اُس نے آنکھیں اوپر اٹھا کر تنی کھڑی عورت کو دیکھا جو اُس کی شریک حیات تھی پر اجنبی تھی۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔یہ عائشہ ہے، میری بیوی۔''

جیسے بم پھٹا گلے کی پوری قوت سے چلّا کر وہ بولی۔

''اور یہ حرافہ مجھے بتا رہی تھی کہ میں ڈاکٹر صاحب کی خادمہ ہوں۔''

''اے تم ڈوب نہ مرتے بیاہ رچاتے ہوئے۔غیرت نہ آئی، جوان اولاد کیا کہے گی؟''

جب تک بات کوسنوں تک رہی، ڈاکٹر خاموشی سے بیٹھا سنتا رہا اور بے نیازی سے کھانا کھاتا رہا۔جب عائشہ نے پلیٹ میں چاول ڈال کر اپنے آگے رکھے تو اس نے طیش کے عالم میں پلیٹ اُس کے آگے سے اُٹھا کر فرش پر پھینکی اور عائشہ کی طرف مارنے کو بڑھی۔ زندگی میں پہلی بار ڈاکٹر نے اُسے دھکیل کر پیچھے پھینکا اور بولا۔

''میں نے مرد ہو کر کبھی تم پر دست درازی نہیں کی اور تم عورت ہو کر ہاتھ اُٹھاتی ہو؟ گالی گلوچ سے تمہارا جی نہیں بھرا کیا؟ یہ سب کیوں ہوا؟ خود سے پوچھو۔دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانے کی بجائے اپنا محاسبہ کرو۔تم نے مجھے مٹی کا مادھو بنایا ہوا تھا اور میں اپنی شرافت کے ہاتھوں ایسا بنا رہا۔زندگی جیسی خوبصورت چیز کو کیسے تم نے میرے لئے جہنم بنا دیا کہ مجبوراً مجھے وہ کرنا پڑا جو میں کبھی نہیں چاہتا تھا۔میں حیران ہوں اِس عضوِ معطل کے لئے تمہاری اتنی محبت پھوٹ پڑی ہے؟''

وہ چیختی چلاتی رہی۔جاہل عورتوں کی طرح کوسنوں کا وِرد کرتی رہی اور پھر چلی گئی۔ڈیڑھ سال بعد وہ تبدیل ہو کر دوبارہ لاہور آ گیا۔ماں کے انتقال کے بعد سے آبائی گھر بند پڑا تھا۔اُس کو کھلوایا اور عائشہ کو اُس گھر میں رکھا۔

کبھی کبھی اُس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے وہ خود سے کہتا۔

''لوگ آخر کیوں نہیں سمجھتے ہیں کہ گھریلو زندگی کے تشنہ کام پہلو انسان کو اندرونی طور پر کتنا توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔میں بھی ایسا ہی ایک مضطرب اور شکستہ سی شخصیت تھا۔عائشہ نہ ملتی تو شاید کہیں مینٹل ہسپتال میں رُل رہا ہوتا۔شکر گزار ہوں اُس کا اور اُس کی رفاقت کا کہ

جس نے مجھے زندگی کی خوبصورتیوں سے لطف اندوز ہونے دیا یوں کہ میں خود کو زندہ اور تازہ دم محسوس کرتا ہوں۔ مرد سدا کب ظالم ہوتے ہیں۔ عورتیں بھی کبھی کبھی زندگیوں کو اجیرن اور روگ بنا دیتی ہیں۔

☆☆☆

اپنے لئے کیا جینا

وہ تو ڈری ہوئی تھیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ فزکس میں ایم ایس سی پاس نے انہیں دن میں تارے دکھا دیئے تھے۔ گو انہوں نے ناک فرش پر رگڑ کر سات لکیریں نہیں کھینچی تھیں پر بڑی باجی نے زبانی طور پر اپنے عہد کو مضبوط تر کر دیا تھا۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ سلمان کے لئے انہوں نے میٹرک یا زیادہ سے زیادہ ایف اے لڑکی کی کڑی شرط لگا دی تھی۔ دھان پان سی گوری چٹی اماں جی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولی تھیں۔

''اپنے ناموں کے ساتھ ایم اے، ایم ایس سی کے دُم چھلے لگا کر لڑکیاں مغرور ہو جاتی ہیں۔ بھرے گھروں میں ساس نندوں کے ساتھ رہنا انہیں محال ہوتا ہے۔ اپنے حقوق سے آگہی انہیں کچھ زیادہ آجاتی ہے اور شاید ایثار و قربانی دوسروں کے لئے مخصوص کر دیتی ہیں۔''

اب یہ دوسری بات تھی کہ بڑی باجی کے نام کے ساتھ ڈھیر ساری ڈگریاں تھیں۔ غلافی آنکھوں اور موٹے رسیلے ہونٹوں والوں بڑی باجی اور چھوئی موئی کے پھولوں جیسی

چھوٹی باجی دونوں ابھی تک کنواری تھیں۔ پر زمانہ اُن کی نیکی اور شرافت کا گواہ تھا۔ اتنا پڑھنے کے باوجود نہ طبیعت میں تکبر تھا اور نہ غرور۔ چھوٹی باجی سے چھوٹے دو بھائی عمران اور سلمان تھے اور آخر میں ثمینہ تھی۔

عمران نے بی ایس سی انجینئرنگ کیا تھا اور مغربی جرمنی چلا گیا تھا۔ گاہے بگاہے وہ بابو جی کو بہنوں کی شادی کے لئے لکھتا رہا۔ اللہ جانے بابو جی کا معیار کیا تھا کہ جو رشتہ آتا کسی نہ کسی بنا پر رد کر دیا جاتا۔ اماں جی بے چاری اللہ میاں کی گائے شوہر سے بڑا دبتی تھیں۔ کبھی زور سے یہ نہ کہہ سکیں کہ اللہ کے بندے اچھے بھلے رشتے ٹھکرائے جاتے ہو۔ آخر آسمان سے فرشتے اُتر کر تو بیٹیوں کو بیاہنے سے رہے۔ زمین کے باسیوں میں تو خامیاں ہوں گی ہی۔

وہ سروقد بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر ہی ہول کھاتیں اور ہونٹوں پر تالے ڈالے رکھتیں۔ بیٹیاں بھی ایسی ساؤ اور برخوردار کہ کبھی حرفِ شکایت لب پر نہ لائیں۔ برقعوں میں لپٹی کالجوں میں پڑھانے جاتیں اور چھٹی ہونے پر گھر آ کر اپنے اپنے کمروں میں گم ہو جاتیں۔ محلے میں چند ایک گھروں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس گھر میں کتنی لڑکیاں ہیں اور وہ کیسی ہیں؟ ہاں ایک بات ضرور ہوئی تھی کہ ثمینہ ایف اے کے بعد جب بی اے میں داخلہ لینے کے لئے مُصر ہوئی تو بڑی باجی نے نرمی سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''گڈو رانی! گھرداری کا شوق پیدا کرو۔ کھانے پکانے سیکھو۔ تمہیں ہم نے بیاہ دینا ہے۔''

اور انہی دنوں عمران آ گیا۔ وہ پہچاننے میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسا پھوٹ کر نکلا تھا کہ ماں بہنوں نے بلائیں لیں اور جی پھر بھی نہ بھرا۔ سب گھر والے بڑے کمرے میں بیٹھے۔ سرخ اور سیاہ پھولدار قالین پر چوکڑی مار کر بیٹھے ہوئے عمران نے کہا۔

''بابو جی آپ سے مجھے ایک شکایت ہے۔''

''وہ کیا؟''

بھاری بھرکم جسم والے بابو جی نے بیٹے کو محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

''آپ نے باجیوں کو ڈگریاں دلانے پر زور دیا مگر اُن کے گھر آباد کرنے کا نہ سوچا۔ مگر مجھے شادی فوری کرنی ہے۔ کسی پڑھی لکھی لڑکی کے ساتھ۔ میرے لئے لڑکی ڈھونڈ یئے اور میری شادی کر دیں!''

سلمان میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''تم تو تیز گام والا معاملہ چاہتے ہو۔ شادی آرام اور سکون سے ہو تو بہتر ہے۔ پرکھ ور کھ ٹھیک ہو گی۔''

''ارے چھوڑو یار! بابو جی زندگی بھر پرکھ کے پیچھے ہی تو پڑے رہے اور ہوا کچھ بھی نہ۔''

دونوں بڑی بہنوں نے پیار بھری خفگی سے اُسے دیکھا اور بولیں۔

''یورپ نے تمہیں بدتمیز اور منہ پھٹ بنا دیا ہے۔ تم ایسے تو نہ تھے!''

''ارے باجی!'' وہ بڑی بہن کے گھٹنوں پر جھکا اور اپنا سر اُن پر رکھتے ہوئے بولا۔

''خدا کی قسم ہم تو کنوئیں کے مینڈکوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ لوگ تو وہ ہیں۔ آزاد، خودمختار اور خودرائے والے۔''

بے شک اُس نے اظہار کھل کر کیا تھا۔ مگر ماں بہنوں نے اُسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ گھر میں ہنگامے جاگنے کی اُمید بر آ رہی تھی۔ خاموش اور سُونے سے گھر میں خوشیوں بھرے دن اور راتیں پیدا ہونے کی صورت نظر آئی تھی۔ وہ دلہن جرمن سے لے آتا تو وہ کیا کر لیتیں۔ پر اتنا پڑھ لکھ کر اُس نے ماں بہنوں کی مرضی سے گھر آباد کرنا چاہا۔ یہ

کس قدر پر مسرت بات تھی۔ بڑی باجی اور چھوٹی باجی کی سہیلیوں نے سنا تو بولیں۔

''چلو قفل تو ٹوٹا۔ بھاگوان شادی ہو۔ وہ سہرا باندھ کر ڈولی لائے اور کچھ سہرے باندھ کر ڈولیاں لے جائیں۔''

سٹاف روم میں بڑی باجی کی سہیلیوں نے کورس کی شکل میں ''آمین'' کہا۔

لڑکی ڈھونڈنے کا معاملہ خاصہ کٹھن تھا۔ موزوں گھرانہ، اچھی شکل صورت، قد کاٹھ، تعلیم۔ دونوں باجیاں جنہوں نے کبھی ایرے غیرے گھروں میں جھانکا نہیں تھا اب مجبور تھیں۔ جہاں کسی نے بتایا جا دھمکتیں۔ بارے خدا خدا کر کے لڑکی پسند آ گئی۔ دھوم دھام سے بارات چڑھی اور بڑے ارمانوں سے دلہن گھر آ گئی۔ عمران نے دیکھا تو ماں بہنوں کی پسند کو سراہا۔

''سناؤ پھر ہماری چوائس اچھی لگی؟'' چھوٹی باجی نے بھائی سے پوچھا اور بڑی باجی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے عمران نے کہا۔

''نسوانی حسن کے لئے جرمنی خاصا مشہور ہے۔ مگر جو گیمر ایسی شادی میں ہے وہ وہاں کہاں؟''

مگر ایک بات ضرور تھی۔ یہ گھرانہ اپنی روایات کے گرد ہی گھومتا تھا۔ یہاں برقعے کی پابندی تھی۔ گھر پر بڑی باجی کا حکم چلتا تھا۔ یہ لوگ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ماڈرن نہ تھے اور دلہن قدرے ماڈرن گھرانے کی تھی۔

پھر بھی گاڑی بطریق احسن چلتی رہی۔ نعیمہ مقامی کالج میں فزکس کی لیکچرر تھی۔ شادی سے پہلے برقع نہیں اوڑھتی تھی۔ مگر بڑی باجی نے نکاح سے قبل ہی بات صاف کر دی تھی۔

اصل میں بابو جی کی بیٹیوں اور بیوی کو لوگوں نے ہمیشہ پردے میں ہی دیکھا۔

اب بہو کھلے منہ باہر جائے تو اچھا معلوم نہیں ہوگا۔

چائے کی چیزیں ٹرالی پر سجی ہوئی تھیں اور نعیمہ پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔ بڑے صوفے پر کشن سے ٹیک لگائے پروفیسر بلقیس جہاں کی بات سن کر اُس کا ہاتھ لرز سا گیا۔ ماں نے بیٹی کو اور بیٹی نے ماں کو چور نگاہوں سے دیکھا۔ مگر ماں زمانہ شناس تھی۔ جانتی تھی کہ اچھے رشتوں کا قحط ہے۔ شریف گھرانے مقدر سے ملتے ہیں۔ اِسی لئے بیٹی کے چہرے پر پھیلی ناگواری کے خفیف سے سائے متاثر نہ کر سکے۔ سنجیدگی سے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے بولی۔

''ہم نے تو اسے آپ کی جھولی میں ڈال دیا ہے جو سلوک آپ چاہیں اس سے کریں ہمارا ذمہ ختم!''

نعیمہ بعد میں ماں سے جز بز ہوئی۔

''یہاں تو الٹی گنگا بہنے لگی ہے۔ لوگ شادیوں کے بعد پردہ ترک کر دیتے ہیں اور یہاں مجھے برقعے میں لادا جا رہا ہے۔''

ماں نے بیٹی کی دلدہی کی۔

''خوامخواہ چلاتی ہو۔ تم نے یہاں کوئی بیٹھے رہنا ہے۔ سال دو سال کی بات ہے۔ اتنے اچھے رشتے کے لئے اتنی سی سزا کاٹ لو۔''

اور قہر درویش بر جان درویش کے مصداق نعیمہ یہ سزا بھگت رہی تھی۔ گھر والے اُس کا بہت خیال رکھتے۔ کھانا اُس کی مرضی سے پکتا۔ وہ کالج سے آتی تو اُس کا وہ کمرہ جسے وہ ابتر حالت میں بھی چھوڑ جاتی، نفاست سے آراستہ ہوتا۔ ثمینہ اُس کے گھر میں پہننے والے کپڑوں کا بھی انتخاب کر کے وارڈ روب میں لٹکاتی۔ لیکن نعیمہ پھر بھی خوش نہ تھی۔ اُس کے میکے سے اُسکے ممیرے چچیرے بھائی آتے۔ اُس کا جی چاہتا وہ اُس کے سسرالی گھر میں یوں

ہی آ کر گھل مل کر سب کے ساتھ بیٹھیں جیسے اُس کے میکے میں آ کر بیٹھتے اور گپیں لگاتے تھے۔مگر یہاں ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔وہ اکثر عمران سے کہتی۔

''کتنی تنگ نظر ہیں تمہاری بہنیں۔''

''بھئی ہمیں اچھی لگتی ہیں وہ جیسی بھی ہیں۔مصنوعی شوشا نہیں ہے یہاں۔خلوص اور پیار بھرے دل ہیں اُن کے۔''

گیارہ ماہ بعد اُس نے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔گھر والے تو نہال ہو گئے۔زمانہ گزر گیا تھا کوئی چھوٹا بچہ دیکھے ہوئے۔وہ سب مل کر بچوں کی کوٹ کے گرد کھڑے ہو جاتے۔اُن کی معصوم حرکتوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔بڑی باجی جی کھول کر ہنستی۔چھوٹی باجی قہقہے لگاتی۔بچے گھر میں کیا آئے تھے در و دیوار سے قہقہے ابلنے لگے تھے۔بڑے کا نام (جو صرف پینتیس منٹ بڑا تھا) شہریار اور چھوٹے کا نام احمد یار رکھا گیا۔

بابو جی اکثر بڑی باجی سے کہتے۔

''شہریار کو تو تمہارا بیٹا بنا دیتے ہیں۔''

''ہاں میں اِسے خوب لکھاؤں پڑھاؤں گی۔یہ جب سنیئر کیمبرج کر لے گا تو اسے میں گاڑی خرید دوں گی۔یہ مجھے کالج چھوڑ کر آیا کرے گا۔''

اور اس کے ساتھ ہی وہ قالین پر لیٹے شہریار کی طرف دیکھتے ہوئے کہتیں۔

''کیوں شہری میرا بیٹا بنو گے نا۔''

اور گول مٹول شہریار قلقاری مار کر ہنستا۔وہ خود بھی ہنستے ہوئے بھاوج کی طرف دیکھتے ہوئے کہتیں۔

''دیکھو نا تو میری خواہش کا خیر مقدم کر رہا ہے۔''

اور نعیمہ بھی میٹھی سی ہنسی ہنس دیتی۔پر ایک دن وہ عمران کے سامنے پھٹ پڑی۔

''یہ جو چاہتی ہیں وہ نہیں ہوگا۔میری ماں کو اُس کی پھوپھی نے پالا تھا۔اُس کے دل میں بس پھوپھی کی محبت ہی رہی۔ماں سے اُسے کبھی وہ لگاؤ اور پیار نہ ہو سکا جو اولاد کی فطرت میں ہوتا ہے۔حتیٰ کہ جب وہ مریں تو اُس کی آنکھوں سے دو آنسو بھی نہ نکل سکے۔''

عمران اُن دنوں واپس جرمنی جانے کی تیاریوں میں اُلجھا ہوا تھا۔اُس وقت بھی وہ کچھ اِسی اُدھیڑ بن میں تھا کسی قدر رُکھائی سے بولا۔

''میرا خیال ہے تمہاری ماں بڑی ہی سنگدل عورت ہے۔ذرا سا بھی ناطہ ہو تو مرنے پر دو آنسو تو نکل ہی آتے ہیں۔''

نعیمہ شوہر کی اس بات پر بڑی بپھری۔مگر بولی کچھ نہ۔عمران جب غصے میں آتا تھا تو لحاظ نام کی شے سے اُس کا واسطہ نہ رہتا تھا۔

عمران کے جانے کے بعد نعیمہ جلد ہی سسرال سے میکے آ گئی۔پابندیوں سے اُسکا دم گھٹتا تھا۔وہ گھر جہاں قہقہوں کا شور گونجنے لگا تھا۔اب پھر سناٹوں کی زد میں آ گیا تھا۔عمران نے نعیمہ کو جرمنی آنے کے لئے لکھا مگر اِس شرط کے ساتھ کہ وہ ایک بیٹے کو اُس کے گھر چھوڑ آئے۔یہ شرط نعیمہ کو منظور نہ تھی۔اُسے نے شوہر کو لکھ بھیجا۔

''میں نے شرائط کے ساتھ تمہارے ساتھ شادی نہیں کی تھی۔میرے اپنے خواب تھے جن میں شوہر اور بچے تھے۔اپنے جگر کے ٹکڑوں کا بٹوارہ مرے گمان میں نہیں تھا۔لہٰذا جرمنی آنے اور تمہارے ساتھ رہنے کو خدا حافظ۔جب تمہاری بہنیں کہیں ٹھکانے لگ جائیں اور تمہیں بیوی بچوں کی طلب ہو تو چلے آنا۔میرے دل اور گھر کے دروازے کھلے ہوں گے(واضح رہے کہ میں نے کرایہ کا گھر لے لیا ہے)۔''

یہ بڑا سنگین موڑ تھا۔اُسی موڑ پر بڑی باجی نے پکا فیصلہ کیا کہ وہ سلمان کے لئے میٹرک سے زیادہ پڑھی لکھی ہرگز نہیں لائیں گی۔

مگر شدنی تو ہو کر رہی ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی لڑکی کے لئے سلمان کون سا رضامند تھا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑا؟ سمیرا اشرف اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی۔

سلمان میڈیکل کے لئے نشتر میڈیکل کالج ملتان میں منتخب ہوا تھا۔ تین سال تک وہاں رہا۔ پھر باپ کی بے شمار کوششوں کے بعد کے ای میڈیکل کالج میں آیا۔ یہیں سے وہ سمیرا اشرف سے ملا۔

سمیرا ڈاکٹر کی پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ اُس کا باپ اشرف امریکہ میں ایک ممتاز پاکستانی ڈاکٹر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ وہیں سے وہ سعودی عرب کے شاہی خاندان کا ڈاکٹر مقرر رہوا۔ سعودیہ کے دارلخلافہ ریاض میں منتقل ہوا۔ بے حد وحساب پیسے والے باپ کی اولاد تھی۔ سینٹ لوئس سٹیٹ سے سینئر کیمبرج کر کے آئی تھی اور اب کنگ ایڈورڈ کی سٹوڈنٹ تھی۔ اپنی ذاتی گاڑی رکھتی تھی۔ پانچ دس چھٹیوں میں سعودیہ یوں جاتی جیسے کوجرانوالہ یا شیخوپورہ کی لڑکیاں اپنے گھر جاتی ہوں۔

ایسٹ سرجیکل وارڈ میں پروفیسر خواجہ صادق کی کلاس تھی۔ سلمان کو ملتان سے آئے ابھی تین دن ہوئے تھے۔ کلاس کے بعد اتفاقاً ان دونوں کی ڈیوٹی کمرے کے آخری کونے میں بیڈ پر لیٹے اُنیس نمبر مریض پر لگی۔ دونوں اُس کے پاس گئے۔ مریض سرخ کمبل میں لیٹا تھا۔ اُس کا ہسٹری چارٹ دونوں نے دیکھنا شروع کیا۔ مریض کو ہفتہ میں تین دن بخار آتا تھا اور دو دن بعد اُتر جاتا تھا۔ بخار چڑھنے سے پہلے اُس کے جسم پر چھوٹی چھوٹی گلٹیاں سی نکلتی تھیں جو تین چار دن بعد خود بخود ختم ہو جاتی تھیں۔ اُس کا جگر ٹھیک تھا۔ معدہ ٹھیک کام کرتا تھا۔ ٹی بی وغیرہ کی کوئی علامت نہیں تھی۔ گلٹیوں کو چیر کر اُس کا مواد پتھیالوجسٹ دیکھ چکے تھے۔ رپورٹ کے مطابق ان کا بخار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

دونوں رپورٹس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ پھر انہوں نے مریض کو چیک کرنا چاہا۔

اپنے منہ سے کمبل پرے کر کے وہ اُٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھ ناک اور ماتھے پر جوڑ دیئے۔

''معاف کرو بابا۔'' کی کھلی اور واضح علامت تھی۔ سلمان قدرے مسکراتے ہوئے اُس سے مخاطب ہوا۔

''باباجی گھبرایئے نہیں!''

مریض ہکلایا جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس پر فالج کا اٹیک ہو چکا ہے۔ یہ بات ہسٹری میں نہیں لکھی گئی تھی۔ اور اب مریض غرایا۔ دونوں کو کھسک جانے میں ہی عافیت نظر آئی۔ وہ باہر آ گئے۔ لمبے چوڑے اونچی چھتوں والے برآمدے میں زرد روشنی کے بلب جل رہے تھے۔ دسمبر کی خنکی، ابر آلود موسم اور خنک ہوائیں۔ برآمدے میں چلتے ہوئے سمیرا بولی۔

''اللہ کیسی ہڈیوں میں اُتر جانے والی ٹھنڈ ہے۔ میڈیکل بھی فضول لائن ہے۔''

سلمان نے کوئی جواب نہیں دیا بس چپ چاپ قدم اُٹھاتا رہا۔

اور ابھی سمیرا یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اُس سے کینٹین پر چلنے اور چائے پینے کا ایک کپ پینے کا کہے۔ جب وہ اُس راستے سے بائیں طرف بغیر ایک لفظ بولے مڑ گیا جو باہر جاتا تھا۔ باہر تو اُسے بھی جانا تھا اور وہ بھی اُسی راستے پر چل رہی تھی۔ فرق صرف راستوں کا تھا۔ جو دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ سیاہ آہنی گیٹ پر دربان اکڑ کر کھڑا تھا۔ لوہے کی سلاخوں کے ساتھ دو مرد چمٹے ہوئے تھے اور دربان سے اندر آنے کے لئے گھگھیا رہے تھے۔ وہ آگے بڑھی۔ دربان نے ادب سے گیٹ کو خفیف سا دھکا دیا اور اُسے باہر جانے کا راستہ دیا اور جب وہ راہداری پار کر کے کھلی سڑک پر آئی اُس نے سلمان کو شینڈ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے دیکھا۔

یہ پہلا موقع تھا۔ اُس نے غور سے اُس نوجوان کو دیکھا۔ اُس کا اونچا لمبا قد مثالی

روشنی میں نمایاں تھا۔اُسے نظر انداز کئے جانے کا شدید احساس تھا ورنہ تو اس کی معیت میں چلنا بھی لڑکے فخر سمجھتے تھے۔

اور اگلے دن کلاس میں اُس نے گہرے نسواری شیڈ کے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے سلمان کو بغور دیکھا۔کوئی یوسف تو نہیں تھا۔ناک نقشہ درست تھا مگر چہرے پر معصومیت اور ڈیل ڈول میں مردانہ پن نمایاں تھا۔فیشن زدہ نوجوانوں کے برعکس سر کے بال اور قلمیں نہایت مناسب تھیں۔شلوار قمیض پر گرم جرسی تھی۔

کافی دن گزر گئے۔یہ جنوری کا ایک نکھرا ہوا دن تھا۔سفید اور خوش گوار سا دن دھوپ کھلی ہوئی تھی Deomonstration کی کلاس کے لئے لڑکے لڑکیاں کمرے میں آ چکے تھے۔پروفیسر لیکچر دے رہا تھا۔جب سلمان کمرے میں آیا یہ بالکل اتفاق تھا کہ سمیرا گزرگاہ کے قریب بیٹھی تھی اور اُس کے پاس والی کرسی خالی تھی۔سلمان نے اک ذرا رُک کر یہ سب دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔پیچھے جا کر ٹوٹی کرسی پر ڈیرا جما لیا۔سمیرا کو بہت غصہ آیا۔ چھوٹی سی ایک چٹ پر اُس نے لکھا۔

''نرے اُلو ہو۔یہاں بیٹھ جاتے تو میں نے کیا تمہارا کچھ اُتار لینا تھا۔ٹوٹی کرسی تمہیں زمین بوس بھی کر سکتی ہے۔''

اُس نے چٹ کی گولی سے بنائی اور موقع دیکھ کر تاک کر سلیمان کی سیٹ پر ماری۔ بھونچکا سا ہو کر اُس نے گولی کو اُٹھا کر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔سمیرا متوقع تھی کہ اس چٹ کا ضرور کوئی جواب ملے گا۔مگر وہاں وہی شانِ بے نیازی تھی۔

انسانی فطرت ہے کہ بے اعتنائی اور نظر اندازی اُسے گوارہ نہیں۔سمیرا جیسی لاڈلی اور امیر لڑکی کے معاملے میں یہ اضطراری حس کچھ شدت اختیار کر لیتی تھی۔جو چاہا وہ سدا پایا والا اُس کا تو معاملہ تھا۔کوئی ٹکر باز اُسے ملا ہی نہیں۔اور اب یہ سلمان نامی عام سا لڑکا اُس

کے لئے کھلا چیلنج بنتا جا رہا تھا۔

پارکنگ ایریا میں اُس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ اُس کی طرف جا رہی تھی۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ وہ آؤٹ ڈور وارڈ سے ابھی فارغ ہوئی تھی۔ مارچ کی یہ رات خوش گوار تھی۔ ہوا میں لطیف خنکی رچی ہوئی تھی۔

سلمان نے دیکھا سلمان اپنے ہنڈا کو سٹارٹ کرنے والا ہے۔ کافی دنوں بعد وہ اُسے آج نظر آیا تھا۔ وہ ہنڈا اسٹارٹ کر چکا تھا جب سمیرا جست لگا کر اُس کے پیچھے جا بیٹھی۔ ہینڈلوں پر جمے اپنے ہاتھوں میں اُس نے لرزش محسوس کی۔ گردن کو پیچھے موڑ کر دیکھا اور تعجب بھری آواز میں بولا۔

''ارے آپ کیسے؟''

وہ اُس کی شوخیوں، ناز و انداز اور امارت وغیرہ کے بہت سے قصے سن چکا تھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اُس نے سیٹ پر بدستور بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

''گھر۔'' سلمان کا مختصر سا جواب تھا۔

''چلئے میں بھی وہیں چلتی ہوں۔'' وہ سکون سے بولی۔

''آپ میرے گھر کیسے جا سکتی ہیں میرا مطلب ۔۔۔؟''

سلمان عجیب شش و پنج میں تھا۔ اپنا مافی الضمیر ٹھیک طرح ادا نہ کر پا رہا تھا۔

''کیوں؟ کیا وہاں انسان نہیں بستے؟''

''بستے تو ہیں لیکن ۔۔۔''

دو دونوں پاؤں زمین پر رکھے، دونوں ہاتھ ہینڈلوں پر جمائے سخت الجھن میں گرفتار یہ سوچ رہا تھا کہ اس بے وقوف لڑکی کو کیسے سمجھائے کہ اُس کے گھر والے اُس کی یہ حرکت قطعاً پسند نہیں کریں گے؟ گھر والے کیا وہ خود بھی پسند نہیں کرتا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں ۔میں ہوم سکنس کا شکار ہو رہی ہوں ۔خالص گھریلو ماحول میں تھوڑا سا وقت گزارنا چاہتی ہوں ۔''

اُس کے سامنے تارکول کی سیاہ سڑک پھیلی ہوئی تھی ۔پیچھے ہسپتال کی وسیع وعریض عمارت کا اگلا حصہ نظر آ رہا تھا۔دائیں طرف بے شمار سائیکلیں ،ہنڈا اور گاڑیاں کھڑی تھیں ۔ کچھ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی ۔

''لیکن گھر والے تو اِس وقت سو چکے ہوں گے ۔''

''سیدھی طرح چلو ۔ابھی صرف نو بجے ہیں ۔''

اب وہ موٹر سائیکل سے اُتر کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا ۔دونوں ہینڈلوں سے اُس نے ہنڈا کو پکڑا ہوا تھا ۔

''اصل میں سمیرا اشرف تم نے مجھے انتہائی غلط انسان سمجھا ہے ۔میں اس لب ولہجہ میں باتیں سننے کا قطعی عادی نہیں ۔تمہاری امارت اور خوبصورتی دوسرے لوگوں کو تو اپیل کر سکتی ہے ،مگر مجھے نہیں ۔ مجھے عورت ذات کے ان اوچھے اور گھٹیا ہتھکنڈوں سے شدید نفرت ہے ۔تم نے مجھے کوئی زرخرید غلام سمجھا ہے جسے یوں حکم دے رہی ہو ۔میرے گھر والے عشاء کی نماز کے بعد سو جاتے ہیں ۔کیونکہ اُنہیں صبح کی نماز کے لئے اُٹھنا ہوتا ہے ۔میں اُن سے تمہارے بارے میں کیا کہوں گا؟''

اور بغیر کوئی لفظ کہے وہ موٹر سائیکل سے اُتر گئی ۔چند لمحوں تک سلمان بے حس وحرکت وہاں کھڑا رہا اور پھر اپنے راستے پر بڑھ گیا ۔ساری رات وہ سو نہ سکا ۔سمیرا اشرف کی آنکھوں میں چمکتے آنسو اُس نے دیکھ لئے تھے ۔کسی خوبصورت نسوانی آنکھ میں آنسو دیکھنے کا یہ اُس کے لئے پہلا موقع تھا ۔لیکن معذرت کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور نہ ہی وہ کرنا چاہتا تھا ۔

وہ امریکا کی پیدائش تھی۔کولوریڈو سٹیٹ لوئس کے بہترین گرامر سکولوں کی پڑھی لکھی تھی۔ بڑے باپ کی چہیتی بیٹی تھی۔اُس کے لئے ایسی باتیں معمولی تھیں۔مگر ایسا دندان شکن جواب، وہ اِس کی کب عادی تھی۔پر غرانے اور چیخنے کی بجائے وہ بالکل ساکت سی ہوگئی تھی۔

سلمان جس ماحول کا پروردہ تھا اُس میں ڈھکی چھپی نسائیت کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اُسے عورت ذات کی اِتنی بے باکی قطعاً پسند نہ تھی۔سمیرا اشرف کی عشوہ طرازیوں کے قصے تو خاصے مشہور تھے۔

دونوں کی طرف مکمل خاموشی تھی۔اُس رات کے واقعے کو کسی نے بھی نہیں دہرایا۔فورتھ ائیر سے وہ فائنل میں آ گئے اور اب فائنل بھی اختتام پر تھا۔سلمان بہت ذہین اور لائق طالب علم ثابت ہوا۔سبھی ہونہار لڑکوں کو اُس نے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

پھر یہ خبر کلاس میں کسی نے بتائی تھی کہ سلمان شدید بیمار ہے۔اُسے یرقان ہوگیا ہے۔وہ پرائیوٹ وارڈ کے فلاں نمبر کمرے میں داخل ہے۔

وہ بھی کلاس میں تھی۔پشت پر بکھرے گھنے بالوں کو اُس نے بائیں ہاتھ سے سمیٹا اور آنکھیں جھپکائیں۔یہ تو ایک خبر تھی۔دوسری خبر کلاس ختم ہونے کے بعد جب وہ باہر نکلے اُن کی منتظر تھی یہ کہ اُسے تیسرے درجے کا یرقان ہے۔سارا خون تبدیل نہ ہوا تو اُس کا بچنا محال ہے۔

اور جیسے سَن سے کوئی گولی اُس کے سینے پر آ لگی۔لڑکے لڑکیاں اُس کے کمرے کی طرف بھاگے۔زردیوں کے پیراہن سارے جسم پر پہنے وہ لیٹا ہوا تھا۔بوڑھی ماں اور بہنیں پاس تھیں۔

وہ کتابیں سینے سے چمٹائے اُس کی پائینتی کے پاس کھڑی تھی۔سلمان نے اُسے

دیکھا تھا۔ایک پل کے لئے نگاہوں کا تصادم ہوا پر اگلے لمحے سلمان نے رُخ بدل لیا۔

کوئی مصیبت تھی اُس کے گروپ کے نمبر کا خون نہیں مل رہا تھا۔بھاگ دوڑ جاری تھی۔کالج کے تقریباً سبھی لڑکے اور لڑکیوں نے خون ٹیسٹ کروایا اور سمیرا اشرف کا نمبر ملا۔

اب وہ مُصر تھی کہ زیادہ سے زیادہ خون لے لیا جائے۔دو جگہ سے بندوبست ہوا۔یہ سب تو ہوا پر وہ اُس کی عیادت کے لئے ایک بار نہ گئی۔اور جب ماہ بعد وہ تندرست ہو کر کالج میں آیا اُس کے رخساروں پر لالی تھی۔رنگت چمک رہی تھی۔یار دوستوں نے جہاں مبارک باد دی وہاں یہ بھی کہا۔

''سمیرا اشرف کا خون رگوں میں دوڑ رہا ہے کوئی مذاق ہے؟ رخسار کیوں نہ دمکیں اور رنگت کیوں نہ چمکے۔''

اور سمیرا اشرف کمزور اور پیلی پڑی تھی۔اُس نے دیکھا اور نگاہوں کو جھکا لیا۔

بہت دنوں بعد دونوں کا ٹکراؤ سیڑھیوں پر ہوا۔سلمان اوپر جا رہا تھا اور وہ نیچے آ رہی تھی۔ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں ٹھٹکے۔

''کچھ کہنا ہے سمیرا مجھے تم سے!''

''میں سننے کے لئے تیار نہیں!'' اُس نے رُکھائی سے کہا اور اونچی ایڑی کا جوتا کھٹکھٹاتی نیچے اُتر گئی۔

وہ پنکھے کو فل سپیڈ پر چھوڑ کر بستر پر آ لیٹی تھی۔باہر بہت گرمی تھی۔اتنی گرمی کی اب وہ کچھ کچھ عادی ہو گئی تھی۔دروازے پر دستک ہوئی۔اُٹھ کر کھولا تو سامنے برقع پوش عورت کھڑی تھی۔

''میں سلمان کی بڑی بہن ہوں۔'' نووارد نے فوراً ہی اپنا تعارف کروایا۔

''تو آیئے بیٹھیے!'' سمیرا نے مسکراتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

''اصل میں وہ ینگ روم میں بابو جی بیٹھے ہیں۔''

بابو جی نے اُسکے چمکدار گھنے سیاہ بالوں پر محبت بھرا بوسہ دیا اور اُس کا یہ ادا کیا اور اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔اُس نے معذرت چاہی مگر وہ مانے ہی نہ۔

اگلے دن بابو جی ہی اُسے لینے آ گئے۔یہ ایک دو منزلہ کھلا سا گھر تھا۔صاف ستھرا، آراستہ پیراستہ۔متوسط طبقے کا نمائندہ۔سلمان کہیں نہیں تھا۔گھر کے لوگ اتنے مخلص تھے کہ اُن کے درمیان بیٹھ کر سمیرا بہت خوشی ہوئی۔کھانا قالین پر دستر خوان بچھا کر کھایا گیا اور جب وہ سب سبز قہوہ پی رہے تھے وہ گھر میں داخل ہوا اور اُن سب کے درمیان سمیرا کو دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔

''اِسے اتنی بار کہا کہ تمہیں ہمارا پیغام دے دے مگر یہ گدھا غالباً شرماتا تھا۔''

بابو جی نے بیٹے کو دیکھ کر کہا۔

وہ وہیں سب کے پاس بیٹھ گیا۔وہیں اُس کے لئے کھانا آ گیا۔یہ تصنع سے پاک خالص گھریلو ماحول تھا جس کی لذت اور چاشنی سے سمیرا واقف نہ تھی۔اور بڑی باجی اور بابو جی نے یہ ڈیوٹی سلمان کی لگائی کہ وہ اُسے چھوڑ آئے۔چلتے وقت گھر کے سب لوگوں نے اُسے دوبارہ آنے کی تاکید کی۔

اور اب سلمان اُسے ہوٹل چھوڑنے کی بجائے باغ جناح لے آیا۔سنگی بینچ پر بیٹھتے ہوئے سمیرا نے کہا۔

''یہاں کس لئے لائے ہو؟''

وہ اُس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔گھاس کے قطعے بلبوں کی روشنی میں سیاہی مائل نظر آ رہے تھے۔

''یقیناً تمہارا شکریہ ادا نہیں کروں گا۔'' اُس نے سگریٹ جلائی اور تلی بینچ کے

قریب کیاری میں پھینکتے ہوئے بولا۔

''معاف کرنا مجھے خیال نہیں رہا۔تم سے سگریٹ کے لئے اجازت لینا تھی۔''

''اِس کی ضرورت بھی نہیں!''

دونوں خاموش تھے۔عورتوں اور لڑکیوں کے غول اب واپس جا رہے تھے۔

''صاف اور کھرا آدمی ہوں۔لمبے چوڑے چکروں کی بجائے کھل کر کہنا چاہتا ہوں کہ تم سے شادی کرنے کی میری دلی خواہش ہے۔''

''کب سے یہ خواہش ہے؟'' اپنے اعصاب پر قابو کے باوجود اُس کی آواز میں لرزش تھی۔

''مدت سے۔'' سلمان نے دوسرا سگریٹ جلایا۔

''تو پھر اتنا پاکھنڈ کیوں پھیلایا؟''

''اچھی ضرور لگتی تھی مگر عادتیں بگڑی ہوئی تھیں اور۔۔۔''

''عادتیں تو اب بھی وہی ہیں۔''

''نہیں کچھ تبدیلی ہے اِن میں۔باقی کو بدل لوں گا۔''

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اپنے بارے میں اِتنے حسن ظن سے کام نہیں لیتے۔میں انکار کر سکتی ہوں۔''

''ہرگز نہیں۔'' وہ بھی عین اُس کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔اُس کے چہرے کو اُس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔اُس کی موٹی اور شفاف آنکھوں کی چمک بڑی نمایاں تھی۔جن میں وہ جھانکا اور خوابناک سی آواز میں بولا۔

''کہو تمہیں مجھ سے پیار نہیں؟''

خاموشی سے دو آنسو اُس کے رخساروں پر بہہ گئے۔جنہیں سلمان نے اپنے

ہاتھوں سے صاف کیا اور اُسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر بولا۔

''آداب چلیں!''

اور پھر۔۔۔بڑی باجی کے گھٹنوں پر سر رکھتے ہوئے سلمان بولا۔

''باجی جان! متفق تو میں بھی آپ سے تھا پر معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے۔میری پسند کو اب ترجیح دیجیے۔''

اور باجی جان دل کے معاملات میں بھلا دخل دینے والی کون تھیں؟ دبی زبان سے اتنا ضرور کہا۔

''معلوم نہیں ساتھ رہ بھی سکے گی یا نہیں۔کافی ماڈرن لگتی ہے۔''

''میں نے صرف یہ دیکھا ہے کہ اُس کے سینے میں ایثار بھرا دل ہے۔ایسا انسان زندگی کے کسی بھی مرحلے پر پریشانیاں نہیں پیدا کرے گا۔''

اور اِس بار سمیرا اشرف جب سعودیہ گئی تو اُس نے باپ سے بات کرنی ضروری سمجھی۔وہ لوگ کھانا کھا کر نشست گاہ میں آئے اور نوکر سبز قہوہ کی پیالیاں اُنہیں تھمانے لگا۔ آدھی پیالی خالی کرنے کے بعد ڈاکٹر اشرف نے کہا۔

''متوسط گھروں کے لڑکے اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔لڑکا ہونہار ہے۔بقول تمہارے اچھی عادتوں کا مالک ہے تو ٹھیک ہے۔''

اور دونوں میاں بیوی پندرہ دن بعد بیٹی کے ساتھ ہی پاکستان آئے۔سلمان کے گھر والوں سے ملنے گئے۔لڑکا اور اُس کا گھرانا دونوں اُنہیں اچھے لگے۔وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے نکاح کی بات کی اور ہوٹل چلے آئے۔

البتہ ڈاکٹر اشرف نے بیٹی سے یہ کہنا شاید بہت ضروری خیال کیا۔

''لوگ تو مجھے مخلص لگے ہیں۔مگر مذہبی ہیں۔ویسے میں بھی بڑے غریب اور

مذہبی گھر کا بیٹا تھا۔تمہاری ماں سے میری شادی بھی بس کچھ ایسے ہی ہوئی ۔لیکن اپنی امارت اور روشن خیالی کے باوجود اُس نے میرے گھر والوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا برتاؤ کیا۔یہی طرز عامل میں تم سے بھی چاہوں گا۔''

نکاح سادگی سے ہوا۔پچاس ہزار روپیہ ڈاکٹر اشرف نے لڑکے کی بہنوں، ماں باپ کے کپڑے لتے کے لئے دیا اور دو لاکھ کا بیٹی کو چیک دیا۔اور سمیرا اشرف کو سمیرا سلمان بنا کر وہ اُسی شام واپس سعودیہ کے لئے پرواز کر گئے۔

کالج کے لوگوں نے حیرت سے خبر سنی۔بہت سے اُس پر آس لگائے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے تبصرہ کیا۔

''شادی بہت کم دن چلے گی۔''

مگر یہ لوگوں کا خام خیال تھا۔وہ سکون اور آرام سے تھی۔سلمان بہت پیار کرنے والا اور اصول پرست شوہر ثابت ہوا۔

دونوں اُن دنوں ہاؤس جاب پر تھے۔کھانا سب گھر والے اکٹھے کھاتے۔شام کی چائے بالعموم وہ بناتی اور سر و بھی خود کرتی۔گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنے میں اُسے لطف آتا۔زندگی کا یہ انداز اُسکے لئے یکسر نیا بھی تھا اور دلچسپ بھی۔

نو ماہ بعد ہی وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی اور گھر میں پہلے کی طرح ایک بار پھر قہقہوں کا راج ہو گیا۔اب پھر وہ سارے بچے کی کوٹ کے گرد کھڑے ہو جاتے اور اُس سے باتیں کرتے۔کالج سے تھکی ہاری آتیں تو بچے پر نظر پڑتے ہی ساری تھکن جیسے پل میں غائب ہو جاتی۔

سلمان کو امریکہ کے لئے فل برائٹ سکالرشپ مل گیا۔چانس ایسا نہ تھا کہ اُسے ضائع کیا جاتا۔دونوں میاں بیوں میں طے ہو گیا کہ سلمان کے جانے کے بعد وہ بھی امریکا

آجائے گی۔اور وہاں گائنی میں سپیشلائزیشن کر لے گی۔وطن واپس آ کر اپنا ہسپتال بنایا جائے گا۔

گھر والے اُن کے تابندہ مستقبل سے خوش ضرور تھے مگر اُنہیں پر رونق گھر کو ویران گھر سے بدل جانے کا ملال بھی تھا۔خاص طور پر اِس ڈر سے کہ ارسلان بھی چلا جائے گا۔

وہ پہلے کے مارگزیدہ تھے۔بچے کے لئے اپنی محبت کے بے پایاں برملا اظہار سے وہ خائف تھے کہ کہیں سمیرا نعیمہ کی طرح بدگمان نہ ہو جائے۔

سلمان کے جانے کے بعد سمیرا اُن کے ساتھ ویسے ہی رہتی رہی۔ارسلان اب قدم اُٹھانے لگا تھا۔بڑی باجی اور چھوٹی باجی دونوں تالیاں بجاتیں جب وہ پلنگ کے سہارے قدم اُٹھاتا۔

آٹھ ماہ بعد جب سمیرا کے لئے ویزہ آیا تو گھر والے یوں خاموش ہو گئے جیسے مرگ ہوگئی۔سمیرا باہر سے آئی تو بڑی باجی نے جبراً ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو امریکہ سے کاغذات آ گئے ہیں۔''

''چلیے اچھا ہوا۔'' لاپروائی سے کہتی ہوئی وہ کھانے کے لئے چلی گئی اور چھوٹی باجی نے آہستگی سے کہا۔

''بھئی اُس کے سامنے تو نئی دنیا ہے۔اُسے تو خوش ہونا ہی ہے۔''

اور چند دنوں بعد جب وہ کاغذات کی تکمیل کے لئے اسلام آباد جا رہی تھی وہ بیگ ہاتھوں میں پکڑے نیچے آئی۔بڑی باجی نے ارسلان کو تیار کر دیا تھا۔اماں نے پوتے کو گود میں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''ذرا اِس کا خیال رکھنا وہاں بہت سردی ہے۔''

''ارے اماں جی! اِسے آپ میرے ساتھ کیوں بھیج رہی ہیں۔''

''مگر سمیرا اِس کا ایمبیسی کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے۔'' بڑی باجی نے کہا۔

''مگر کیوں؟ یہ کوئی میرے ساتھ امریکا تھوڑی جا رہا ہے۔''

اور دونوں باجیوں اور اماں جی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سمیرا نے اُن کے حیرت بھرے چہرے دیکھے اور آہستگی سے بولی۔

''بڑی باجی دنیا میں صرف اپنے لئے نہیں جیا جاتا۔ یہ ٹھیک ہے میں اِس کی ماں ہوں۔ اِس کی کمی مجھے مضطرب رکھے گی مگر وہ اضطراب اُس سے کہیں زیادہ ہوگا جب آپ لوگوں کے خاموش اور پژمردہ چہرے میرے تصور میں اُبھریں گے اِس کی چہکار میں آپ اپنی محرومیوں کو بھول جاتی ہیں۔ ہنستی ہیں یہ امر میرے لئے وجہ سکون ہے میری تو ویسے بھی تمنا ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ اکھٹے رہیں اور یہ تو آپ کا ہی بیٹا ہے!''

وہ چلی گئی۔ پر بڑی باجی، چھوٹی باجی اور اماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ارسلان دادی کی گود سے اُترنے کے لئے بے تاب تھا۔ بڑی باجی نے اُسے اپنی بانہوں میں تھام کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''تیرے باپ نے سچ کہا تھا تیری ماں کے سینے میں ایثار بھرا دل ہے۔''

☆☆☆

ہوسِ زر

نصیبوں کی ہلکی دِکھے تھی۔ماں چھٹی بھی نہانے نہ پائی تھی کہ اگلے جہاں چل بسی۔مٹھی بھر گوشت کا لوتھڑا یہاں وہاں ریں ریں کرتا نظر پڑتا۔اتنی بڑی جان کے مقابلے میں اُس ننھی سی جان کی کیا اہمیت ہوسکتی تھی؟ یوں بھی کون سی کلیجے سے لگانے والی دادی، پھوپھی، نانی یا خالہ بیٹھی تھیں۔بان کی کھری چارپائی پر میلے کچیلے چیتھڑے میں لپٹے دیکھ کر کسی کے من میں اگر مہر پڑ جاتی تو اُسے دو گھونٹ پانی یا دودھ مل جاتا۔وگرنہ یونہی بلکتی رہتی۔

باپ کا آگا تھا نہ پیچھا۔اوپر سے مفلسی کسی بلا کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔غریبی میں جورو کا ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بیوی کی شکل دیکھی تو وہ بھی سال بھر کے لئے۔جو کمایا وہ دوسروں کی نظر چڑھا تب گھر بسا اور پل میں بس کر اُجڑ بھی گیا۔ اُس کی حالت پاگلوں کی سی تھی۔اب بھلا وہ بالشت بھر کی بچی کا کیا خیال کرتا؟

دور پار کی پھوپھی نے اُٹھایا اور اپنے گھر لے آئی۔اُس کے بچوں کے ساتھ گھستی گھساتی وہ بھی پلنے لگی۔محبت اور شفقت کا مزہ ہی نہ چکھا۔بس جھڑکیاں اور گالیاں کھائیں۔ دھموکوں اور ڈنڈوں سے تواضع کرواتی وہ جوانی کی دہلیز پر جا کھڑی ہوئی۔کھانے کو سوکھے

ٹکڑے ملے۔ہاں خوبصورتی چاروں کھونٹ دھوم مچاتی اُس کے قدموں میں سجدہ ریز ہوئی۔

سارا دن کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہتی۔لیکن کوئی بیس بار انگنائی میں بیٹھی پھوپھی کی نظر بچا کر دیوار پر ٹنگے دُھندلائے بدوضع آئینے میں چہرے کو دیکھنا نہ بھولتی۔ سرخی پاؤڈر گھر میں تھا نہیں۔ململ کے موٹے دوپٹے میں آٹا چھان کر میدہ نکالا،اُسے پاؤڈر بنایا اور ہزار وقتوں سے ایک پیسہ چرا کر بازار سے سرخ روشنائی کی ایک ٹکیہ منگوائی۔

پھوپھی کہیں کام کام سے باہر جاتی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ بناؤ سنگھار میں جت جاتی اور جب دروازے پر کھٹکا ہوتا۔منہ پونچھ پانچھ دروازہ کھولتی اور آدھا منہ ننگا اور آدھا ڈھکا لئے باورچی خانے میں آجاتی۔چندھی آنکھوں میں دھول ڈالنا اُس کے لئے کچھ اتنا مشکل نہ تھا۔اُس کے سوا گھر میں کوئی اور لڑکی نہ تھی۔پھوپھی کے تین لڑکے تھے اور وہ تینوں کام سیکھنے صبح گھر سے نکلتے اور رات گئے لوٹتے۔

پچھلے محلے دلہن بیاہ کر آئی۔دوپہر کو وہ بھی اُسے دیکھنے گئی۔زیور سے ایسی لدی پھندی تھی کہ اُس کے دل میں رہ رہ کر ہوک اُٹھی۔اپنے آپ سے کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''ارے اتنا لدلدا اور لیپا پوتی کر کے بھی صورت پر تو بارہ بج رہے تھے۔مجھ ایسی اگر یہ سب پہن لے تو کیسی لگے؟''

اُس کا جی چاہا اُسے اُٹھا کر خود اُس جگہ بیٹھ جائے۔لوٹی،تو افسردہ تھی۔کام کرتے کرتے اُس نے بیسیوں بار بے اختیار سوچا۔

مقدر والیاں دلہنیں بنتی ہیں۔میرے بارے میں تو پھوپھی نے کبھی سوچا نہیں۔ اُسے سوچنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ مفت کی نوکرانی ملی ہوئی ہے۔بھلا میری شادی کر کے وہ اپنے سارے سکھوں سے محروم ہونا کیوں پسند کرے گی؟ صبح اُٹھتی ہے۔برقع سر پر ڈالتی اور گھومنے نکل کھڑی ہوتی ہے۔چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتی ہے۔دھلے کپڑے پہنتی ہے اور

سگے سگے کی باتیں کرتی ہے۔پہلی بار اُس نے جی بھر کر اپنے باپ کو کوسا۔

اللہ مارا جانے کہاں غائب ہوگیا؟ کوئی اس جیسا پاگل بھی ہوگا۔اپنی اولاد دوسروں کے سر منڈھ دی۔مجھے پالتا۔اس چندھی کی میں اتنی خدمت کرتی ہوں۔تو سگے باپ کی نہ کرتی؟ لوگوں کے طعنوں کے لئے چھوڑ گیا۔ٹھیک ہی کہتی ہے پھوپھی۔اپنی مصیبتیں اُس کے گلے میں ڈال دیں۔اب بھلا وہ کاہے کو میرا بیاہ کرے؟ یونہی اِن لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھتے بجھتے میں بوڑھی ہوجاؤں گی۔

بڑھاپے کی ایسی خوفناک شکلیں اُس کے سامنے آئیں کہ وہ لرز اُٹھی۔

دھوئیں سے سیاہ باورچی خانے میں بیٹھی وہ خوش رنگ کپڑوں کے بارے میں سوچتی۔۔۔عالم تصور میں اپنے جسم پر سونے کے گہنے دیکھتی۔ڈھولک اور شہنائی کی آوازیں کانوں میں گونجتیں اور پھر خوبصورت سے مرد کے گھر میں لہک لہک کر گیت گاتے اور پھدک پھدک کر کام کرتے اپنے آپ کو دیکھتی۔مرد کی شکل کیسی ہو؟ اس کے بارے میں اُس کا خیال ہمیشہ گڈمڈ ہوجاتا۔دیکھے ہوئے مردوں میں سے جو اُس کی نظر میں سب سے اچھا ہوتا۔بس اپنا خیالی محبوب اُس جیسا بنالیتی۔

اِن سوچوں میں گھری وہ اکثر روٹیاں جلا ڈالتی۔ہنڈیا لگ جاتی اور بوا نگنائی میں پھیل جاتی۔پیڑھی پر بیٹھی پھوپھی کھانس اُٹھتی اور وہیں سے پھنکارتی۔

''اے آنکھوں میں کیا بٹن ٹانک لئے ہیں جو تمہیں کچھ نظر نہ آوے ہے۔سارا دن بچے سولی پر چڑھ کر چار پیسے لاویں۔لیکن یہ یوں تباہی کرے ہے۔میں کہوں اپنے لچھن درست کر۔ورنہ کوئی تھوکے گا بھی نہیں۔''

اور وہ وہیں بیٹھے بیٹھے گرہ لگاتی۔

''تم نے کہاں اِس جوگی کو چھوڑنا ہے؟''

محلے میں اونچی حویلی والوں کے نئے کرایے دار آئے۔ بیوہ ماں اور اُس کا اکلوتا بیٹا۔ لڑکا کسی فیکٹری میں ملازم تھا۔ بجلی کا کام اچھا کرنا جانتا تھا۔ چھت پر اوپر آتے جاتے اُس پر نظر پڑی۔ دل کو بہت بھائی۔ ماں سے بات کی۔ وہ رشتے کا پیغام لے کر پھوپھی کے پاس آئی۔ اُس نے آگے سے خاصی لتاڑ دی۔

''ابھی تو اُسے چودھواں بھی نہیں لگا۔ یونہی ڈانگ کی ڈانگ ہوگئی ہے۔ کم عمری میں بیاہنے سے تو لڑکی عمر بھر موت ہی میں پھنسی رہوے ہے۔ یوں بھی مجھے غیروں میں لڑکی نہیں دینی۔ اللہ رکھے۔ میرے اپنے بہتیرے رشتے دار ہیں۔''

لڑکے کی ماں خاصی تیز طرار عورت تھی۔ کچھ تو اِردگرد کے لوگوں سے حالات سن کر اور کچھ گھر میں جا کر دیکھ آئی تھی۔ اُس نے لڑکی کو نتھے چڑھانے کا سوچا اور چپ چپاتے چلی آئی۔

پھوپھی کی عدم موجودگی میں اُس نے گھر آنا شروع کر دیا۔ اُسے اپنے ہاں بھی بلانے لگی۔ شادی کے دلفریب خواب اُسے دکھائے۔ اور وہ تو پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی۔ شملی تو بہک گئی۔ پروگرام کے مطابق ماں بیٹے نے وہ مکان چھوڑا اور دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ رات کی تاریکی میں بیٹا اُسے بھی بھگا کر لے آیا۔

ماں نے ہزار ہزار بلائیں لیں۔ دھیلہ پیسہ خرچ کیے بغیر چاند سی دلہن گھر میں آ گئی تھی۔ دو تین جوڑے جو بیٹے کے بیاہ کے لئے بنا کر بکس میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ نکال کر اُسے پہنائے۔ نقلی زیور سے اُس کو سجایا اور محلے کے مولوی کو بلا کر نکاح پڑھوایا۔ اردگرد کے گھروں میں گڑ والے میٹھے چاول پکا کر بانٹے۔

اُسے نے کچی دیواروں والے اُس چھوٹے سے گھر کو دیکھا جو اب اُس کا اپنا تھا۔ جھلملاتے سستی قسم کے بروکیڈ کے کپڑے اُتار کر ایک طرف رکھے اور گھر کی صفائی ستھرائی

میں جت گئی۔اُس کے ہاتھوں کچا گھر شیشے کی طرح چکا ڈالا۔میاں چاہنے والا تھا۔ہاتھ کا کاریگر،معقول پیسے کمالیتا اور سب کے سب لا کر اُس کی تلی پر رکھتا۔کہاں تو وہ کبھی موری والے پیسے کو ترستی اور کہاں اب نوٹ اُس کے ہاتھوں میں رہنے لگے۔پیسے کا گھر،گھر والے کی چاہت کا اور اپنے گھر میں بسنے کا حُسن اُس پر جادو کی طرح چڑھ کر بولا۔ایسی نکھری کہ میاں تلووں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہتا۔

''بانو!تم جیسی حسین عورت اِس خدائی میں نہیں ہو سکتی۔''

اُن کا گھر جس محلے میں تھا وہاں نچلے طبقے کے لوگ رہتے تھے۔کچے گھر تھے،مگر جب سے اُن گھروں کے مرد اور لڑکے بالے مشرق وسطیٰ کے مختلف ملکوں میں کمائی کے لئے نکل گئے تھے تب سے بہت سے گھر پختہ بن گئے تھے۔کمروں میں ریڈیو ٹرانسسٹر،ٹیپ ریکارڈر،ٹیلی ویژن اور فریج جیسی قیمتی اشیاء سج گئیں۔

ان گھروں میں اُس کا بھی آنا جانا تھا۔ساتھ والیوں کے جسموں پر جب باہر کے قیمتی کپڑے دیکھتی تو دل مسوس کر رہ جاتی۔باہر گلی میں پھرنے والے ننگ دھڑنگ بچے اب باہر کی جرسیاں اور کپڑے پہنتے۔بچے بچے کے ہاتھ پر گھڑی بندھی نظر آتی۔بس نہ چلتا تھا کہ کیسے وہ سب کچھ اُٹھا کر اپنے گھر میں ڈال لے۔وہ جو اپنے گھر میں سکون اور سکھ سے رہتی تھی،اب بے چین اور پریشان رہنے لگی۔شوہر سے بھی اکثر اظہار کئے بغیر نہ رہتی۔

''سب لوگ دھڑا دھڑ باہر جا رہے ہیں۔نکو راج بھی چلا گیا ہے۔پرسوں کسی کے ہاتھ اُس نے گھر بھر کے لئے کپڑے بھیجے۔کیا بتاؤں کیسے شاندار تھے؟تم کوشش کیوں نہیں کرتے؟اللہ رکھے اب بچوں کا بھی ساتھ ہے۔گھر بھی کرایے پر ہے۔پیسہ ہوگا تو یہی خرید لیں گے۔تھوڑا سا پانی ڈالا اور فرش صاف۔''

وہ چپ چپ بیٹھا سنتا رہتا۔کبھی کبھی کہتا۔

''جی تو میرا بھی چاہتا ہے، پر نیک بخت، باپ سر پر نہ ہو تو بچے بگڑ جاتے ہیں۔''
وہ بھنا کر کہتی۔

''کوئی نہیں بگڑتے۔ ساری دنیا باہر جا رہی ہے۔ یہاں جھک مارتے رہنے سے وہاں چار سال لگا آؤ گے تو اچھے نہ رہو گے؟''

اور جب گامو لوہار ڈیڑھ سال بعد آیا تو ایسی ایسی چیزیں لایا جنہیں دیکھ کر اُس کے سینے پر سانپ لوٹ لوٹ گئے۔ ماں، بیٹیاں، بیٹے ولایتی صابن سے نہاتے، خوشبوئیں لگاتے، قیمتی کپڑے پہنتے تو وہ گھر کے دروازے میں کھڑی حسرت سے انہیں دیکھتی۔ اپنے آپ سے جل جل کر کہتی۔

''پہن اوڑھ کر بھی بھتنیاں ہی لگتی ہیں۔ کہیں میرے جیسی کو یہ سب مل جائی تو دور دیس کی پری لگے۔ پر میرے نصیب اتنے تیز کہاں؟''

دن رات اُٹھتے بیٹھتے ایک ہی ورد شروع ہو گیا تھا۔ باہر جانے کی رٹ لگ گئی تھی۔ تھوڑا بہت جو پس انداز کیا تھا وہ نکال کر شوہر کے سامنے رکھ دیا۔ ایک دو جو سونے کی چیزیں پاس تھیں وہ بھی بیچ ڈالیں۔ محلے کے کافی لوگ باہر تھے۔ کیوں سے دوستانہ تھا۔ چند ایک کو کہا سنا اور ویزہ آ گیا۔ پاسپورٹ بنا اور وہ ایک دن باہر جانے کے لئے جہاز میں سوار ہو گیا۔

اُس نے خوابوں کی ایک دنیا اپنے گرد آباد کر لی۔ گھر یوں بناؤں گی۔ فلاں جگہ فلاں چیز رکھوں گی اور فلاں کو بلاؤں گی۔ فلاں فلاں کے گھر جاؤں گی۔ سارا دن اور رات کا بیشتر حصہ وہ انہی خیالوں میں گزارتی۔ بچوں سے اُس کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ گھر کی صفائی وہ جس عزم سے کیا کرتی تھی ویسے کرنی چھوڑ دی۔

''اری عفت! میں گارے مٹی سے جان ہلکان کرتی پھرتی ہوں۔ پیسہ آیا تو سب

سے پہلے مکان کا کانٹا کھینچوں گی۔مستریوں کے گھر جیسا گھر بلکہ اُس سے بھی خوبصورت اور شاندار بنواؤں گی۔جل جل کر مریں گے۔''

وہ خود کو قیمتی کپڑے پہنے دیکھتی، خوشبوؤں میں بسی محسوس کرتی۔شاندار گھر سے نکل کر گردن اکڑا نے نخرے سے گلی میں سے گزرتی۔ساتھی رنوں کی رشک وحسد سے لبریز نگاہیں اپنے آپ پر گڑی محسوس کرتی اور زیرلب مسکراتی۔

ایک مہینہ گزرا۔پھر دوسرا بھی بیت گیا۔آنکھیں خط کا انتظار کرتے کرتے پک گئیں۔وسوسے اور اندیشے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جان سے چمٹنے لگے۔پردیس اور انسان کا کیا اعتبار؟ پل میں ہے پل میں نہیں ہے۔تیسرے مہینے کا آخری ہفتہ تھا جب اُس کا خط ملا۔دھڑکتے دل کے ساتھ وہ لفافے کو سینے سے لگا کر اندر بھاگی آئی۔خود تو الف ب سے کوری تھی۔بڑا لڑکا ساتویں میں پڑھتا تھا۔قریب ہی سکول تھا۔چھوٹی لڑکی کو اُسے بلانے بھیجا۔وہ آیا تو ماں باہر کی کنڈی لگا کر اُس کے پاس بیٹھ گئی۔جانے کیسی خبر ہو؟ یوں ہی کسی کو بھنک پڑ گئی تو جگ ہنسائی ہوگی کہ لو بھیجا تھا کمائی کرنے کھالے کمائی۔

بیٹے نے رک رک کر پڑھنا شروع کیا۔

''بانو! میں تو کبھی ایک رات کے لئے بھی تم سے اور بچوں سے جدا نہ ہوا تھا۔اب تو ڈھائی مہینے گزر گئے ہیں۔خط یوں لکھا کہ سوچا تمہیں پیسے بھیجوں اور پتر بھی لکھ دوں گا۔میرے کام کی یہاں بہت مانگ ہے۔آتے ہی کام پر کھڑا ہو گیا ہوں۔پانچ ہزار کا ڈرافٹ بھیج رہا ہوں۔آئندہ اس سے زیادہ پیسے بھیجوں گا۔بانو تمہیں بہت ضد تھی کہ میں باہر جاؤں۔پردیس میں آ کر پتہ چلتا ہے کہ اپنا وطن کیا شے ہے؟ مجھ جیسے جاہل آدمی کو کبھی اپنے ملک سے محبت کا احساس نہ ہوتا اگر پردیس کے چکر میں نہ پڑتا۔سبھی کچھ ہے پر تم لوگ نہیں ہو۔میں خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ گھر یاد نہ آئے۔

ہاں! یہاں گرمی بہت شدت سے پڑتی ہے۔ پھوڑے پھنسیوں کا راج ہے۔ مگر میں ان سے بچا ہوا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میں نے آتے ہی تُمّوں کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ بچے تو ٹھیک ہوں گے۔ اُن کی طرف سے لاپروائی نہ کرنا۔''

خط ختم ہوا اور ساتھ ہی اُس نے اپنی گیلی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر وہ کھڑی ہوئی اور اپنے آپ سے بولتی ہوئی کمرے میں جانے لگی۔

''یہ تو سر پھرا ہے۔ ساری دنیا ہی اِس پیٹ کے چکر میں اُلجھی پھرتی ہے۔ خیر سے پانچ بچے ہیں۔ انہیں رہنے کے لئے مکان چاہیے۔ پہننے کے لئے اچھا کپڑا، کھانے کے لئے ستھرا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے تو کچھ بھی نہیں بنتا۔ دکھ کاٹ کر ہی سکھ ملتا ہے۔''

شام تک محلے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پتہ چل چکا تھا کہ ادریس نے پانچ ہزار بھیجا ہے۔ وہ بہت اچھی جگہ پر سیٹ ہو گیا ہے۔ مبارک باد دینے والیاں رات گئے تک آتی رہیں۔

اُس کے خط کم اور پیسے زیادہ آتے۔ پر جو خط بھی آتا اُس میں وہ یہ لکھنا نہ بھولتا۔

''بچوں کی طرف سے غفلت نہ کرنا۔ پیسے کی افراط ہو تو بچے بگڑ جاتے ہیں۔ لڑکیوں کا خاص خیال رکھنا۔ انہیں محلے میں زیادہ آنے جانے سے روکنا۔ گھر میں ٹی وی نہ لانا اور نہ بچوں کو کہیں دیکھنے کے لئے بھیجنا۔''

وہ خط سن کر ہنستی اور بچوں سے کہتی۔

''تمہارے باپ کو مالیا خولیا ہو گیا ہے۔ سب بچے ٹی وی دیکھتے ہیں۔ بھلا اِس کے بغیر گھر کہاں بجتا ہے؟''

مختلف لوگوں کے ہاتھوں کپڑا اور دوسری چیزیں بھی آتی رہیں۔ دونوں لڑکوں نے بال بڑھا لئے تھے۔ فلیپر نما پتلونیں پہنتے۔ بڑا تو سگریٹ بھی پینے لگا تھا۔ سینما بینی کا

شوق بھی پال لیا تھا۔ محلے کے بےفکرے لونڈوں سے دوستی بڑھ گئی تھی۔لڑکیوں نے شیکی کٹ بنوالئے۔میکسیاں اور فلیپر سلوائے۔باہر نکلتیں تو بن ٹھن کے خوشبوؤں میں بس کر۔پر گھر کی حالت ابھی خستہ تھی۔آنگن اور کمرے کچے تھے۔ڈھیروں مٹی اُڑاتے۔بالٹی بھر پانی کے چھڑکاؤ کے بغیر جھاڑو نہ پھرتی۔اُس پر اب مکان بنوانے کا بھوت سوار تھا۔مالک مکان سے معقول قیمت پر سودا ہوگیا اور نئے مکان کی بنیادیں اُٹھادی گئیں۔جتنا جمع جوڑا تھا سب لگ گیا۔پر مکان عالیشان بن گیا۔انہی دنوں ادریس کا خط آیا۔اُس نے لکھا تھا۔

''میں بہت اُداس ہوں۔جی چاہتا ہے کہ اُڑ کر پاکستان آجاؤں۔کمپنی تو دو سال بعد آمدورفت کا خرچ دے گی۔پر میں اپنے خرچ پر آنا چاہتا ہوں۔بانو! یوں لگتا ہے مجھے تم لوگوں سے جدا ہوئے سال نہیں صدیاں گزر گئی ہیں۔''

خط سنتے ہی اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔اپنے خرچ پر آنے کا مطلب ہے کہ دس پندرہ ہزار روپیہ گل ہوگیا۔سب کچھ مکان پر لگا بیٹھی تھی۔پاس دھیلہ نہ تھا۔نئے کمرے نیا سامان مانگ رہے تھے جو روپے کے بغیر نہ آسکتا تھا۔بیٹے کو پاس بٹھا کر شوہر کو لکھوایا۔

''یوں دل چھوٹا کرنے سے کام نہیں چلے گا۔گھر بن گیا ہے اور جمع پونجی اُس میں لگ گئی ہے۔تمہارے یوں آنے سے سراسر نقصان ہوگا۔ایک سال کی بات ہی کیا ہے؟ آنکھ جھپکتے گزر جائے گا۔بچوں والے والدین اپنے لئے نہیں اولاد کے لئے جیتے ہیں۔''

پیسہ آتا رہا۔صوفے آگئے۔کھانے کی میز اور کرسیاں بنیں۔ٹی وی اور فریج بھی کمروں میں سج گئے۔خوش رنگ پردوں نے کمروں کا حُسن اور بڑھا دیا۔دونوں لڑکیاں سلائی کے سکول جانے لگیں۔وہاں سے سیکھ سیکھ کر گھر کی ڈیکوریشن کی بے شمار چیزیں بنا ڈالیں۔وہ سارے گھر میں گھومتی اور دیکھ کر خوش ہوتی۔یقیناً اُس کے گھر جیسا محلے میں کسی کا نہ تھا۔صبح سے شام تک گھر میں لتا کی آواز گونجتی۔رات پڑتی تو ٹی وی کھل جاتا۔خود بھی

دوسروں کے گھر میں جاتی اور اصرار سے اُنہیں بھی بلاتی ۔مقصد گھر کی نمائش تھا۔

ادریس کے وطن آنے کے دن قریب آئے تو اُس نے سارے بچوں سے کہا۔

''میں نے تم لوگوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی ۔تم سب نے مرضی کے کام کئے ہیں ۔پر اب تمہارا باپ آرہا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ وہ اِن چیزوں کو پسند نہیں کرتا ۔یہ میکسیاں اور سلیپر سبھی ٹرنکوں میں بند کردو ۔باہر آنے جانے پر بھی پابندی لگاؤ ۔اُسے مہینہ بھر رہنا ہے ۔اس عرصے میں کوئی ایسی حرکت نہ ہو جو اُسے ناگوار گزرے!''

وہ جب گیا تھا گھر ٹوٹا پھوٹا اور خستہ حال تھا ۔بچے آدھے ڈھکے اور آدھے ننگے تھے ۔اُن کے چہرے بے رونق تھے ۔عسرت اور ناداری کی گہری پرچھائیں پورے گھر پر مسلط تھیں اور جب وہ آیا تو دنیا بدل چکی تھی ۔ایسا خوبصورت گھر بنا تھا کہ اُس نے بے اختیار داد دی ۔بچے قیمتی کپڑوں میں ہنستے مسکراتے نظر آرہے تھے ۔چہرے تازہ دم تھے ۔اُس نے پیسہ بہت بھیجا تھا ۔مگر اُسے ہرگز اُمید نہ تھی کہ بانو نے اُس کا مصرف اتنی عمدگی سے کیا ہوگا ۔گھر سکون اور آسائشوں کے ہنڈولے میں ہلکورے کھا رہا تھا ۔فوم کے بیڈ پر لیٹتے ہوئے اُس نے اپنے آپ سے کہا ۔

''میں یونہی پریشان تھا ۔میرے بچے زندگی کی اِن مسرتوں سے کیسے لطف اندوز ہو سکتے تھے ،اگر میں باہر نہ جاتا ؟ بانو تو ٹھیک ہی کہتی تھی ۔''

دن ہوا کے دوش پر گزرے ۔کھانے پینے کی چیزوں کی کمی تو پہلے بھی نہ تھی ۔مگر اب تو بہت بہتات ہو چکی تھی ۔فریج ہمہ وقت پھلوں سے بھرا رہتا ۔میل ملاقات والوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ۔چولہے ہر وقت گرم رہتے ۔بچوں کے منہ سارا دن چلتے ۔مگر اس کے باوجود وہ گھٹن محسوس کر رہے تھے ۔لڑکیوں کے باہر جانے کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا ۔لڑکے بھی شام کے بعد گھر سے نہ نکل سکتے ۔ٹی وی کا کوئی اچھا پروگرام ہی دیکھنے کو ملتا ۔ٹیپ

بند تھی اور اُن کے کان گانوں کو ترس گئے تھے۔لڑکیوں کو کٹے بال چھپانے کے لئے سر ڈھانپنا پڑتا۔

باپ کو جہاز میں بٹھا کر وہ گھر پہنچے تو اُن کے سروں سے بھاری بوجھ اُتر چکا تھا۔پیسہ دھڑا دھڑ آ رہا تھا۔مکان بن چکا تھا۔اس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی اور اب بینک بیلنس میں اضافہ ہو رہا تھا۔لڑکیاں بالوں کے کوہان نما جوڑے بنا کر اور قیمتی کپڑے زیب تن کر کے گھر کے دروازوں میں کھڑی ہو جاتیں۔دوسرے گھروں کی لڑکیوں سے ہنسی مذاق ہوتا۔ماں کو اپنی سہیلیوں سے فرصت نہ تھی۔لڑکے جب ہر دوسرے دن پیسوں کا تقاضا کرنے لگے اور لڑکیوں کی گھر سے باہر آمد و رفت زیادہ ہوئی، اُس نے اُنہیں ڈپٹا۔مگر اُس کی ڈانٹ کا اُن پر کیا اثر ہوتا؟

محلے میں جب سلطان کی لڑکی فلموں میں کام کرنے کے شوق میں گھر سے باہر نکلی، اُسے ہوش آیا کہ لڑکیاں بہت آزاد ہوتی جا رہی ہیں۔ماؤں کے سامنے بیٹھ کر دھرمیندر اور وحیدمراد کی خوبصورتی پر باتیں کرتی ہیں۔فلمیں نہ دیکھیں تو اُن کی جان لبوں پر آ جاتی ہے۔

بہتیری پابندی لگائی۔مگر سب بیکار تھا۔لڑکے بھی بہت بے راہ ہو چکے تھے۔ایک دو بار اُس نے سوچا میاں کو خط لکھوں۔پر حرص نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔سوچ کو عملی جامہ اِس لئے نہ پہنا سکی کہ ادریس تو آنے میں پل کی دیر نہ لگاتا اور ابھی تو اُسے پیسے کی ضرورت تھی۔تین بیٹیاں دروازے سے اُٹھانے والی بیٹھی تھیں۔دو لڑکے بیاہنے والے تھے اور وہ اُن کی شادیاں اِس قدر دھوم دھڑکے سے کرنا چاہتی تھی کہ دنیا دیکھے۔

اور جب دو سال بعد وہ دوبارہ آیا تو اُسے محسوس ہوا کہ گھر والی ہانپ گئی ہے۔

''بانو! پیسہ تو بوڑھے کو جوان بنا دیتا ہے اور تجھے کیا ہوا ہے؟ تو سو بیماروں کی ایک بیمار لگ رہی ہے۔''

''اے کہاں! اچھی بھلی تو ہوں۔ ہٹی کٹی۔ بس اب یہ فکر جان کے ساتھ چمٹا ہوا کہ بچے عزت آبرو سے اپنے اپنے ٹھکانے لگ جائیں۔''

اُس نے یہ نہیں بتایا کہ بڑا لڑکا سنار کی لڑکی لے کر بھاگ گیا تھا۔ وہ اُنہیں ایک بچے جا کر کہیں پکڑ کر گھر لائے۔ سنار بھی اچھے نکلے کہ پولیس میں رپٹ درج نہ کروائی اور نہ بات کو ہوا دی۔

لڑکی قصائیوں کے لڑکے سے عشق لڑانے لگ گئی تھی۔ اُس کی ہڈیاں کوڈے تو اُس نے اچھی طرح توڑے تھے۔ چھوٹا لڑکا اِس شدت سے سگریٹ نوشی کرنے لگا تھا کہ اُس کی انگلی پر دھوئیں کے زردی مائل نشان پڑ گئے۔ چھوٹی لڑکیاں پڑھائی میں نکمی اور سیر سپاٹوں میں ہوشیار۔ ساری اولاد ہی پیسوں کے ہاتھوں بگڑ گئی تھی۔

اُسے آئے چند ہی دن گزرے تھے کہ بڑے لڑکے کے سکول سے پیغام آیا۔ سرپرست کو ہیڈ ماسٹر نے بلوایا تھا۔ وہ ملاقات کے لئے گیا۔ دونوں لڑکوں کی ایسی پریشان کن رپورٹیں ملیں کہ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ گھر آیا تو بڑی لڑکی کی طبیعت سخت خراب تھی۔ بانو پریشان اُس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اُسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ڈاکٹر نے تفصیلی معائنے کے بعد بتایا۔

''ایسا ہونا فطری عمل ہے۔ گھبرانے والی بات نہیں۔ لڑکی ماں بننے والی ہے۔''

یہ خبر سنتے ہی چہروں کے رنگ اُڑ گئے۔ ادریس کو یوں لگا جیسے وہ اب زندہ نہیں بچ سکے گا۔ بانو کو اُس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ مردوں کی طرح گھر میں داخل ہوئے۔ دو دن تک پانی یا خوراک کا لقمہ تک اُس کے اندر نہ گیا۔ رو رو کر بانو کی آنکھیں سوج گئیں۔ اُس کے پاؤں کو چھوتی، ہاتھ جوڑ کر اُس سے معافی مانگتی۔

''بانو! تمہیں اِن سب کی تمنا تھی۔ میں نے تمہیں بار بار لکھا کہ بچوں کی طرف

سے غفلت نہ کرنا۔ پر تمہیں دولت سمیٹنے کی پڑی تھی۔ لو دیکھ لو! گھر دنیا کی چیزوں سے اٹا پڑا ہے، مگر تمہاری عزت گلیوں، بازاروں میں نیلام ہو رہی ہے۔

☆☆☆

دھنک رنگ برسات

مہم جوئی اُس کی پور پور، ہڈی ہڈی، جوڑ جوڑ اور رگ رگ میں رچی بسی تھی۔ کسی بڑے مضطرب لمحے کی پیدائش تھا۔ متحرک پارے کی طرح ہر وقت تھرکتا۔

ہاؤس جاب کا تھکا دینے والا مشقت بھرا کام، مریضوں کی آہ و بکا، دوائیوں کی مخصوص ہمک جو سانس لینے والی ہوا کے ساتھ مل کر اُس کا ایک لازمی جز بنی ہوئی تھی۔ دن رات کی ایک ہی روٹین۔ اُس نے اپنے ہاتھ کھڑے دیئے۔ ہوسٹل میں اپنے کمرے کی دہلیز پار کرتے ہی اُس نے اور آل بیڈ پر پھینکا۔ پانی کا گلاس اُٹھا کر لبوں سے لگایا۔ غٹ غٹ سارا پانی ایک ہی سانس میں چڑھا جانے کے بعد اُس نے گلاس تپائی پر پٹخا اور اپنے روم میٹ ڈاکٹر زبیر سے بولا۔

''بس بھئی بہت ہو چکی خدمت خلق۔ میں جا رہا ہوں پہاڑوں پر۔ اِس بار ساون کے نظارے بلندیوں پر ہوں گے۔''

''کیا کہنے۔ ساون منائیں گے بلندیوں پر۔ وہاں محبوبائیں بیٹھی ہوں گی پکوڑے تلنے کو۔''

ڈاکٹر زبیر نے تو اِسے اُس کا مذاق ہی سمجھا۔ اُس کی فطرت کے چلبلے پن سے تو وہ واقف تھا ہی مگر اِس حد تک نہیں کہ باہر دھواں دھار بارشوں کا زور تھا۔ روز گھٹائیں جھوم جھوم کر آتیں، برستیں، خالی ہوتیں اور پھر اگلے دن بھر بھر کر پھر آ جاتیں۔ اب ایسے میں پہاڑوں پر جانا کہاں کی دانائی تھی؟ لینڈ سلائیڈنگ تو پہلا خطرہ تھا جس سے فوری واسطہ پڑ سکتا تھا۔

جب اُس نے اُسے تیاریوں میں جتے دیکھا تو کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''اپنے حواسوں میں ہو نا؟ کیوں موت کو دعوت دیتے ہو؟''

''موت کو کیوں؟ نئی زندگی کو دعوت نہیں دے سکتا۔'' ڈاکٹر احسن رضا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یار تم اپنے بارے میں اِتنی زیادہ خوش فہمیوں میں کیوں مبتلا رہتے ہو؟''

''کہاں یار میں تو بڑا حقیقت پسند انسان ہوں۔ دیکھو تم بھی چلو۔ بہت مزہ رہے گا۔ تم نے یقیناً پہاڑوں پر نہ بارشوں کو دیکھا ہے اور نہ برف باری کو۔''

''معافی دو۔ میری جان اتنی سستی نہیں۔''

''لعنت ہے تم پر وقت زنخوں جیسی باتیں۔ یار کبھی تو نر بچہ بنو۔ یہ ہو جائے گا۔ دماغ اپنی گھسن گھیریوں میں اُلجھائے رکھتے ہو۔''

''چلو خدا کا شکر ادا کرو۔'' ڈاکٹر زبیر طنز سے بولا۔

''خیر سے ایڈمنڈ ہلاری کے جانشین بن رہے ہو۔''

ڈیبیٹ (Debate) کی یہ کیفیت شاید ابھی اور چلتی پر کمرے میں تین ڈاکٹرز اور آ گئے جنہوں نے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر کہا۔

''جانے میں بھئی تھرل تو ہے پر ابھی برسات شروع نہیں ہوئی اور بارشوں کا آغاز ہوگیا ہے۔اِس کیچڑ اور گندگلولے سے جان گھبراتی ہے۔''

احسن رضا نے مزید کوئی بات نہیں کی۔بس اپنا رک سیک درست کیا۔ضروری چیزوں کی پیکنگ کی اور چل پڑا۔راولپنڈی کے لئے کوچ میں بیٹھنے تک اُس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اُسے کہاں جانا ہے؟کشمیر کی طرف،گلیات میں،شمالی علاقوں میں یا دیر چترال۔وہ تو بس ایک بات جانتا تھا کہ کہیں بھی نکل گیا اُس نے فطرت کو سچ بولتے سننا اور دیکھنا ہے۔راولپنڈی میں کڑکڑاتی دھوپ تھی۔یہاں کوک پیتے پیتے یک دم ہی اُس نے کاغان ناران جانے کا فیصلہ کرلیا۔چاندنی رات میں جھیل سیف الملوک کا نظارہ۔اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

''ذرا دیکھیں تو سہی لوک داستانوں کی طلسمی باتوں کو،کتنی حقیقت ہے ان میں؟ اس بار یہ تجربہ بھی سہی۔''

مانسہرہ سے وہ کاغان کے لئے ویگن میں بیٹھا۔راستے کی دلفریبیوں نے ابھی اُسے پوری طرح اپنے سحر میں نہیں جکڑا تھا جب بالاکوٹ آگیا۔سیّد احمد شہید کا بالاکوٹ، اُس مردِ مجاہد کا بالاکوٹ جس نے پوری زندگی اسلام کی سربلندی کے لئے قربان کی۔اُس کا جی چاہا کہ وہ یہاں اُتر جائے۔اُس مردِ مومن کے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھے،اُسے خراج عقیدت پیش کرے۔پر ویگن بگٹٹ بھاگے جاتی تھی۔اُس نے کسی سے پوچھا۔

''یہاں چائے پانی کے لئے نہیں رکا جاتا۔''

جواب میں اُسے بتایا گیا کہ ''پارس'' پڑاؤ ہوگا۔اپنے دل کو اُس نے تسلی دی کہ واپسی پر بالاکوٹ اُتروں گا۔بالائی اور زیریں حصوں کو اچھی طرح دیکھوں گا۔دریائے کنہار کے ٹھنڈے ٹھار پانیوں سے لطف اندوز ہوں گا۔

''آسمان صاف اور شفاف تھا۔ دھوپ میں تیزی تھی۔ گھروں کی ٹین کی چھتیں سورج کی روشنی میں یوں چمکتی تھیں کہ آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں۔ بلند و بالا پہاڑوں پر پیڑ کے درخت اور خود رَو اُگی جھاڑیاں آنکھوں کو ٹھنڈک اور طراوت کا احساس بخشتی تھیں۔ سینکڑوں فٹ نیچے بہتا دریائے کنہار اژدھے کی مانند پھنکارے مارتا دل دہلائے دیتا تھا۔ راستہ نہایت دشوار گزار اور ویگن یوں فراٹے بھرتی خطرناک موڑ پر موڑ کاٹتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے میدانی علاقے کی کوئی خوبصورت کارپیٹڈ روڈ اُس کے پہیوں کے نیچے ہو۔

ویگن میں کوئی اٹھارہ مسافر تھے۔ پارس میں جب پڑاؤ ہوا۔ چار لوگ اُتر گئے۔ اُس نے کوک پی۔ پارس کی خوبصورت وادی کو دیکھا۔ بلند پہاڑوں کے وسط میں اور کہیں کہیں چوٹیوں پر بنے مکانوں کو دیکھ کر بے اختیار سوچا۔

''زندگی کس قدر کٹھن ہے یہاں؟ روز کی یہ چڑھائی اُترائی کہیں پاؤں رپٹ جائے بس کھڈے کھائیاں آغوش میں سمیٹنے کے لئے تیار۔''

چار مسافروں کے اُتر جانے سے ویگن میں سکون محسوس ہوا۔ ذرا ٹانگیں کھولنے اور دائیں بائیں وجود کو حرکت دینے کی آزادی سی محسوس ہوئی۔

ایک بجے کاغان وادی میں داخل ہوئے۔ اُس وقت بھوک زوروں پر تھی۔ پر بھوک سے بھی زیادہ اہم مسئلہ کسی اچھے ہوٹل کی تلاش تھی۔ لالہ زار قریب تھا پر اُس کی لوکیشن اُسے متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ اوپر چڑھنے لگا۔ چڑھتا گیا۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کو چھوڑتا کہ کسی بہتر اور اچھے کی تلاش میں جب اُس کے قدم رک گئے اُس کے سامنے روشنی غوم ہوٹل تھا۔ جیسے پہلی نظر ہی کبھی کبھار حتمی فیصلہ کر دیتی ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا۔

بس ٹھیک ہے اِسے دیکھو اندر بولا تھا۔ اندر کی آواز پر اُس نے سامان اُتار کر صحن میں رکھا۔ ملازم سے بات کی۔ بالائی منزل پر جا کر کمروں کا جائزہ لیا۔ پہلا کمرہ بہت

خوبصورت تھا۔کھڑکی کے شیشوں سے ایسا دلفریب منظر دیکھنے کو مل رہا تھا کہ سفر کی تھکاوٹ اُڑنچھو ہوگئی تھی۔چشموں کا پانی جھاگ اُڑاتا شور مچاتا پتھروں سے ٹکراتا تیزی سے بہہ رہا تھا۔وادی کشادہ نہیں تھی۔پہاڑ چاروں جانب سے اُمڈے ہوئے تھے۔یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی ماں نے اپنے نوزائیدہ بچے کو چھن جانے کے خوف سے اپنی بانہوں میں مقید کیا ہے۔

اُس نے منہ ہاتھ دھویا۔چند لمحوں کے لئے کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر دائیں بائیں کے نظاروں سے آنکھوں کو سیراب کیا۔پھر کمرے کو لاک کر کھانے کے لئے نیچے اُتر گیا۔

دو گھنٹے سونے کے بعد جب وہ جاگا۔وادی پر شام کے سائے اُتر رہے تھے۔ سامنے برف سے لدی پھندی چوٹیاں سورج کی الوداعی کرنوں میں نہا رہی تھیں۔مخالف سمت کے پہاڑ جیسے نیلے دھوئیں کے غبار میں لپٹے ملگجے اندھیرے کو نمایاں کر رہے تھے۔ اُس نے دوربین ہاتھوں میں تھامی اور سامنے کے برفیلے پہاڑوں کی طرف بڑھنے لگا۔

چڑھائی کتنی کٹھن تھی۔اُس کا سانس پھول رہا تھا۔باہمت اور جوان ہونے کے باوجود اُسے کہیں رکنا پڑتا۔خاصی بلندی پر پہنچ کر وہ ہموار سی ایک جگہ پر بیٹھ گیا۔دوربین اُس نے آنکھوں سے لگائی اور فطرت سے باتیں کرنے لگا۔دوربین کے زاویئے بدل رہے تھے۔دور نیچے بہتا دریائے کنہار اُسے بہت قریب محسوس ہو رہا تھا۔

دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے کوئی جھٹکا کھایا ہو۔جس جگہ پر بیٹھا تھا اُس نے حرکت کی۔دوربین آنکھوں سے الگ کر کے اُس نے خود کا جائزہ لیا۔کچھ بھی نہیں تھا۔محض اُس کا وہم تھا۔نہ زمین نے کوئی حرکت کی تھی اور نہ اُسے کوئی جھٹکا لگا تھا۔اُس نے آنکھوں کو مسلا اور دوربین دوبارہ آنکھوں سے لگائی۔وہی منظر پھر آنکھوں کے سامنے تھا۔

''کیا معمہ ہے؟'' وہ حیرت سے اپنے آپ سے بولا تھا۔

گھر سو فی صد مقامی ہے مگر خوبانیوں کے پیڑ سے لٹکی لڑکی سو فی صد نیچے سے ہے۔طرحدار قسم کی لڑکی۔نیلی جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس خوبصورت لانبے بال شانوں پر بکھیرے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ اُچھل کود میں لگی ہوئی تھی۔

لڑکی جھوٹ بولنے کی حد تک خوبصورت تھی۔دوربین اُس کا ایک ایک نقش واضح کر رہی تھی۔رنگ وروپ کی تفصیل وضاحت کے ساتھ بیان کر رہی تھی۔

پھر اُس کی بصارت کی زد میں ایک مقامی عورت آئی۔اُدھیڑ عمر کی عورت جس نے برتنوں کا ٹوکرا اُٹھایا ہوا تھا اور جو غالباً اُنہیں دھونے کے لئے انگنائی میں لائی تھی۔مگر پتھروں کا بنا ہوا تھا۔بہت بڑا نہیں تھا تو چھوٹا بھی نہیں دِکھتا تھا۔ہرے رنگ کا داخلی دروازہ غالباً لوہے کا تھا۔یہ لڑکی کیا ان مقامی لوگوں کی رشتہ دار ہے؟ اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اگر میری طرح سیر سپاٹے کے لئے آئی ہوئی ہوتی تو کسی ہوٹل میں اپنے خاندان کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہوتی۔دو چھوٹے بچے بھی مقامی نہیں دِکھتے تھے۔ان کے لباس بھی نیچے سے تعلق کا بتاتے تھے۔

اُس نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کر گود میں رکھ لی۔لڑکی غالباً اندر چلی گئی تھی۔ نزدیکی پگڈنڈی پر کوئی چڑھ رہا تھا۔ایک مرد اور عورت سامنے آ گئے تھے۔مرد نے رک کر اُسے دیکھا۔

''یہاں کیا کرتے ہو؟''

اُس نے پوچھا۔انداز میں قدرے خفگی تھی۔

''سیاحت کے لئے آیا ہوں۔نظاروں سے خود کو محظوظ کر رہا ہوں۔'' وہ رسا سے بولا۔

''نیچے جاؤ بابا۔ اِدھر تم لوگ گھر نہیں دیکھتے ہو۔ اُس نے دائیں بائیں ٹانواں ٹانواں گھروں کی طرف اشارہ کیا۔ بے پردگی ہوتی ہے۔''

اُس کے جانے کے بعد اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دوربین کو اُس نے نہیں دیکھا وگرنہ شاید شامت آجاتی۔ لینے کے دینے پڑ جاتے۔

''کاغان بہت چھوٹی وادی ہے۔ اُمنڈے ہوئے پہاڑوں سے گھری۔ سیاح یہاں کی بجائے ناران ٹھہرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔'' ہوٹل میں اُسے کوئی بتا رہا تھا۔

شام نے اپنے پاؤں پوری طرح پسار لئے تھے۔ برف کے پہاڑ خوف زدہ سے نظر آنے لگے تھے۔ وادی کے گھروں سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر دوربین آنکھوں سے لگائی لڑکی کہیں نہیں تھی۔ بچے بھی غائب تھے۔ آنگن سونا اور ویران پڑا تھا۔

وہ اُٹھا۔ پینٹ کو اُس نے جھاڑا۔ اُترائی چڑھائی کی نسبت آسان تھی۔ مگر اِس میں بہت محتاط ہونے کی ضرورت تھی۔ پہاڑوں سے اُس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ چڑھائی اور اُترائی کے طور طریقوں سے بھی وہ اتنا نا آشنا نہ تھا۔ مگر جھٹ پٹے کے اس سمے وہ بار بار رک رہا تھا۔ لڑکی کے بارے میں بے شمار سوال اُس کے ذہن میں کھد بد مچا رہے تھے۔ کیسے کس سے اور کیوں کر اُس کا پتہ چلائے۔ سیاہ ریشمیں کے ہالے میں مسکراتا ایک شوخ سا چہرہ بار بار دوربین سے نکل کر پگڈنڈی پر آجاتا۔ وہ ہوٹل آگیا۔ آنگن میں چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لینڈ کروزر، کوسٹر کوچ اور ٹیوٹا کرولا۔ جب وہ آیا تھا بیشتر کمرے خالی تھے اور اب شاید ایک بھی خالی نہ ہوں۔

کمرے میں پہنچ کر اُس نے بیل بجائی۔ ملازم آیا۔ چائے کا کہہ کر اُس نے کھڑکی کے سامنے کرسی کر لی۔ اُس وقت پہاڑ بھوتوں کی مانند خوفناک اور ڈرانے والا تاثر دے رہے تھے۔ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ چشموں کا شور شرابا ماحول میں ہلچل مچا رہا تھا۔

گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے وہ سوچتا رہا۔اتنی الٹرا ماڈرن قسم کی لڑکی اُس متوسط قسم کے مقامی گھر میں کیسے ہو سکتی ہے؟ ذہن نے بہت سارے سوالات اُٹھائے۔ مقامی لوگوں کی رشتہ دار ہے۔چھٹیاں گزارنے آئی ہے۔کوئی بیمار ہے تبدیلی آب وہوا کے لئے آئے ہوں۔گھر کسی سے کہہ سن کر لے لیا ہو۔

''چائے ختم ہوگئی تھی مگر ذہن بدستور اُلجھا ہوا تھا۔اُلجھاؤ بڑھا تو اُس نے اپنے آپ کو ذرا ڈانٹا۔''

''کمال ہے کیا ایسی صورتیں پہلے کبھی نہیں دیکھی ہیں جو یوں ریشہ خطمی ہو گئے ہو۔ عقل کے ناخن لو۔میاں پتہ نہیں کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ بلاوجہ ہی سوچنا شروع کر دیا ہے۔''

وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ٹہلتا ٹہلتا نیچے بازار میں پہنچ گیا۔ہواؤں میں خنکی تھی اور اور اُن میں چیڑ کے درختوں کی باس گھلی ہوئی تھی۔بجلی بند تھی۔دوکانوں پر گیس لیمپ جل رہے تھے۔ہوٹلوں پر رش تھا۔رات کے کھانے کی تیاریاں تھیں۔یہاں دوکانیں زیادہ نہیں تھیں۔

وہ ایک جنرل مرچنٹ قسم کی دوکان پر چلا گیا۔سیون اپ کا آرڈر دیا اور بیٹھ کر دوکان دار سے گپ شپ کرنے لگا۔موسم کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔

''ہلکی پھلکی بارش تو کم وبیش دوسرے تیسرے دن ہو جاتی ہے۔ساون ابھی شروع نہیں ہوا۔ہوگا تو پھر جل تھل ہوگا۔''

احسن رضا نے سردیوں کے بارے میں پوچھا۔

''میاں ہم لوگ یہاں کب رہتے ہیں؟ بالاکوٹ کیوائی، پارس وچلاس کے علاقوں میں شفٹ کر جاتے ہیں جو نسبتاً کم ٹھنڈے ہوتے ہیں۔مویشی بھی وہیں لے جاتے

ہیں۔سردیوں میں تو میاں ادھر کا رخ نہیں کرتے۔''

''کیوں آخر؟'' اُس نے پوچھا۔ ''برف باری کی اپنی ایک کشش ہے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے مگر سڑکیں اچھی نہیں۔ برف پڑ جائے تو انہیں ہٹانے کے موثر انتظامات نہیں۔حکومت توجہ دے تو علاقہ سیاحتی نقطہ نظر سے بہت کمائی دے سکتا ہے۔''

ڈاکٹر احسن رضا نے دوکان دار کی اِس بات پر کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

''بھئی حکومت کو توجہ دینے کے لئے اور تھوڑے کام ہیں۔آپس کے لڑائی جھگڑوں اور کرسیوں کی کھینچا تانی سے انہیں وقت ملے تو وہ قومی اہمیت سے متعلقہ معاملات پر غور وخوض کریں۔''

''بہر حال گرمیوں میں یہ علاقہ قدرت کا بہت بڑا انعام ہے۔''

دوکان دار نے گھڑی دیکھی۔شاید دوکان بند کرنے کا وقت ہو رہا تھا۔

''بہت سے ایسے خاندان ہیں جو یہاں پورا سیزن گزارتے ہیں۔سازوسامان کے ساتھ آتے ہیں اور یہاں رہتے ہیں۔''

اُس کا دل بلیوں اُچھلا۔بظاہر بے اعتنائی سے بولا۔

''مگر ہوٹلوں میں قیام تو بہت مہنگا پڑتا ہوگا۔''

''نہیں بھئی وہ مقامی گھر لے لیتے ہیں۔ابھی جیسے میرا اپنا گھر فیصل آباد کی ایک فیملی نے لے رکھا ہے۔گھر کا سربراہ میڈیکل کالج فیصل آباد میں پڑھاتا ہے۔پروفیسر صاحب گزشتہ سال یہاں آئے تھے۔میری دوکان سے چیزیں لے کر جاتے ہیں۔واقفیت سی ہوگئی۔ایک دن میرا بڑا لڑکا بھی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا۔پروفیسر صاحب نے بچے سے اُس کی تعلیمی حالت کے بارے میں سوال جواب کئے۔پتہ چلا کہ اُسے تو اپنا نام تک لکھنا

نہیں آتا۔صاحب ہم اَن پڑھ لوگ کچھ نہیں جانتے۔میں نے اُن کی منت سماجت کی۔ میرے بچے کو تب جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ لے گئے۔اِس سال میں نے اپنا گھر خالی کیا اور پروفیسر صاحب کو دعوت دی کہ وہ فیملی سمیت آئیں اور سیزن یہاں گزاریں۔آج کل وہ لوگ یہاں مقیم ہیں۔پروفیسر صاحب تو واپس چلے گئے۔بچے یہیں ہیں۔''

تو عقدہ کھل گیا کہ خوبصورت چہرے والی وہ لڑکی کون تھی۔یقیناً وہ اُسی ڈاکٹر کی بیٹی ہوگی۔

''ہوں!'' ڈاکٹر احسن رضا گویا اپنے آپ سے بولا۔

''نو بجے دوکان بند ہو جاتی ہے۔''

دوکان میں موجود دوسرے مرد نے اُسے مطلع کیا۔

''آپ لوگوں نے گھر جانا ہوگا۔بلاوجہ میں نے آپ لوگوں کو روکے رکھا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' دوکان دار نے مروّت کا اظہار کیا۔

''دراصل یہ ہمارا سیزن ہے ہم اس میں دوکان صبح جلدی کھولتے ہیں۔''

رخصت ہو کر وہ باہر آ گیا۔ہوا میں ایسی خوشگوار خنکی تھی کہ سارا سریر اِس خوشگواری میں نہا گیا تھا۔کمرہ کشادہ تھا۔اُس نے کھڑکیوں کو کھلا رہنے دیا اپنے بیگ سے سفید چادر نکالی۔بستر پر بچھائی تکیے کا غلاف بدلا اور دوسری چادر پائنتی پر رکھی اور بیڈ پر لیٹ گیا۔دو سوتی چادریں اور تکیے کا غلاف وہ ہمیشہ ساتھ لے کر چلتا تھا۔

سونے سے قبل لڑکی ایک بار پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔اِس بار اُسے کچھ کوفت سی ہوئی۔

''کیا ہے یار؟ ٹین ایجر والی باتیں۔'' وہ خود سے بولا۔

''بھلا لڑکیاں کبھی دیکھی نہیں؟ چھ سال ہو گئے ہیں اُن کے ساتھ پڑھتے اور کام

کرتے۔ایسی بھی بےقراری کیا؟''

پر بےقراریاں جب دامن دل سے لپٹتی ہیں تو کچھ پوچھتی تھوڑا ہی ہیں۔وہ سوگیا تھا لیکن خواب انہیں مناظر کے دیکھ رہا تھا۔

صبح جب بیدار ہوا تو خود کو لعن طعن بھی کی۔لیکن دل کہتا تھا کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔بہت جاذبیت والا چہرہ رکھتی ہے۔منفرد سی ہے۔معصومیت سے بھری ہوئی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد نیچے اُترا۔ملازم نے پوچھا۔

''صاحب ناران جائیں گے۔''

اور بغیر سوچے سمجھے اُس کے منہ سے نکل گیا۔

''نہیں بھئی میں چند دن یہاں کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ناران میں نے چاند کی تاریخوں کے حساب سے جانا ہے۔چودھویں کا چاند مجھے جھیل سیف الملوک دیکھنا ہے۔''

اوپر جانے کی بجائے وہ نیچے اُتر گیا۔دریائے کنہار کے کنارے۔لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اُکتا گیا۔جی چاہا اوپر جائے دوربین آنکھوں سے لگائے اور اُس انگنائی میں جھانکے۔

اور پھر جیسے اُسے نہ اپنے قدموں پر اختیار رہا اور نہ دل پر۔وہ بھاگتا گیا اوپر، بہت اوپر کل والی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا۔دائیں بائیں اوپر نیچے اچھی طرح دیکھنے کے بعد اُس نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔آنگن خالی تھا۔خوبانیوں اور سیبوں کے پیڑ ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔

آدھا گھنٹہ، پون گھنٹہ، گھنٹہ، دو گھنٹے گزر گئے۔آنکھیں دُکھنے لگیں۔ناک کا بانسا

درد کرنے لگا۔ وہ اُٹھا بغیر کپڑے جھاڑے بگٹٹ بھاگتا نیچے ہوٹل آ گیا۔ کھانا کھائے بغیر بستر میں لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

''پاگل ہو گیا ہوں۔''

اُس نے سر کو تکیے میں گھسیڑ لیا اور آنکھیں موند کر نیند کو بلانے لگا۔ جب جاگا باہر بادل تھے۔ ہوا میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ چائے پینے کی ہڑک اُٹھی۔ بیل بجا کر اُس نے قریبی کرسی پر پڑا اخبار اُٹھا لیا۔ تاریخیں دیکھیں۔ ساون شروع ہو گیا تھا۔ تین تاریخ تھی۔

''اگر یہاں بارش ہو تو یقیناً بہت لطف رہے گا۔''

اُس نے سوچا اور اپنے آپ سے یہ سب کہا۔ ویٹر چائے لے آیا۔ اُس نے چائے بنائی کپ ہاتھوں میں پکڑا اور ٹیرس پر آ گیا۔ ہوٹل کا یارڈ خالی تھا۔ کمرے بھی خالی تھے۔ یقیناً لوگ ناران کی طرف نکل گئے ہوں گے۔ سیاح کاغان کی نسبت ناران میں ٹھہرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ملازم بتا رہا تھا۔

''کیوں؟'' اُس نے پوچھا تھا۔

''ناران وادی نسبتاً زیادہ کشادہ ہے۔ ہوٹلوں کی بھی بہتات ہے۔ دوسرے جھیل سیف الملوک بھی نزدیک ہے۔ من موجی لوگ تو پیدل ہی چل پڑتے ہیں۔''

بارش شروع ہو گئی۔ اُس کے انگ انگ میں سرشاری کی لہریں رقص کرنے لگیں۔ اللہ ساون شروع ہو گیا۔ اُس کی پشتون ماں ساون منانے کا بہت اہتمام کرتی تھی۔ ہاڑ کے مہینے میں ہی چنے کی دال کو صاف کر کے خود بیسن پیستی۔ دھنیے کا ایک ایک دانہ صاف کرتی۔

''ارے گھر کے بیسن کے پکوڑے اور پھلکیوں کا کیا کہنا۔''

اِدھر بارش شروع ہوتی اُدھر اُس کی کڑاہی چولہے پر چڑھ جاتی۔ کہیں پکوڑے بنتے۔ کہیں گڑ والے آٹے کے پوڑے تلے جاتے۔ محلے کے ہر گھر میں اِس پکوان کا بھیجا

جانا لازمی ہوتا۔

ماں کی یادوں نے اُسے بہت اُداس کر دیا تھا۔ بہت تمنا تھی اُسے اپنے اکلوتے بیٹے کو ڈاکٹر بنانے کی۔

''واقعی کسی نے سچ کہا ہے مقدر کے بغیر خوشی کہاں دیکھی جاتی ہے؟''

پھر جیسے اچھو لگ گیا۔ کپ اُس نے زمین پر پٹخا اور نیچے بھاگا۔ حیرت اُس کی آنکھوں سے پھٹی پڑتی تھی۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ ہوٹل کے دروازے سے نکل کر سامنے والی سڑک پر آ گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ کل والی لڑکی اُنہیں دونوں بچوں کے ساتھ اِس برستی بارش میں لکڑی کے دو دو فٹ چوڑے تختوں پر جن کے نیچے یقیناً بیرنگ لگے ہوئے تھے، پر بیٹھے ایک دوسرے کے پیچھے تیزی سے پھسلتے آ رہے تھے۔ تینوں کا توازن اپنی نشستوں پر خراب تھا۔ بچے آگے اور لڑکی اُن کے پیچھے تھی۔ تینوں شور مچا رہے تھے اور تیزی سے لڑھکتے آ رہے تھے۔ اُس نے پھرتی سے ایک بازو سے ایک بچے کو روکا۔ دوسرے بازو سے دوسرے کو۔ دونوں کو قریبی کھیت میں پھینکا اور لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں بازوؤں سے اُسے دبوچ کر تختہ اُس کے نیچے سے نکالا۔ بچوں کو پکڑا اور اُنہیں لے کر ہوٹل آ گیا۔

یہ سب پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ بچے اور لڑکی دہلے ہوئے تھے۔ اگر وہ اُنہیں نہ پکڑتا تو جانے وہ کس کھائی کھڈے میں گرتے۔ کہاں کہاں چوٹیں آتیں اور کون کون سی ہڈی ٹوٹتی؟

لڑکی کے کھلے سیاہ ریشمی بال گیلے ہو کر پانی کی بوندیں ٹپکا رہے تھے۔ وہ دونوں بچوں کو باتھ روم میں لے گیا۔ کھیت میں گرنے کی وجہ سے اُن کے کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو رہے تھے۔ پانی ٹھنڈا تھا پر مجبوری تھی۔ اُن کے کپڑے صاف کرنے کے بعد اُس نے

اُنہیں تولیے سے خشک کیا۔سفید چادروں میں لپیٹا اور کمرے میں لا کر بیڈ پر بٹھا دیا۔پھر اُس نے اپنا کرتہ شلوار نکالا اور لڑکی کی طرف متوجہ ہوا جو گم سم بیٹھی یہ سب دیکھ رہی تھی۔

''جایئے آپ کپڑے بدل آئیں۔'' اُس نے بڑے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

لڑکی نے نگاہیں اُٹھائیں اُسے دیکھا اور کچھ پس و پیش کا اظہار کیا۔ یہ کہتے ہوئے۔

''کوئی بات نہیں میرے کپڑے ٹھیک ہیں۔ابھی بارش رکے گی تو ہم لوگ گھر چلے جائیں گے۔''

اُس نے قدرے غصے سے اُسے دیکھا اور کہا۔

''اُٹھیے کپڑے بدل کر آیئے۔آپ نہیں جانتی ہیں آپ بیمار ہو سکتی ہیں؟''

اُس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ لڑکی کو اُٹھنا پڑا۔جب وہ کپڑے بدل کر آئی تو اپنے حلیے پر خود ہی مسکرا رہی تھی۔بچے مزے سے چائے اور اُبلے انڈے کھا رہے تھے۔اُس پر نظر پڑتے ہی چہکے۔

''کیسی لگ رہی ہیں آپ مونی آپی!''

اُس نے بھی نظر اُٹھا کر دیکھا۔پر جانے کیوں فوراً نگاہوں کا رخ بدل لیا۔کیسا قیامت خیز حُسن تھا۔ساون کی پہلی بارش نے چہرے کو یوں نہلا دیا تھا جیسے پھولوں کی پنکھڑیوں کو شبنم نہلا دے۔چائے کا کپ بنا کر اُسے تھماتے ہوئے پھر نگاہوں کا ٹکراؤ ہوا۔ احسان مندی چھلک رہی تھی وہاں۔ممنونیت کے جذبات عیاں تھے اُن میں۔اُس نے انڈا پلیٹ میں رکھا اور اُس کی طرف بڑھایا۔

''نہیں شکریہ میں انڈہ نہیں کھاتی۔'' اُس نے کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''اِس وقت کھا لیجیے۔فائدہ مند ہے۔''

اور اُس نے مزید کچھ کہے بغیر انڈہ کھانا شروع کر دیا تھا۔ چائے سے فارغ ہو کر اُس نے لکڑی کا وہ دو فتا تختہ اُٹھایا اور پوچھا۔

''یہ سکیٹنگ ہو رہی تھی۔ پر انجینئرنگ کے یہ شاہکار کس نے بنائے ہیں؟''

تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''ہم تینوں نے بنائے تھے۔''

تینوں بہن بھائی تھے۔ ہنی سنی اور مونا۔ باہر بارش دھواں دھار برس رہی تھی اور وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''گھر میں کون کون ہیں اور وہ پریشان تو نہیں ہوں گے؟''

''جب ہم گھر سے نکلے تھے مما سو رہی تھیں۔ اب اگر جاگ گئیں تو ہمیں نہ پا کر بہت پریشان ہوں گی۔''

اور پھر اُن تینوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔ مونا حمید مرزا اُس کے استاد ڈاکٹر حمید مرزا کی بیٹی نکلی۔ ایم بی بی ایس کی فرسٹ ائیر میں اُس نے اُن سے پڑھا تھا۔ پھر وہ فیصل آباد میڈیکل کالج میں ٹرانسفر ہو گئے۔ اُن کی مسز بھی وہیں ڈیمانسٹریٹر Demonstrator تھیں۔

مونا انیس بیس سال کی دلکش چہرے اور خوبصورت باتیں کرنے والی ذہین لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ خوبصورت آنکھوں میں ذہانت تھی۔ اُس کی گفتگو میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ سا تھا۔ حال ہی میں گریجوایشن سے فارغ ہوئی تھی۔ ایم اے کے لئے یونیورسٹی جوائن کرنا چاہتی تھی۔

اور احسن رضا دھواں دھار بارش کو برستے دیکھ کر سوچ رہا تھا۔

''قسمت کبھی کبھی کتنی مہربان ہو جاتی ہے۔ جس کے خیالوں میں شام رات اور صبح

کٹی تھی کیا معلوم تھا کہ اِس وقت میرے پاس ہوگی اور اِس انداز میں ہوگی۔"

"چائے کا ایک ایک کپ اور۔" اُس نے مونا کو دیکھا۔

"نہیں اِس کی ضرورت نہیں۔ ہاں ایک فیور Favour اور کیجیے۔ مما پریشان ہو رہی ہوں گی۔ کسی طرح اطلاع کر دیں کہ ہم یہاں ہیں۔"

وہ کھڑی ہوئی اور سامنے والی کھڑکی کے شیشوں کی طرف بڑھی۔ اُس کی ہیئت کذائی ایسی دلچسپ اور مضحکہ خیز تھی کہ احسن اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ بچے بھی ہنسنے لگے تھے۔ وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ اپنے آپ کو دیکھا۔ شلوار پاؤں میں رُل رہی تھی اور قمیض کا ٹخنوں کو چھونے والا حساب تھا۔ احسن کھڑا ہو گیا۔ اُس کے قریب جا کر بولا۔

"ہاں بتایئے شاید آپ گھر دکھانا چاہتی ہیں۔"

"جی اوپر اس طرف دیکھیے ذرا۔ سبز دروازوں والا۔ اِس طرف وہ آپ دیکھ رہے ہیں نا۔"

اُس کا خوبصورت ہاتھ اور اُس کی مخروطی انگلیاں دونوں شیشے والی کھڑکی سے باہر نکلے فضا میں ایک دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ احسن اِس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک بار اُسے یہ تاثر دینے کی کوشش نہیں کہ کہ وہ گھر جانتا ہے۔ اُس نے ملازم بلایا۔ جب وہ اُسے سمجھا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا بارش کا زور ٹوٹ رہا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ بارش اب رک جائے گی۔ میں خود جا کر اُنہیں بتا بھی آؤں گا اور آپ لوگوں کے کپڑے بھی لے آؤں گا۔ ملازم ممکن ہے صحیح طریقے سے بتا نہ پائے۔"

احسن نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"راستہ بہت سلپری ہو گیا ہے۔ آپ کے لئے اوپر جانا مشکل ہوگا۔"

اُس نے تشویش کا اظہار کیا۔

''ارے کمال ہے۔ میں پہاڑوں پر چڑھتا رہا ہوں۔ میرے لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں۔''

اب وہ کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہے تھے کہ کب بارش ختم ہو اور کب احسن جائے؟ تبھی احسن نے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں امید ہے محسوس نہیں کریں گی۔''

''پوچھیے۔'' اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''آپ کافی سنجیدہ سی اور لیے دیے والی لڑکی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ نٹ کھٹ بچوں جیسے کھیل جس میں اتنا خطرہ تھا اس میں کیوں شامل ہوئیں؟''

''اُف یہاں اتنی تنہائی اور خاموشی ہے کہ بندے کا جی چاہتا ہے وہ کوئی زبردست قسم کا کھڑک کھڑاک کرے تاکہ سناٹا ٹوٹے۔ ہم لوگ بور ہو گئے ہیں۔ اور میں بالکل سنجیدہ سی لڑکی نہیں ہوں۔ بہت ہنگامہ پسند ہے میری طبیعت۔ آپ مجھے کیا کوئی بوڑھی اماں سمجھتے ہیں؟''

وہ تو پھٹ پڑی تھی۔ آنکھیں بول رہی تھیں اور اُس کے ہاتھ بول رہے تھے۔

''نہیں بھئی خدانخواستہ میں آپ کو بوڑھی اماں کیوں سمجھنے لگا؟ آپ تو ماشاء اللہ۔۔۔''

احسن نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا اور فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بارش رک گئی تھی۔ وہ جانے کے لئے اُٹھا۔ دروازے میں رک کر اُس نے مونا سے کہا۔

''آپ لوگ کمرے میں ہی رہیں۔ باہر بہت ٹھنڈ ہے۔ کھڑکیاں بھی مت کھولیں۔''

اور جب وہ چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ تینوں کھڑکیوں کے

بند شیشوں سے چمٹے اُس دیکھ رہے تھے۔

''کبھی کبھی یہ اتفاقات زمانہ بھی کیسے کیسے خوشگوار حادثات جھولی میں ڈال جاتے ہیں۔''

اُس نے سبز دروازے پر دستک دی۔نوکرانی نے کھولا۔اُس نے کہا۔

''اندر بیگم صاحبہ کو بتا دو۔بچے ورشی غوم ہوٹل میں ہیں۔بھیگ گئے تھے۔اُن کے کپڑے چاہئیں۔''

پل بھر میں وہ اندر تھا۔سادہ سے کمرے میں ایک نفیس سی خاتون پریشان گھومتی پھر رہی تھی۔جانے کمرے کے کتنے چکر کاٹے ہوں گے؟اضطراب قابل دید تھا۔روہانسی آواز میں اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''وہاں کیسے چلے گئے؟''

''بس گھومتے پھرتے وہاں پہنچ گئے۔بارش ہوگئی تو ہوٹل میں آ گئے۔میں نے اپنے پاس بلالیا۔''

درمیانی بات وہ گول کر گیا تھا۔تینوں کے کپڑے اور سویٹر اُس نے بیگ میں ڈال کر اُسے تھما دیئے۔

''راستہ بہت خراب ہوگیا ہے۔'' ممتا نے اپنے خدشے کا اظہار کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''گھبرایئے مت میں اُنہیں خود چھوڑ کر جاؤں گا۔''

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہ اُنہیں لے کر آیا۔ماں دروازے میں کھڑی تھی۔خفا بھی ہوئی پر سینے سے بھی لپٹایا۔

''مما!ڈاکٹر احسن رضا پاپا کے شاگرد ہیں۔''

موما نے مسز حمید مرزا کی توجہ اُس کی جانب مبذول کی۔

''بیٹے! میں تو تمہارا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔ اُس وقت ایسی پریشانی میں مبتلا تھی۔''

''یہ علاقہ بہت امن پسند ہے۔ کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں یہاں۔'' احسن نے متانت سے کہا اور ساتھ ہی جانے کی اجازت طلب کی۔

''آپ کھانا کھائے بغیر کیسے جا سکتے ہیں؟' موما نے اُسے دیکھا اور کہا۔

احسن نے گھڑی دیکھی اور بولا۔

''ابھی کھانے میں تو بہت دیر ہے۔ پھر کبھی پر رکھیے۔''

''پہلے ہم لوگ چائے پئیں گے۔ میں پکوڑے بناتی ہوں۔ اس کے بعد آپ مما اور ڈیڈی سے گپ شپ کریں گے۔ تب تک کھانا تیار ہوگا۔''

''آپ کو کوکنگ آتی ہے؟'' احسن نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

''ارے بیٹا! یہ بہت اچھی کک ہے۔ کڑاہی گوشت بہت لذیذ بناتی ہے۔ آؤ ہم بیٹھتے ہیں۔''

اور واقعی ماں نے جو کہا تھا وہ سچ تھا۔ وہ جب اُن تینوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ مسز حمید کو اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ اُس وقت تپائی پر چائے کے برتن چن دیئے گئے تھے۔ گرم گرم پکوڑے پودینے کی چٹنی کے ساتھ۔ اُس نے کھائے اور تعریف کی۔ پکوڑے لذیذ تھے اور چائے عین اُس کے مزاج کے مطابق تھی۔

رات کا کھانا کھا کر جب وہ نکلا۔ وہ تینوں اُس کے ساتھ تھے۔ مسز حمید دروازے پر رک گئی تھیں۔ بچے ذرا آگے آ گئے تھے۔ ڈھلان پر قدم رکھنے سے پہلے موما نے اُس کے ہاتھ میں نارنج تھما دی۔

اُس کے اندر زبردست ارتعاش ہوا۔ اپنائیت کے اِس بھرپور انداز پر وہ بھیگ

گیا۔جھٹ پٹے کی اِس نیم تاریکی میں وہ مونا کی آنکھوں میں جھانکا اور کپکپاتے ہونٹوں سے بولا۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

''شرمندہ کرتے ہیں۔''

اور جب وہ نیچے اُتر رہا تھا، ٹارچ کی روشنی اُسے راستہ دکھا رہی تھی۔اُس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''ضروری تو نہیں دل کے معاملات طے ہونے میں مہینے یا سال لگیں۔کبھی کبھی تو پل لگتا ہے اور سب کچھ حاصل وصول ہو جاتا ہے۔''

رات خوبصورت تھی۔سپنے حسین تھے۔زندگی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ یک دم کا نٹا بدل کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

صبح وہ تازہ دم تھا۔لمبی واک نے اُسے مزید ہشاش بشاش کر دیا تھا۔ناشتہ ڈٹ کر کیا۔بادل گہرے تھے ہوائیں ٹھنڈی تھیں۔چشموں کا شور جوان تھا۔اور وہ خوبصورت نظاروں سے آنکھیں سینکتے ہوئے اپنے آپ سے کہتا تھا۔

''یہ ساون میرے لئے بہت رحمت والا ثابت ہوا ہے۔مونا سے میری ملاقات ہوئی۔ایسی خوبصورت ذہین اور ذمہ دار سی لڑکی اگر میری زندگی کی ساتھی بن جائے تو اِس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟''

وہ تو حیران رہ گیا تھا۔سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لکڑی کے تختوں پر بیرنگ لگا کر کھیل تماشے کرنے والی لڑکی اِس درجہ اچھی اور ذمہ دار لڑکی ہو سکتی ہے۔رات کا کھانا پر لطف تھا۔اُسے سلیقے سے پیش کیا گیا تھا۔ماں تو سارا وقت اُس کے ساتھ باتیں کرتی رہی تھی۔وہ چرخی کی طرح گھومتی یوں کام کر رہی تھی جیسے گھر میں کوئی وی آئی پی آیا ہو۔

اُس کا جی اوپر جانے کو چاہا۔ پر اُس نے جی کو ملامت کی۔ دوپہر کے بعد وہ تینوں آ گئے۔ مونا نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال تھا آپ ہمیں سیر کے لئے آفر کریں گے اور کہیں گے بھئی کل ضرور آئیں پر آپ تو خاموش رہے۔ ہم خود ہی آ گئے ہیں۔''

اُس نے محبت بھری نگاہیں اُس کے سراپے پر ڈالیں۔ وہ نیلی جینز، کھلی مردانہ قمیض اور مفلر گلے میں لپیٹے کھڑی اُس کی طرف دیکھتی تھی۔

''میں تمہاری آمد کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میرا دل چاہتا تھا بس۔۔۔''

اُس کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی۔ سفید دانتوں کی ہلکی سی نمائش کرتی ہوئی۔

''چلیں جھیل سیف الملوک کا پروگرام بناتے ہیں۔ آپ لوگوں نے وہاں کی سیر کی۔''

''کہاں؟ ہنی سنی دونوں اُچھلے۔ پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ناران اور اوپر بابو سر تک پروگرام اُن کے آنے پر تھا۔''

''اجازت مل جائے گی؟'' احسن نے پوچھا پھر خود ہی مزید کہا۔

''چلیے میں آپ کی مما سے خود بات کرتا ہوں۔ وہ بھی چلیں۔ مزہ رہے گا۔''

بچوں نے ایک نہ چلنے دی۔ مسز حمید نے کہا بھی۔

''پاپا آ جائیں تو اکٹھے جائیں گے۔''

انہوں نے شور مچایا۔

''پاپا کے ساتھ پھر سہی۔''

یوں پروگرام فائنل ہو گیا۔ احسن نے نیچے اڈے سے چار پہیوں والی جیپ کی۔ بچوں اور مسز حمید کو بٹھایا اور یوں قافلہ چلا۔

''خدا کرے بارش نہ ہو۔'' مسز حمید بولیں۔

''ہو بھی گئی تو کیا ہوگا؟'' سنی بولا۔

مسز حمید نے ڈانٹا۔

''اچھی بات منہ سے نکالتے ہیں۔ بارش میں یہ راستہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔''

احسن ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا۔ دائیں طرف پہاڑ تھے اور بائیں طرف دلفریب نظارے۔ سفر سہانا، موسم حسین اور ساتھی دل موہ لینے والا تھا۔

ناران تک دریائے کنہار ساتھ ساتھ چلا۔ جھیل سیف الملوک کا راستہ بہت خراب تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ پگڈنڈی بنائی گئی تھی۔ جیپ ایک گلیشئر کے سامنے رک گئی۔ بہت سی جیپیں رکی ہوئی تھیں۔ یہ گلیشیر پیدل چل کر پار کرنا تھا۔ آگے دوسری جیپیں تیار تھیں۔

احسن بڑا ایکسائیٹڈ تھا۔ بچے اور مونا اُس سے بھی زیادہ پر جوش تھے۔ مسز حمید قدرے فربہی جسم کی مالک تھیں۔ گلیشئر پر چلنے سے قدرے خوفزدہ سی تھیں۔

''آپ ہمت کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' احسن نے انہیں دلاسا دیا۔

نصف فرلانگ سے قدرے زیادہ چوڑے اِس گلیشئر پر پونیاں (خچر) لئے بوڑھے اور نوجوان لوگ کھڑے تھے۔ جو بیس تیس پر لوگوں کو گلیشئر پار کروانے کی پیشکش کر رہے تھے۔ احسن نے گلیشئر پر بیٹھے لوگوں سے واکنگ سٹک لیں۔ ایک مسز حمید کے ہاتھ میں تھمائی۔ دوسری اُس نے مونا کو دینی چاہی۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں میں خود بغیر کسی سہارے کے اِسے پار کروں گی۔''

ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے گرتے پڑتے ہنستے کھیلتے اُنہوں نے گلیشئر پار

کیا۔احسن مسز حمید کے ساتھ تھا۔اچھے بیٹے کی طرح جو ماں کو سہارا دینا جانتا ہو۔

آگے پھر جیپ کا سفر تھا۔چڑھائی بہت دشوار تھی۔راستہ انتہائی خطرناک۔جھیل دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھی۔جیپ یوں جھٹکے کھا رہی تھی جیسے کسی کو بجلی کا کرنٹ لگتا ہے۔دریائے کنہار چنگھاڑیں مار رہا تھا اور اوپر بادل لشکارے مارتے تھے۔

"یا اللہ خیر!" مسز حمید بولیں۔

"مما دلیر بنیئے!" ہنی بولا۔

مونا ہنس رہی تھی جیپ کے راڈ کو پکڑے وہ دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔احسن مسز حمید کی طرف متوجہ تھا۔جیپ ایک جگہ پھر رک گئی۔یہاں سے آگے جیپ نہیں جاتی تھی۔پیدل جانا پڑتا تھا۔خچروں والے لوگ تو کھڑے تھے مگر جب احسن نے مسز حمید سے خچر پر بیٹھنے کو کہا تو وہ بولیں۔

"ارے بیٹے!اس پونی پر چڑھنا ایک مسئلہ ہے۔"

پیدل چلنا مسز حمید کے لئے ممکن نہ تھا۔سہارے دے دلا کر احسن نے اُنہیں خچر پر سوار کیا۔

"آپ نے اپنا توازن پیچھے رکھنا ہے اور نشیب میں ہرگز نہیں دیکھنا۔"

احسن نے اُنہیں ہدایت کی۔اتنا تنگ راستہ مسز حمید کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ پل صراط سے گزر رہی ہوں۔احسن پیچھے تھا۔مونا آگے اور بچے درمیان میں۔مسز حمید کو بچوں کا بہت فکر تھا۔بار بار وہ گردن موڑتیں۔اُس پر احسن بولا۔

"آپ اطمینان سے بیٹھیے۔گھبرایئے نہیں۔بچے میں نے سنبھالے ہوئے ہیں۔"

خدا خدا کر کے جھیل تک پہنچے۔خچر سے اُتر کر مسز حمید نے لمبا سانس لیا۔

کتنا خوبصورت نظارہ تھا۔ برف سے لدے پھندے پہاڑ پہلو بہ پہلو لپٹے ہوئے۔ یوں جیسے تیز ہواؤں یا آندھیوں نے برف کے تودوں کو ہلا رے دے کر انہیں پہلو بہ پہلو لٹایا ہو۔ یا یوں جیسے کسی حسین پری نے اپنے پر کھول کر پھیلا دیئے ہوں۔

ہنی سنی مونا بھاگتے ہوئے نیچے اُتر گئے۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ خاصا رش تھا لوگوں کا۔

''چلو میں تمہاری تصویریں بناؤں۔'' احسن نے انہیں کہا۔

جھیل میں پتھروں پر بٹھا کر اور برف کے پہاڑوں میں اُس نے خاصی تصویریں کھینچ ڈالیں۔ مسز حمید کی بھی بنائیں۔ اور جب مونا ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی اُس نے قریب پہنچ کر کہا۔

''کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟''

''بہت اچھا۔ بہت خوبصورت۔ ڈاکٹر احسن میں آپ کی شکر گزار ہوں۔'' مونا کی آنکھوں میں نمی سی اُتر آئی۔

''کس بات کے لئے شکر گزار ہو رہی ہیں؟'' احسن نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ نے مما کا بہت خیال رکھا۔''

''اُن کا خیال رکھنا میرا فرض تھا۔ وہ میرے اُستاد کی مسز ہیں۔ اُستاد تو ماں باپ کی طرح ہوتا ہے۔''

احسن نے بات جاری رکھی۔

''مونا تم نے وہ گانا سنا ہے؟''

''کون سا؟'' مونا نے پلکیں جھپکائیں۔ کیسا صبیح اور معصوم چہرہ تھا۔ احسن بغور دیکھ رہا تھا۔

''مونا! میں بہت خوش ہوں۔ یہ ساون تو بہت بھاگوان نکلا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

مونا ہنس پڑی تھی۔ دل کے سارے جذبات اُس کے چہرے پر پڑھے جا سکتے تھے۔

ریسٹ ہاؤس جھیل کے کنارے تھا جو بند تھا۔ اوپر ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر بچوں نے گرم گرم پکوڑے کھائے، کوک پی۔ مسز حمید، احسن اور مونا نے چائے پی۔

واپسی کوئی تین بجے ہوئی۔ گھر چھ بجے پہنچے۔ خدا کا شکر تھا کہ بارش نہیں ہوئی۔ بادل بدستور چھائے ہوئے تھے۔

اُنہیں اُن کے گھر پر چھوڑ کر جب احسن ہوٹل آنے لگا۔ مسز حمید نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور سینے کو چوما اور بولیں۔

''میرے پاس الفاظ نہیں جو میرے جذبات کی ترجمانی کریں۔ خوش قسمت تھی وہ ماں جس کے تم بیٹے ہو۔''

☆☆☆

ذرا سنو تو فسانہ میرا

سلمیٰ اعوان